لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ ﴿۹۲﴾

تم راستبازی کو ہرگز حاصل نہ کرو گے یہاں تک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو، اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔ (481)

کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا

کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں قبل اس کے کہ تورات اتاری جائے، سوائے اس کے جو اسرائیل نے اپنی جان پر حرام کرلیا۔ کہہ تو تورات لاؤ پھر

481- **مال دنیا کو معبود بنانے والوں کے مقابل پر خیر و برکت حاصل کرنے کی راہ:** مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی بعض حصہ اس کا خرچ کرو جس سے تم کو محبت ہے اور بیانیہ بھی ہوسکتا ہے۔

پچھلے رکوع میں اسلام کی صداقت کی اس عظیم الشان دلیل کی طرف توجہ دلائی تھی کہ یہ سب انبیاء کا موعود ہے اس رکوع میں ایک ایسی ہی اور عظیم الشان دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کا مرکز یعنی خانہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ الگ الگ قوموں میں نبی بھیجنے کے بعد دنیا کا آخری معبد اور ساری نسل انسانی کی عبادت گاہوں کا مرکز اسی کو قرار دیا جاتا اور یوں اصولی طور پر دو عظیم الشان امور کی طرف اہل کتاب کو توجہ دلائی ہے۔ مگر چونکہ سلسلہ مضمون اس رنگ میں چلتا تھا کہ اہل کتاب اگر ساری زمین کو بھی سونے سے بھر دیں تو وہ ان کی بدیوں کا فدیہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ وہ اَلْبِرُّ خیر وسیع یا سب قسم کی خیر کے ابواب میں کس طرح داخل ہوسکتے ہیں؟ کیونکہ سونے سے زمین بھرنے والوں کے بالمقابل جنہوں نے اپنی ساری طاقتوں کو اس سفلی زندگی پر لگا دیا ہے اس گروہ کا ذکر ضروری تھا جو ہر قسم کی خیر اور نیکی کو حاصل کرے تو اس کا گر یہ بتایا کہ جن چیزوں سے تم کو محبت ہے وہ خرچ کردو تو جمیع ابواب خیر میں داخل ہوسکتے ہو۔ بعض نے یہاں اَلْبِرُّ کے معنی جنت لیے ہیں مگر ماحصل دونوں کا ایک ہے کیونکہ جس نے جمیع خصال حاصل کرلیے وہ اسی دنیا میں جنت میں داخل ہوگیا۔ اب ﴿مِمَّا تُحِبُّوۡنَ﴾ صرف مال اور زر ہی نہیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو اپنے وقت عزیز کو خدا کی راہ میں لگانا اپنی عزت اور مرتبہ کو جس سے انسان محبت کرتا ہے خدا کی راہ میں خرچ کر دینا، اپنی ساری قوتوں اور طاقتوں کو لگا دینا یہ سب کچھ اس کے اندر داخل ہے۔ ہاں مال و دولت جائداد سب سے زیادہ محسوس ہونے والی چیزیں ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ آیت حکم زکوٰۃ سے منسوخ ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا محکم اور پختہ اصول ہے کہ جب تک انسان اس دنیا میں ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہوسکتا۔ نسل انسانی کی ساری ترقیات کا مدار ہی محبوب اشیاء کے انفاق پر ہے۔ صحابہ نے اس اصول کو خوب سمجھا تھا اور اپنی جانیں، مال، جائدادیں سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر کے ہر قسم کی بڑائی کے وارث ہوئے۔

بِالتَّوۡرٰىۃِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۳﴾ اسے پڑھو[482] اگر تم سچے ہو۔

وقف جبریل علیہ السلام

فَمَنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۹۴﴾ پھر جو کوئی اس کے بعد اللہ پر جھوٹ بنائے تو وہی ظالم ہیں۔

482- الطَّعَامُ میں ال عہد کے لیے ہے یعنی وہ طَعَامٌ جو مسلمان کھاتے ہیں اور طَعَامٌ ہر وہ چیز ہے جو بطور غذا کھائی جاتی ہے۔

یہودیوں کا اعتراض اونٹ کے گوشت کے متعلق:

واحدی نے کلبی سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم دین ابراہیم علیہ السلام پر ہیں: ﴿اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ﴾[آل عمران: 68:3] ''یقیناً ابراہیم سے بہت نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی۔'' تو یہودیوں نے کہا کہ آپ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں اور اونٹ کا گوشت نوح اور ابراہیم علیہما السلام پر بھی حرام تھا۔ تو یہ آیت ان کی تکذیب کے لیے اتری۔ (ر) گویا یہ الفاظ اس اعتراض کے جواب میں ہیں کہ کھانے کی چیزوں میں مسلمانوں کا ملت ابراہیمی سے کوئی اختلاف ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ وہی چیزیں جو ابراہیم علیہ السلام کے لیے حلال تھیں، بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں۔ مگر اسرائیل نے کچھ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا وہ کیا تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹ کا گوشت تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک لمبی بیماری میں مبتلا ہونے پر یہ نذر مانی تھی کہ وہ محبوب ترین طعام کو جو اونٹ کا گوشت تھا ترک کر دیں گے۔ بعض نے چربیوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے عبادت کے رنگ میں اس کو ترک کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ایسا کیا تھا۔ بہرحال اہل کتاب کا جو اعتراض تھا کہ یہ چیزیں ہمیشہ سے حرام تھیں اور ملت ابراہیمی میں بھی حرام تھیں اس کا جواب دیا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو توریت لا کر پڑھو اور اس میں دکھاؤ کہ کہاں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی یہ چیزیں حرام تھیں۔ اسی کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا: ﴿فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا﴾ اور **توریت میں جو بہت سی چیزیں ان پر حرام کی گئیں۔** تو اس کی وجہ قرآن کریم نے دوسری جگہ یوں بیان فرمائی ہے: ﴿فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ﴾[النسآء: 160:4] ''سو ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہوئے ہم نے ان پر اچھی چیزیں جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں حرام کر دیں۔'' اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِبَغۡيِهِمۡ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ﴾ [الأنعام: 146:6] ''یہ ہم نے ان کو ان کی بغاوت کی وجہ سے سزا دی تھی اور یقینا ہم سچے ہیں۔'' یعنی حقیقت یہی ہے کہ توریت کے نزول سے پہلے بنی اسرائیل پر ہر ایک قسم کا طعام جو مسلمانوں کے لیے حلال ہے، حلال تھا۔ اور بنی اسرائیل پر بھی بہت سی چیزوں کی حرمت کی وجہ سے ان کی حرمت اصلی نہیں بلکہ سزا کے طور پر تھا۔

قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ‌ ۟ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا‌ ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۹۵﴾

کہہ، اللہ نے سچ فرمایا ہے۔ پس راست رو ہو کر ابراہیم کے دین کی پیروی کرو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ (483)

اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۹۶﴾

پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا یقیناً وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور سب قوموں کے لیے ہدایت ہے۔ (484)

483- ﴿قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ﴾ میں ہوسکتا ہے کہ اشارہ اس بیان کے متعلق ہو جو [آیت نمبر: 92] میں پایا جاتا ہے۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ اس میں دین اسلام کی صداقت کا اظہار ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے وہ سب سچ ہے۔

یہود و نصاریٰ کو ملت ابراہیم کے اتباع کی دعوت:

اس کے بعد فرمایا: ﴿فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا﴾ یعنی اصول دین اسلام وہی ہیں جو ابراہیم کی ملت کے اصول تھے اور چونکہ وہ تم سب کا مسلم بزرگ ہے اس کے اصول دین سے تمہارا انحراف کرنا کسی صورت میں ٹھیک نہیں۔ چونکہ گزشتہ ساری بحث میں اصول پر ہی توجہ دلائی گئی ہے اس لیے ملت ابراہیم سے مراد یہاں اصول ملت ابراہیمی ہیں نہ اس کے فروع۔ اس سے پہلی آیت میں جو اللہ پر جھوٹ بنانے کا ذکر ہے اس میں بھی ان افتراؤں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو یہود و نصاریٰ نے دین کے معاملہ میں کر رکھے تھے۔

484- اول سے مراد یہاں متقدم فی الزمان ہی ہے یعنی زمانہ کے لحاظ سے سب سے پہلا۔ جیسا کہ دوسری آیات و احادیث سے واضح ہوتا ہے اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی وہ اول ہے کیونکہ آخری مرجع عالم بھی وہی قرار پایا۔

وُضِعَ۔ وَضَعَ کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے۔ ایجاد اور خلق کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (غ) جیسے: ﴿وَالۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ﴾ [الرحمن: 10:55] ''اور زمین کو مخلوق کے لیے رکھا'' اور بچہ جننے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ﴿فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا قَالَتۡ رَبِّ اِنِّىۡ وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ﴾ [آل عمران: 36:3] ''پھر جب اسے جنا، کہا میرے رب! میں نے یہ لڑکی جنی ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے جو اس نے جنا'' اور [وُضِعَ الۡبَيۡتُ] سے مراد ہوتی ہے بِنَاؤُهُ۔ (غ) یعنی اس کی تعمیر اور وُضِعَ الۡكِتَابُ سے مراد ہے [اِبۡرَازُ اَعۡمَالِ الۡعِبَادِ] (ر) یعنی بندوں کے اعمال کا ظاہر کرنا۔ ﴿وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ﴾ [الکھف: 49:18] ''اور کتاب رکھی جائے گی۔''

بَكَّةَ۔ بَكَّةُ اور مَكَّةُ ایک ہی نام کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ چنانچہ راغب نے بھی مجاہد کے اس قول کو ہی ترجیح دی ہے کہ بَكَّةُ مَكَّةُ ہے اور ب اور م کے ایک دوسرے کی جگہ آجانے کی بہت سی مثالیں ہیں جیسے: سَبَدٌ اور سَمَدٌ۔ لَازِبٌ اور لَازِمٌ۔ بعض لوگوں نے ان دونوں میں کچھ فرق کیا ہے۔ بعض کے نزدیک بطن مکہ کا نام بکہ ہے۔ بعض کے نزدیک مسجد کا نام بَكَّةُ ہے

فِيۡهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ ۚ وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ

اس میں کھلے کھلے نشان ہیں مقام ابراہیم اور جو وہاں داخل ہوا امن والا ہوگیا۔ اور لوگوں پر اللہ کے لیے

اور بعض کے نزدیک خاص البیت کا اور مکہ شہر کا نام ہے۔ پھر اس کے اشتقاق کی وجہ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک یہ تَبَاكٌّ سے ہے جس کے معنی ازدحام ہیں۔ کیونکہ لوگ طواف کے لیے اس میں اکٹھے ہوتے ہیں اور بعض نے کہا کہ مکہ کا نام بکہ اس لیے رکھا گیا ہے: [لِأَنَّهَا تَبُكُّ أَعْنَاقَ الْجَبَابِرَةِ] یعنی وہ جباروں اور سرکشوں کی جو اس کے اندر یا اس کے متعلق زیادتی کرنا چاہیں گردنیں توڑتا ہے۔

مُبٰرَكًا۔ بَرَكَ کی اصل اہل لغت نے [بَرَكَ الْبَعِيْرُ] سے لکھی ہے جس کے معنی ہیں اونٹ بیٹھ گیا اور اس جگہ کے ساتھ لگا رہا۔ (ل) اس وجہ سے لزوم اور ثبات کے معنی کے اظہار کے لیے بَرَكَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اور گو اہل لغت نے نمو اور بڑھنا بھی بَرَكَةٌ کے معنی لکھے ہیں مگر اصل معنی اس کے لزوم اور ثبات ہی ہیں۔ جیسا کہ لسان العرب میں بھی ہے اور مفردات میں ہے: [اَلْبَرَكَةُ ثُبُوْتُ الْخَيْرِ الْإِلٰهِيِّ فِي الشَّيْءِ] یعنی کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا ثابت ہوجانا اور مبارک کے معنی ہیں [مَا يَأْتِيْ مِنْ قِبَلِهِ الْخَيْرُ الْكَثِيْرُ] (ل) جس کی طرف سے خیر کثیر آتی رہی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی یہ لفظ بولا گیا ہے ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ﴾ پس **بَرَكَةٌ کو مبارک کہا** کہ اس کی طرف سے خیر کثیر آتی رہے گی۔ یہ خیر کثیر صرف عبادت میں اور اس کے ثواب میں یا قبولیت دعا میں یا ﴿يُّجۡبٰۤى اِلَيۡهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَىۡءٍ﴾ [القصص: 57:28] ''جس کی طرف ہر قسم کے میوے کھنچے آتے ہیں۔'' میں محدود نہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ انسان کے لیے تمام خیرات دینی کا یہ مرکز رہے گا۔ یہاں سے وہ سرچشمہ توحید کا پھوٹا جو قیامت تک منقطع نہیں ہوگا۔

هُدًى۔ مراد ہے [ذَاهُدًى] یعنی ہدایت والا۔ کیونکہ یہیں سے وہ ہدایت نکلی جو تمام دنیا جہان کے لیے تھی۔ تمام ہدایتیں ایک ایک قوم کے لیے آئیں۔ صرف ایک ہی ہدایت ہے جو علی الاعلان ساری دنیا کے لیے آئی اور وہ ہدایت اسی مقام مبارک سے نکلی۔

آیا خانہ کعبہ ﴿اَوَّلَ بَيۡتٍ﴾ یعنی **دنیا کا سب سے پہلا معبد ہے**؟ اس پر مخالفانہ شہادت کا ذکر [نمبر: 157] میں ہو چکا ہے۔ احادیث نبوی میں بھی صراحت سے اس کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا [اَيُّ مَسْجِدٍ وُضِعَ؟] اول کون سی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی؟ تو آپ نے جواب دیا: [اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ] یعنی مسجد حرام یا خانہ کعبہ اور یہ جو ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ابن ابی حاتم نے بیان کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا [أَ هُوَ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ فِي الْأَرْضِ؟ قَالَ: لَا وَلٰكِنَّهُ أَوَّلُ بَيْتٍ وُضِعَ فِيْهِ الْبَرَكَةُ]۔ (ث) کیا وہ سب سے پہلا گھر ہے جو زمین پر بنایا گیا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں لیکن وہ پہلا گھر ہے جس میں برکت ڈالی گئی۔ تو یہ بخاری اور مسلم کی حدیث کے خلاف نہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ابن ابی حاتم کی دوسری روایت اس کی توضیح کرتی ہے

حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ اس گھر کا حج کرنا ہے اس پر جو اس تک راہ پاسکے،

اور وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: [كَانَتِ الْبُيُوْتُ قِبَلَهُ وَلٰكِنَّهُ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِعِبَادَةِ اللهِ] (ث) یعنی گھر تو اس سے پہلے بھی تھے مگر وہ پہلا گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا اور یہی منشا حدیث متفق علیہ کا ہے کہ سب سے پہلی مسجد یا سب سے پہلا اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر جو دنیا میں مقرر ہوا وہ خانہ کعبہ ہے۔

آدم کا کعبہ کو بنانا:

اور بیہقی کی حدیث ذیل اسی کی مؤید ہے جس کو گو بعض لوگوں نے ابن لہیعہ کے نام کی وجہ سے کمزور کہا ہے مگر چونکہ قرآن کریم کے صریح الفاظ ﴿اَوَّلَ بَيْتٍ﴾ اور حدیث متفق علیہ کے مطابق ہے اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا اور وہ حدیث عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مرفوع یوں ہے: [بَعَثَ اللهُ جِبْرِيْلَ إِلٰى آدَمَ وَحَوَّاءَ فَأَمَرَهُمَا بِبِنَآءِ الْكَعْبَةِ فَبَنَاهُ آدَمَ ثُمَّ أَمَرَ بِالطَّوَافِ بِهِ.] (ث) یعنی اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو آدم اور حوا کی طرف بھیجا اور ان کو کعبہ کے بنانے کا حکم دیا۔ پس آدم نے اسے بنایا پھر اسے اس کے طواف کا حکم دیا گیا اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ **بیت الحرام** کے بعد **بیت المقدس** ہے اور دونوں میں **چالیس سال کا فرق** ہے۔ تو اس کا منشا صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان دونوں گھروں کے بنانے میں چالیس سال کا فرق ہے کیونکہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ خانہ کعبہ کو دوبارہ بنایا اور پھر اپنی نسل کی دوسری شاخ کے لیے بیت المقدس کو قبلہ بنایا۔

مکہ کے نام:

مکہ کے کئی ایک نام آئے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔ مثلاً ﴿اُمَّ الْقُرٰى﴾ [الأنعام: 92:6] بستیوں کی ماں اور یہ نام مکہ کی وجہ تسمیہ کے ساتھ ملتا ہے کیونکہ مکہ بھی مَكٌّ سے ہے جس کے معنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ چوسنا ہے۔ اور ام القریٰ یا بستیوں کی ماں اسے اس لیے کہا ہے کہ اس کی چھاتیوں سے ساری زمین توحید الٰہی اور دین حق کا دودھ چوسے گی۔ اس لیے ساری دنیا کا یہی حقیقی مرکز ہے اور مفسرین نے اسے زمین کا مرکز کہا ہے۔ جس سے مراد روحانی مرکز ہے اور اَلْبَلَدُ یا خاص شہر بھی اس کا نام آیا ہے اور ﴿الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ﴾ [التين: 3:95] یا امن والا شہر بھی۔ کیونکہ اس جیسی کوئی جائے امن اور دنیا میں نہیں۔ اور احادیث میں دو عظیم الشان فتنوں کا ذکر کر کے جن میں سے ایک روحانی فتنہ ہے اور ایک جسمانی، یہ بتادیا ہے کہ اس میں دجال اور طاعون داخل نہیں ہوں گے۔ یعنی ہر قسم کے فتنوں سے امن میں رہے گا اور **خانہ کعبہ کے جو نام ہیں** وہ بھی سب گویا مکہ کے ہی نام ہیں جیسے مقام ابراہیم۔ اَلْبَيْتُ خاص گھر۔ [اَلْبَيْتُ الْعَتِيْقُ] قدیم گھر۔ [اَلْبَيْتُ الْمُحَرَّمُ] پاک گھر یا عزت والا گھر۔ [اَلْبَيْتُ الْحَرَامُ۔ اَلْكَعْبَةُ۔] دوسرے نام جو بیان کیے گئے ہیں یہ ہیں۔ [اَلْحَاطِمَةُ] یعنی توڑ دینے والا جس میں اس معنی کی طرف اشارہ ہے جو بَكَّةُ میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی ظالموں کی جو اس کی بے حرمتی کرنا چاہیں گردنیں توڑنے والا۔ [اَلْمَامُوْنُ۔ اُمُّ رَحِمٍ۔ صَلَاحٌ۔ عَرْشٌ۔ اَلْقَادِسُ۔ اَلْمُقَدِّسُ۔ اَلرَّأْسُ۔ كُوْثَاءُ۔ اَلْبَيِّنَةُ] وغیرہ۔ (ث)

وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۷﴾ اور جس نے انکار کیا تو اللہ جہانوں سے بے نیاز ہے۔ (485)

آخری عبادت گاہ:

جس طرح اس گھر کو ﴿اَوَّلَ بَیۡتٍ﴾ کہا ہے اسی طرح لفظ مبارک میں یہ اشارہ بھی کر دیا کہ خاتم النبیین کا یہ قبلہ خدا کی عبادت کا آخری گھر بھی ہے۔ کیونکہ مبارک کے معنی ہیں جس کی خیر و برکت کبھی منقطع نہ ہو اور دائمی ہو۔ گویا جس طرح پہلے قبلے ایک وقت کے لیے تھے اور آخر ان کی خیر و برکت ایک وقت آ کر منقطع ہونے والی تھی۔ یہ صورت اس پاک گھر کی نہ ہوگی۔ کیونکہ اس نے دنیا کی ساری بستیوں کا مرکز بننا تھا۔ اس کے بعد اور کوئی عبادت گاہ خدا کی اس دنیا پر قائم نہ ہوگی اور تاریخ خود اس پر شاہد ہے کہ اس کے بعد کوئی مقام اس قسم کا مرکز دنیا میں نہیں بنا۔ ﴿ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ کے لفظ میں انہی مطالب کی تصریح فرما دی کہ یہاں سے ہدایت ملے گی اور وہ ہدایت عرب کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی کل قوموں کے لیے ہوگی۔

485- حِجٌّ اور حَجٌّ کے ایک ہی معنی ہیں [دیکھو نمبر: 102]۔ فرق صرف اس قدر اہل لغت نے کیا ہے کہ حَجٌّ مصدر ہے اور حِجٌّ اسم ہے۔ (غ)

﴿اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا﴾ استطاعت کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ استطاعت حد وسعت کا نام ہے یعنی جس کو سہولت سے انسان کر سکے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ﴿اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا﴾ کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: [اَلزَّادُ وَالرَّاحِلَۃُ]۔ (ث) یعنی زاد راہ اور سواری۔ اور بعض نے صحت کو بھی داخل کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ سارے امور اس کے اندر داخل ہیں۔ مثلاً خود وہاں کا امن، رستہ کا امن، متعلقین کا گزارہ۔ امن کے نہ ہونے کی وجہ سے خود نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں آ کر کئی سال تک حج نہیں کیا اور چھٹے سال میں حدیبیہ سے واپس آنا پڑا۔

﴿مَقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ﴾ یہ آیات بینات کی تشریح ہے یعنی وہ کھلی کھلی نشانیاں کیا ہیں؟ سب سے پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ مقام ابراہیم ہے۔ مقام ابراہیم کی تشریح [نمبر: 155] میں ہو چکی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سارا حرم ہی مقام ابراہیم ہے۔ (ث)

مقام ابراہیم سے شہادت:

خانہ کعبہ کا مقام ابراہیم ہونا یا اس میں مقام ابراہیم کا ہونا ایک کھلا نشان قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور عبادات حج کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام نامعلوم زمانہ سے چلا آیا ہے۔ اگر واقعی حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں نہ آئے ہوتے تو عرب کے بت پرستوں کو جن کی روایات میں یہ ایک مسلم امر چلا آیا ہے کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ ایک ایسے شخص کے نام کا تعلق جو علی الاعلان بت شکن تھا، اس گھر سے قائم کرتے اور اس میں ایک مقام ابراہیم قائم کر کے اس کے مراسم حج وغیرہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض باتیں جن کی شہادت زبانی روایات میں پوری پوری

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۸﴾

کہہ، اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو، اور اللہ اس پر گواہ ہے جو تم کرتے ہو۔

نہیں رہ سکتی۔ ان کی شہادت ایک تعامل قومی میں رہ جاتی ہے اور وہ شہادت ایسی زبردست ہوتی ہے کہ جس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ سو ایسی ہی ایک شہادت خانہ کعبہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کے تعلق میں رہ گئی ہے جو آج بھی اہل کتاب پر اتمام حجت کے لیے کافی ہے کہ جس بیت اللہ یا بیت ایل کا ذکر بائبل میں ہے وہ حقیقت میں خانہ کعبہ تھا کیونکہ دنیا میں یہی ایک گھر ہے جس کا نام بیت اللہ ہے اور یہی ایک گھر ہے جس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا تعلق ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور جس کی ساری عبادات اور رواجات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔

دوسرا کھلا نشان خانہ کعبہ کے متعلق یہ ہے کہ ﴿مَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ **یعنی یہ ایک امن کا مقام ہے۔** یہ بھی خصوصیت ساری دنیا میں صرف خانہ کعبہ کو ہی حاصل ہے کہ وہ امن کا مقام ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

> ''مکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوا (یعنی ہمیشہ مقام حرمت رہا ہے) اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا اور وہ میرے لیے بھی صرف دن کی ایک گھڑی حلال ہوا (یعنی وہ وقت جب فتح مکہ کے وقت آپ اس میں داخل ہوئے ہیں) سن رکھو کہ وہ اس وقت سے حرمت کا مقام ہے۔ نہ اس کے کانٹے کاٹے جائیں گے، نہ اس کے درخت قطع کیے جائیں گے، نہ اس کی گری ہوئی چیز اٹھائی جائے گی۔ مگر اس شخص کے لیے جو اس کے (اصل مالک کو) پہنچانے والا ہو۔''

پس مکہ کی حدود کے اندر کسی قسم کی جنگ جائز نہیں۔ یعنی ان حدود کے اندر مکہ معظّمہ میں جنگ کرنا منع ہے۔ اور یہ حرمت اس کی عرب کے اندر ابتدا سے اللہ تعالیٰ نے ایسی محکم رکھی تھی کہ عرب جیسی جنگجو قوم جن کا شغل ہی دن رات جنگ کرنا تھا اور جہاں قبیلہ قبیلہ کے ساتھ اور قوم قوم کے ساتھ ہر وقت برسر پیکار تھے اس قوم میں بھی مکہ کی حدود کے اندر کسی کی طاقت نہیں تھی کہ تلوار کو نیام سے باہر نکال سکے۔ اور جو ہزارہا سال کی تاریخ میں کوئی ایک دو مثالیں اس حکم کی خلاف ورزی کی پیش کی جاتی ہیں تو وہ [اَلنَّادِرُ كَالْمَعْدُوْمِ] کے حکم میں ہیں۔ پھر ایک حدیث میں مکہ کی حرمت کے متعلق یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ اس کے اندر نہ دجال داخل ہوگا اور نہ طاعون۔ یہ امن اس مقدس سرزمین میں کیوں رکھا گیا اور کیوں ساری دنیا میں یہ ایک ہی جگہ امن کے لیے مخصوص ہوئی؟ درحقیقت یہ قوم کا خیال نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایک جنگجو قوم کے اندر اپنی طاقت اور قدرت کا ایک نشان رکھا ہوا تھا تاکہ یہ ایک نشان ہو اس روحانی امن و امان کا جس کا جھنڈا اس مقام پر بلند ہو کر دنیا کی کل قوموں میں صلح و اتحاد اور اخوت کی بنیاد رکھی جانی تھی۔ پس یہ دوسرا کھلا نشان ہے جو اس گھر کو عطا کیا گیا۔

خانہ کعبہ کا حج کبھی نہ رکے گا:

تیسرا نشان ان الفاظ میں مذکور ہے: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ لوگوں کے لیے (مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا کی شرط کے

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا وَّ اَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۹﴾

کہہ، اے اہل کتاب! کیوں اسے اللہ کی راہ سے روکتے ہو جو ایمان لائے تم اس کے لیے ٹیڑھا پن چاہتے ہو۔ حالانکہ تم گواہ ہو اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔ (486)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِیۡعُوۡا فَرِیۡقًا مِّنَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم ان لوگوں میں سے ایک

ماتحت) اللہ کے لیے اس مقدس گھر کا حج کرنا ضروری ٹھہرایا گیا ہے۔ ہر ایک مقدس مقام پر کوئی نہ کوئی زمانہ ابتلا کا بھی آجاتا رہا ہے۔ بیت المقدس کو کس شان و شوکت کے ساتھ سلیمان علیہ السلام نے بنایا مگر تھوڑا ہی عرصہ بعد اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ حج اور زیارت کہاں کی؟ اسی طرح پر دنیا کے کل مقدس مقامات ایک نہ ایک وقت اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں پڑ کر تباہ و برباد ہو گئے ہیں تو اس کے قیام کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ نہ صرف ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا بلکہ اس کا حج بھی لوگ ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ گویا کسی وقت یہ اپنے **مخالفوں کے ہاتھ میں نہ پڑے گا**۔ اور یہ خصوصیت بھی ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو شروع سے قائم رکھا ہے۔ چنانچہ جب خانہ کعبہ کے اندر بت بھی تھے اور اس کے متولی مشرکانہ عقائد رکھتے تھے، اس وقت بھی جب ایک عیسائی بادشاہ نے اس پر چڑھائی کی اور اس کو تباہ کرنے اور اس کے حج اور زیارت سے لوگوں کو روکنا چاہا اور اس وقت اس کے متولیوں میں اس بادشاہ کی فوجوں سے مقابلہ کی کچھ بھی طاقت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایسے سامان پیدا کر دیئے کہ وہ بادشاہ مع اپنی ساری فوج کے تباہ ہو گیا۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک نشان ہے کہ ایک عالمگیر جنگ کے اندر بھی جب خود وہ سلطنت بھی جنگ میں مبتلا تھی۔ جو اس کی اصل متولی ہے یعنی ترکی قوم، خانہ کعبہ کا حج نہیں رکا۔ اس آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے: ﴿وَ مَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ بڑے بڑے لوگ اس کا کفر بھی کریں گے مگر وہ اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اگلی آیت میں صاف بتا دیا کہ یہ بڑے بڑے کفر کرنے والے اہل کتاب ہی ہیں۔ بعض نے یہاں کفر سے مراد صرف اس رکن کا کفر لیا ہے۔

486- عِوَجًا۔ عِوَج قائم رہنے کی حالت میں مڑ جانے کا نام ہے۔ (غ) یعنی ٹیڑھا پن اور عَوَج اور عِوَج میں فرق یہ ہے کہ عوج اس ٹیڑھا پن پر بولا جاتا ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے جیسے گڑی ہوئی لکڑی کا ٹیڑھا ہونا یا دیوار کا ٹیڑھا ہونا وغیرہ۔ اور عِوَجٌ اس ٹیڑھا پن پر بولا جاتا ہے جس کا ادراک فکر اور بصیرت سے ہو۔ (غ) جیسے دین معاش وغیرہ کے معاملہ میں اور ﴿تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا﴾ کی تقدیر ہے [تَبْغُوْنَ لَهَا عِوَجًا] کیونکہ بَغٰی ایک مفعول کو چاہتا ہے اور جب دوسرا مفعول آئے تو لام بڑھایا جاتا ہے اور بعض نے عِوَجًا کو حال لے کر [ذَا عِوَجٍ] معنی کیے ہیں یعنی تم اس کو تلاش کرتے ہو ٹیڑھے رہ کر۔ سچی بات میں وساوس کا پیدا کرنا اس میں ٹیڑھا پن چاہنا ہے۔

الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ يَرُدُّوۡكُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۰﴾

گروہ کے پیچھے لگ جاؤ گے جن کو کتاب دی گئی ہے تو وہ تمہیں تمہارے ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔ (487)

وَ كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ ؕ وَ مَنۡ يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع 10 10 1

اور تم کس طرح کفر کر سکتے ہو؟ حالانکہ تم وہ ہو کہ تم پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول ہے۔ اور جو اللہ کو مضبوط پکڑتا ہے وہ یقیناً سیدھی راہ کی طرف ہدایت پا گیا۔ (488)

487- تُطِيۡعُوۡا۔ طَوْعٌ۔ اِنْقِيَادٌ یعنی برضا و رغبت فرمانبرداری ہے اور اس کی ضد کَرْہٌ یا ناپسندیدگی۔ (غ) ابھی آچکا ہے: ﴿لَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّ كَرۡهًا﴾ اور طَاعَةٌ اور طَوْعٌ ایک ہی ہیں مگر طَاعَةٌ کا اکثر استعمال اس طرح ہے کہ جو حکم دیا گیا تھا اسے بجالایا اور جو طریق مقرر کر دیا گیا تھا اس پر چلا۔ (غ) اور اَطَاعَ کے معنی ہیں ایک امر کی پیروی کی اور اس کی مخالفت نہ کی۔ (ن) یا اس کے معنی ہیں: [لَانَ وَانْقَادَ]۔ (ت) اس کے لیے نرم ہو گیا اور اس کا منقاد ہو گیا۔

کفار کی اطاعت:

یہاں اہل کتاب کی اطاعت سے روکا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی اطاعت کرو گے تو وہ ایمان کے بعد تمہیں کافر بنا کر چھوڑیں گے۔ کسی دوسرے کی اطاعت یہ ہے کہ انسان برضا و رغبت جو وہ کہے مانتا چلا جائے اور جو وہ کرے اسی طرح کرتا چلا جائے۔ پس اطاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہی ہو سکتی ہے یا اولوالامر کی جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔ صرف انہی کے حکم کے ماتحت کسی دوسرے کا حکم مانا جا سکتا ہے۔ اس لیے کفار کی اطاعت فی الواقع کوئی نہیں۔ اور سیاق عبارت کو دیکھا جائے تو اوپر ذکر شکوک و شبہات کا تھا۔ پس یہاں اطاعت سے مراد ان کے انہی وساوس کا قبول کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے بعض بے ایمانوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ایک وسوسہ دل میں پیدا کر دیا۔ انسان اگر اس کے پیچھے لگ جائے اور خود غور سے کام نہ لے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے یہ روایت کی ہے کہ یہ آیت اوس اور خزرج کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی۔ اوس اور خزرج مدینہ کے دو بڑے قبیلے تھے جن میں مدت سے باہم جنگ چلی آتی تھی۔ جب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تو پرانے کینے سب دور ہو گئے اور جنگ بند ہو گئی۔ ایک دن ایک اوس اور ایک خزرج کا آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آ گیا اور اس نے موقعہ پا کر اوس اور خزرج کے پرانے جھگڑوں کا ذکر شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ یہ دونوں مسلمان ان واقعات کو یاد کر کے ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کو تیار ہو گئے اور دونوں نے اپنی اپنی قوم کو پکارا جو ہتھیاروں کے ساتھ نکل آئے۔ جب نبی کریم ﷺ کو پتہ لگا تو آپ ان کے درمیان آئے اور آپ کی وجہ سے سب لوگوں کا غضب جاتا رہا اور وہ نادم ہوئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

488- ﴿يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ﴾ عَصَمَ کے معنی روک رکھنا اور اِعْتِصَامٌ کے معنی اپنے آپ کو روک کر بچا رکھنا ہیں۔ (غ) قرآن کریم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے، اور تم نہ مرو مگر ایسی حالت میں کہ تم فرمانبردار ہو۔ (489)

میں آتا ہے ﴿لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [هود: 43:11] ''آج کے دن کوئی شخص اللہ کے امر سے بچانے والا نہیں۔'' ایسا ہی ﴿مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ﴾ [یونس: 27:10] ''کوئی انہیں اللہ سے بچانے والا نہ ہوگا۔'' میں، اور معصوم وہ ہے جو بچایا گیا ہو۔ اور اسی مادہ سے عِصْمَةٌ ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے اور ﴿فَاسْتَعْصَمَ﴾ [یوسف: 32:12] میں اِسْتَعْصَمَ کے معنی امام راغب نے کیے ہیں [تَحَرِّیْ مَا یَعْصِمُهُ] یعنی اس چیز کا قصد کیا جو اس کو بچالے۔ پس اعتصام باللہ سے مراد ہے اللہ کو پکڑ کر یعنی ذریعہ بنا کر اپنے آپ کو بچالے اور اعتصام کے معنی کسی دوسری چیز کو پکڑنا بھی ہیں۔ (غ) جیسا آگے آتا ہے ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ [103] ''اللہ کے عہد کو مضبوط پکڑ لو۔''

یہاں اہل کتاب کے ان وساوس سے بچنے کا طریق بتایا ہے کہ جب وہ ایسے وساوس ڈالیں تو ان کے اثر بد سے مسلمان اس طرح بچ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آیت ماقبل میں اطاعت سے مراد وساوس کے پیچھے لگنا ہے۔

489- اسلام کے کمالات اور امتیازی نشانوں کا ذکر کر کے اب مسلمانوں کو بتایا ہے کہ وہ کن اصول کو مدنظر رکھ کر دنیا میں ایک کامیاب قوم بن سکتے ہیں اور اس رکوع میں کامیابی کے تین عظیم الشان گر بتائے ہیں جن میں سب سے پہلی بات ہے: ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ تقوی اللہ کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں [نمبر: 10]۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق کی نگہداشت۔ یا ان حقوق اور ذمہ داریوں کی حفاظت جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ذمہ ڈال رکھی ہے خواہ ان کی طرف شریعت ہدایت کرتی ہو یا عقل انسانی۔ گویا قوم کے ہر فرد کے اندر پہلے فرداً فرداً ذمہ داری کا احساس پیدا ہونا ضروری ہے اور یہی کامیابی کی عمارت کی خشت اول ہے مگر صرف اس احساس کا پیدا ہونا بھی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ﴿حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ بڑھا کر بتایا کہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے قوم کے ہر فرد کو اپنی اپنی جگہ پر پورا زور لگانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کا حق اس انسان نے ادا کر دیا جس نے اپنی طرف سے پورا زور لگا دیا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی فرماتا ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: 286:2] ''اللہ کسی پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر جس قدر اس کی طاقت ہو۔'' پس ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ سے وہی مراد ہے جو ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: 16:64] ''سو اللہ کا تقویٰ کرو جہاں تک ہو سکے۔'' سے ہے اور جن لوگوں نے پہلے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے منسوخ سمجھا ہے انہوں نے سخت غلطی کھائی ہے اور اسی کے مطابق دوسری جگہ جہاد کا حکم ہے: ﴿جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ﴾ [الحج: 78:22] ''اللہ کی راہ میں کوشش کرو، جو اس کی (راہ میں) کوشش کا حق ہے۔'' دونوں میں اپنی مقدرت کے مطابق زور لگانا ہے۔ تکلیف مالایطاق اس میں داخل نہیں اور آخر پر فرمایا کہ ﴿فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ جس میں یہ بتایا

وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا ۪ وَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ

اور سب کے سب اللہ کے عہد کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو۔[490] اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب

ہے کہ تم پر کوئی آن ایسی نہ آئے کہ کامل فرمانبرداری کی حالت نہ ہو۔ کیونکہ موت کا وقت تو معلوم نہیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ﴿اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ﴾ سے مراد مسلم یا کامل فرمانبردار بننا ہے اور مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے ہر ایک مسلم بچا رہتا ہے۔

490- حَبۡلِ اللّٰہِ۔ حَبْلٌ رسہ کو کہتے ہیں اور استعارۃ ہر ایک اس ذریعہ یا سبب پر بھی یہ بولا جاتا ہے کہ جس سے کسی چیز کی طرف پہنچ سکیں [اُسْتُعِیْرُ لِلْوَصْلِ وَلِکُلِّ مَا یَتَوَصَّلُ بِہٖ إِلٰی شَیْءٍ]۔ (غ)[وَالْحَبْلُ اَلْعَھْدُ وَالذِّمَّۃُ وَالْاَمَانُ] یعنی حبل عہد اور ذمہ اور امان کو بھی کہتے ہیں۔ (ل) اور حدیث دعا میں آتا ہے [یَا ذَا الْحَبْلِ الشَّدِیْدِ] جہاں حبل کے معنی ابن اثیر نے قرآن یا دین کیے ہیں اور حبل اللہ کے معنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سند صحیح سے قرآن مروی ہیں۔ (ر) ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی معنی روایت کیے ہیں۔ [کِتَابُ اللّٰہِ حَبْلٌ مَتِیْنٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ إِلَی الْاَرْضِ]۔ کتاب اللہ وہ مضبوط رسہ ہے جو آسمان سے زمین تک ممتد ہے۔ (ث) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ فتنہ ہوگا تو دریافت کیا گیا اس سے نجات کی راہ کیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [کِتَابُ اللّٰہِ فِیہِ نَبَأُ مَا قَبْلَکُمْ، وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ، وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ، وَھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ.] (غق) یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب جس میں تم سے پہلے کی اطلاع اور تم سے بعد کی خبر اور جو اختلاف تمہارے درمیان ہو اس کا فیصلہ ہے۔

تَفَرَّقُوا۔ فَرْقٌ جمع کے خلاف ہے اور اسی سے تفرق ہے جو جماعت کے خلاف ہے۔ اختلاف کے ساتھ جماعت رہ سکتی ہے لیکن تفرقہ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ تفرقہ میں دو چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور باہم ان کا تعلق نہیں رہتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی کا دوسرا گر بتایا ہے اور وہ اتحاد اور جماعت کا رنگ ہے کتنا بھی افراد قوم کے اندر انفرادی ذمہ داری کا احساس موجود ہو صرف اس سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ افراد قوم کے اندر ایک اجتماعی رنگ پیدا نہ ہو۔ وہی کوشش عظیم الشان نتائج پیدا کر سکتی ہے جس کے کرنے والی ایک قوم کی قوم ہو۔ پس بتایا کہ انفرادی احساس اور انفرادی کوشش کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ سب مل کر ایک کام کو کریں۔ اور یوں وحدت قومی کو کامیابی کا دوسرا اصول قرار دیا۔ پھر یہ اصول وحدت نامکمل ہوتا اگر یہ نہ بتایا ہوتا کہ وہ کون سی خاص بات ہے جس پر اس اتحاد کی بنیاد رکھی جائے۔ پس کمال بلاغت سے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ **اتحاد اسلامی کی بنیاد حبل اللہ یعنی قرآن کریم ہے**۔ اس میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ قرآن شریف کے متعلق مسلمانوں کا کبھی باہم اختلاف نہ ہوگا اور سب کے ہاتھ میں ایک ہی قرآن کریم ہوگا کیونکہ اتحاد کی بنیاد اسی چیز پر ہو سکتی ہے جس کے بارہ میں اختلاف کوئی نہ ہو۔ اور یہ کس قدر صداقت اسلام کی ایک بین شہادت ہے کہ آج تیرہ سو سال گزر جانے پر سارے عالم اسلامی میں سنی، شیعہ، خارجی سب کے ہاتھ میں قرآن شریف ایک ہی ہے اور ایک زیر و زبر تک کا فرق نہیں۔ وہ مذہب جو مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ساری روئے زمین پر پھیلا ہوا ہے جس کے پیرو

كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَ كُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

تم باہم دشمن تھے، پھر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ (491)

ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف، ایک دوسرے کے حالات سے ناواقف ہیں وہ سب قرآن کریم ایک ہی اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ اس لیے جہاں مسلمانوں کو ان کی کامیابی کا گر بتایا ہے وہیں درحقیقت یہ بھی پیشگوئی کر دی ہے کہ قرآن کریم پر مسلمانوں کا کبھی اختلاف نہ ہوگا۔

پس اس اتحاد کے ہوتے ہوئے اگر مسلمان باہم تفرقہ کریں تو کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ ان کے پاس اتحاد کی ایک ایسی مستحکم بنیاد ہے جو دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں۔ یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگوں نے اتحاد کی اس بنیاد کو چھوڑ کر اپنی اپنی روایات کو اصل بنیاد قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ ایک فرقہ کی روایات مثلاً اہل تشیع کی روایات کو دوسرا فرقہ تسلیم نہیں کرتا۔ پس جب امر متحد کو چھوڑ کر امر مختلف فیہ کو بنیاد قرار دیا جائے گا تو نتیجہ لازماً تفرقہ ہوگا۔ اسی لیے ساتھ ہی فرما دیا ﴿وَّلَا تَفَرَّقُوۡا﴾ یعنی تفرقہ سے بچنے کی یہی راہ ہے۔

قرآن کریم کو بنیاد اتحاد قرار دینے سے کیا منشا ہے؟ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے تمام اصول امور کو اور جن کی ضرورت دین کو ہے اپنے اندر جمع کر لیا ہے اور تمام اختلافات کا فیصلہ درحقیقت اس قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ اس لیے جب قرآن شریف کو اتحاد کی بنیاد مانا جائے گا تو تمام روایات کو جو کسی فرقہ کے ہاتھ میں ہوں اصول قرآنی پر پرکھا جائے گا اور جو روایت قرآن کریم کے خلاف ہو اسے ترک کرنا ہوگا۔ یہ ایک بڑی سیدھی راہ ہے جس پر مسلمانوں کا اتحاد قائم رہ سکتا ہے۔ پھر قرآن کریم ہماری تمام تعلیم و تعلم کا اصل سرچشمہ ہونا چاہیے۔ ہر ایک مسلمان اور کچھ جانے یا نہ جانے مگر قرآن ضرور جانتا ہو۔ مگر آج اس کے خلاف یہ نظر آ رہا ہے کہ جس چیز کو مسلمان نہیں جانتے وہ قرآن ہے۔

491- شَفَا کنویں یا دوسری چیز کا شَفَا اس کے کنارہ کو کہتے ہیں اور ہلاکت سے قریب ہونے کو اس کے ساتھ مثال دی جاتی ہے۔ (غ) شَفَةٌ (ہونٹ) شَفَا سے چھوٹا ہے۔

﴿نَارٌ﴾۔ نَارٌ آگ کو بھی کہتے ہیں جو حواس کے لیے ظاہر ہو اور مجرد حرارت کو بھی کہا جاتا ہے نار جہنم کو بھی اور نار حرب یعنی جنگ کی آگ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے: ﴿اَوۡقَدُوۡا نَارًا لِّلۡحَرۡبِ﴾ [المآئدۃ: 64:5] ''وہ لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں'' میں۔ (غ)

وَ لۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں،(492)

اَنۡقَذَ۔ اِنۡقَاذَ۔ ہلاکت سے بچا لینے کا نام ہے۔ (غ)

قرآن میں اتحاد پیدا کرنے کی طاقت:

اس حصہ آیت میں مسلمانوں کو یہ توجہ دلائی ہے کہ ہم نے جو تم کو حبل اللہ یعنی قرآن کو اپنی اتحاد کی بنیاد قرار دینے کو کہا ہے تو یہ اس لیے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی طاقت رکھی ہے کہ یہ سخت سے سخت دشمنوں کو بھی بھائی بھائی بنا دیتا ہے عرب کی قومیں اور قبیلے جن کی دشمنیوں پر صدیاں گزر کر ایک دوسرے کی عداوت اب ان کے خونوں میں داخل ہو چکی تھی اور دن رات وہ ایک دوسرے سے جنگ پر آمادہ رہتی تھیں۔ گویا آگ کے گڑھے میں گر کر بالکل بھسم ہو جانے کو تھیں۔ بیس سال کے عرصے میں قرآن کریم نے ان کے اندر ایک ایسا اتفاق اور ایسی اخوت پیدا کر دی کہ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں۔ پھر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایسی پاک کتاب کے پاس ہوتے ہوئے مسلمان ایک دوسرے کی تخریب کے درپے ہیں اور ایک دوسرے کو ہی دنیا سے نابود کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے حصہ میں دعویٰ تھا کہ قرآن کریم تم میں اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے حصہ میں دلیل ہے کہ عرب جیسی جنگجو قوموں کے اندر اس نے اتحاد پیدا کر کے دکھا دیا۔

492- اس آیت میں کامیابی کا تیسرا اصول دعوت الی الخیر کو بیان فرمایا ہے اور مِنۡكُمۡ کہہ کر بتا دیا ہے کہ قوم میں ایک ایسا گروہ رہنا چاہیے اس کی وجہ دوسری جگہ مذکور ہے: ﴿مَا كَانَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لِيَنۡفِرُوۡا كَآفَّةً﴾ [التوبة: 9:122] ''مومنوں کو یہ بھی مناسب نہیں کہ سب کے سب نکل پڑیں۔'' یعنی سب کے سب اس کام کے لیے نہیں نکل سکتے۔ دعوت الی الخیر کیا ہے؟ اس سے مراد دعوت الی الاسلام یا دعوت الی القرآن ہے دوسری جگہ خود قرآن کو ''خَيۡرٌ'' فرمایا دیکھو [البقرة: 2:105] اور [نمبر: 137] اور خیر کے معنی بھلائی ہیں۔ اور حقیقی بھلائی کی سب راہیں قرآن کریم میں ہی ہیں۔ اس لیے ارشاد الٰہی یہاں یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں لگی رہے۔ ابتدائے اسلام کا زمانہ تو وہ تھا کہ ہر ایک مسلمان کے اندر ایسی روح دعوت الی الاسلام کی پھونکی گئی تھی کہ وہ سب کے سب ہی داعیان اسلام تھے اور اس جوش اور تڑپ کو لے کر وہ دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف شہروں اور جزیروں میں نکل گئے۔ اور تھوڑے ہی سالوں میں دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ یعنی اسلام کا نام دنیا کے دور دور ملکوں میں روشن کر دیا۔ ہر ملک اور ہر شہر میں اسلام کا جھنڈا لگا دیا پھر بعد اس کے ایک ایسا زمانہ آیا کہ بادشاہوں اور امراء کی توجہ دعوت الی الاسلام کی طرف سے کم ہو کر وہ تو اپنے تعیّشات میں گرفتار بلا ہو گئے۔ علماء کی توجہ بھی زیادہ تر فروعی اختلافات میں صرف ہونے لگی۔ پھر بھی بہت سے خدا کے بندے ان تمام جھگڑوں سے الگ ہو کر دعوت الی الاسلام کے کام میں لگے رہے۔ بہت سے وہ بزرگ جن کے ناموں پر آج ہزار ہا لوگ قربان ہوتے ہیں، ان کی یہ عزت محض اسلام کی خدمت گزاری سے ہوئی۔ وہ درحقیقت روحانی بادشاہ تھے اور جب دنیوی بادشاہوں نے دعوت

وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں

الی الاسلام کے کام کو چھوڑ دیا تو ان روحانی بادشاہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا۔ مگر یہ کس قدر افسوسناک نظارہ ہے کہ آج ان داعیان اسلام کی گدیاں محض دنیا کے چند پیسے کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور ہر ایک گدی جس میں ہزاروں اور لاکھوں کی آمد ہے، وہ چند لوگوں کے پیٹ بھرنے یا ان کے تعیش کا سامان پیدا کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔ اور نہ صرف دنیا کی محبت اور دنیوی جھگڑوں میں ہی گرفتار بلا ہو رہی ہے بلکہ طرح طرح کی بدعات میں مبتلا ہو کر خود مسلمانوں کو چاہِ ضلالت میں گرا رہی ہے اور دعوت الی الاسلام کا وہاں نام بھی نہیں۔ کیسے کیسے پاک اصول فلاح کے مسلمانوں کو اس پاک کتاب کے اندر دیئے گئے تھے۔ دوسرے لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور کامیابیاں حاصل کیں مگر مسلمانوں نے ﴿اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ [الفرقان: 30:25] ''میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز (کی طرح) قرار دیا۔'' کا مصداق اپنے آپ ہی کو ثابت کر دکھایا۔

دعوت الی الاسلام کی اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے کیوں دعوت الی الاسلام کے کام کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسلام میں ایک جماعت کا موجود رہنا ضروری قرار دیا ہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں ہی لگی ہوئی ہو۔ اس جماعت کے افراد کی زندگیوں کا مقصد اصلی اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے سوائے اور کچھ نہ ہو۔ اس لیے کہ بغیر اس کے مسلمان قوم ایک زندہ قوم نہیں رہ سکتی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ جس قوم نے اپنی ترقی کے لیے اپنی تعداد کو بڑھانے کے لیے جدوجہد ترک کر دی ہے، اس میں تنزل اور انحطاط شروع ہو گیا ہے۔ زندگی کے آثار اس میں دور ہو گئے ہیں اور وہ آخر کار مردگی کی حالت تک پہنچ گئی ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا تنزل ان کی سلطنت اور حکومت کے جاتے رہنے سے ہوا ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ مسلمانوں کا تنزل اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے انہوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف کم توجہی کر دی ہے اور سلطنتوں کا جاتے رہنا محض اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ پھر جب مسلمان دعوت الی الاسلام کے کام پر پوری توجہ کریں گے تو پھر وہی کامیابیاں اور وہی شان و شوکت ان کے لیے ہوگی جس کا وعدہ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ میں ہے۔

مجدد صدی کا دعوت الی الاسلام کے لیے جماعت تیار کرنا:

اس زمانہ میں جب دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف سے اکثر مسلمان غافل ہو رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو اپنی جناب سے یہ الہام کیا کہ وہ ایک جماعت اس غرض کے لیے تیار کریں اور یہ بھی ان کو الہام کیا کہ ''بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منار بلند تر محکم افتاد۔'' جس میں درحقیقت وہی وعدہ ہے جو ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ میں ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ نے بارہا یہ اعلان کیا کہ میرے آنے کی اصل غرض یہی ہے کہ تا اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ اور آپ جو اقرار اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں سے لیتے تھے یا

الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ (492)

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آ چکی تھیں اور انہی

جو اقرار اب آپ کے جانشین لیتے ہیں وہ یہی ہے کہ ''میں دین کو دنیا پر مقدم رکھوں گا۔'' اس اقرار کا اصل منشا بھی یہی ہے کہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جن کی متحد غرض خدمت دین ہو۔ گویا آپ نے مسلمانوں کے اندر اس حکم کی تعمیل کے لیے ﴿وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ ایک جماعت بنانی چاہی ہے۔ پس ہر ایک شخص جو اس جماعت میں داخل ہوتا ہے وہ درحقیقت یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا اصل نصب العین صرف دعوت الی الاسلام رکھے گا اور ظاہر ہے کہ بغیر ایک جماعت اور نظم و اتحاد کے کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ اس کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں وہ اسلام کی خیر خواہی نہیں کرتے کیونکہ جس قدر یہ جماعت ترقی کرے گی اسی قدر دعوت الی الاسلام کا کام بھی ترقی کرے گا۔

492۔ دعوت الی الاسلام کے ساتھ دو باتیں اور بیان فرمائی ہیں یعنی **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ معروف** وہ کام ہے جسے فطرت انسانی پہچانتی ہے یعنی نیک کام اور **منکر** وہ ہے جس سے فطرت انکار کرتی ہے یعنی برا کام۔ بدترین حالت کسی قوم کی وہ ہوتی ہے جب اپنے لوگوں کو برا کرتے دیکھیں اور اس سے روکیں نہیں۔ یہودیوں کی بدترین حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ﴾ [المآئدۃ: 79:5] ''وہ ایک دوسرے کو برے کام سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے۔'' اور گو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ایک مسلمان کے فرائض میں سے ہے۔ مگر دعوت الی الاسلام کا کام کرنے والے گروہ کے فرائض میں اسے خصوصیت سے داخل فرمایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر افضل الجہاد ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا خدا کی زمین میں اس کا خلیفہ اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے۔ اسلام کا یہ فخر تھا کہ اس میں چھوٹے سے چھوٹا انسان بڑے سے بڑے کو نصیحت کرسکتا تھا اور اس کی غلطی پر اسے بے دھڑک آگاہ کرسکتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا کامل راستباز خلافت کے منصب پر آتے ہی کہتا ہے: [فَاِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِيْ] اگر میں کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔ فاروق رضی اللہ عنہ جیسے رعب والے انسان کے سامنے ایک بڑھیا یوں کہہ سکتی ہے کہ [يَاابْنَ الْخَطَابِ! اَللّٰهُ يُعْطِيْنَا وَ اَنْتَ تَمْنَعُنَا] (تفسیر الخازن:جلد1، صفحہ 500) قرآن تو عورتوں کے مہر کے متعلق فرماتا ہے: ﴿وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ [النسآء: 20:4] ''اور تم اسے سونے کا ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔'' اور آپ کہتے ہیں بڑے بڑے مہر نہ دو۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی رائے سے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ہر حلقہ میں ایک پیر یا گدی نشین ہے اور اس کا حکم ان کے لیے خدا کے حکم کے قائمقام ہے۔ اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم میں یہ غلطی ہے یا فلاں بات تم نے ٹھیک نہیں کہی۔ گویا دعوت الی الاسلام کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ان کے درمیان سے اٹھ گئے۔

لَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۙ﴿۱۰۵﴾ کے لیے بڑا عذاب ہے۔(493)

يَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّ تَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ ۟ اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا

جس دن (کچھ) منہ سفید ہوں گے اور (کچھ) منہ سیاہ ہوں گے،(494) پس جن کے منہ سیاہ ہوئے کیا تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے؟ سو تم عذاب چکھو اس لیے کہ تم

493- **پہلے مذاہب کا تفرقہ اور اصولی اختلاف:** اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا بلکہ سب پہلے مذاہب کا ذکر ہے اور دو باتیں الگ الگ بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے تفرقہ کیا اور دوسرے یہ کہ اختلاف کیا۔ تفرقہ سے مراد ان کی پراگندگی ہے یعنی الگ الگ راہوں پر ہو جانا اور کسی اصول پر متحد نہ رہنا۔ چنانچہ تمام مذاہب جو اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں ان میں اس قدر تفرقہ موجود ہے کہ باہم اصول میں وہ اختلاف رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنے دین سے خارج قرار دیتے ہیں۔ (گو بعض مسلمانوں نے بھی حماقت سے باوجود اصول میں متحد ہونے کے ایک دوسرے کو کافر اور بے دین کے فتوے دینے شروع کیے ہوئے ہیں۔) اور اختلاف کو چونکہ اس سے علیحدہ بیان کیا ہے اس لیے یہ اختلاف تعلیم حقہ سے ہے یعنی وہ سب کے سب فرقے تعلیم حقہ سے اختلاف کر رہے ہیں اور اس پر ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ﴾ سے بھی شہادت ملتی ہے کہ منشا تعلیم حقہ سے اختلاف کرنا ہے اور بینات سے مراد اسلام کی صداقت کے دلائل ہیں۔ جن میں سے بہت سی اسی سورت میں بیان ہو چکی ہیں۔

494- **مونہوں کی سفیدی اور سیاہی سے مراد:** ﴿تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّ تَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ﴾ سفیدی اور سیاہی اصل رنگوں میں ہے لیکن عزت اور ذلت پر بھی ان الفاظ کا استعمال ہے جیسا کہ مفردات میں ہے: [لَمَّا كَانَ الْبَيَاضُ اَفْضَلُ لَوْنٍ عِنْدَهُمْ عُبِّرَ عَنِ الْفَضْلِ وَالْكَرَمِ بِالْبَيَاضِ حَتّٰى قِيْلَ لِمَنْ لَمْ يَتَدَنَّسْ بِمَعَابٍ هُوَ اَبْيَضُ الْوَجْهِ] یعنی چونکہ سفید عرب کے نزدیک سب سے افضل رنگ ہے اس لیے بیاض سے مراد فضل و کرم ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ جو شخص عیب سے آلودہ نہ ہو اس کو [اَبْيَضُ الْوَجْهِ] یا سفید منہ والا کہا جاتا ہے اور پھر اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: [فَابْيِضَاضُ الْوُجُوْهِ عِبَارَةٌ عَنِ الْمُسَرَّةِ وَ اِسْوِدَادُهَا عَنِ الْغَمِّ]۔ یعنی مونہوں کی سفیدی کے معنی خوشی ہیں اور سیاہی سے مراد غم ہے۔ مفسرین کے دو گروہ ہیں، ایک گروہ تو اسی طرف گیا ہے اور دوسرا گروہ لفظی سفیدی اور سیاہی مراد لیتا ہے۔ مگر خود قرآن کریم نے اس محاورہ کو دوسری جگہ استعمال کر کے بتا دیا ہے کہ اس کا منشا کیا ہے۔ جہاں فرمایا: ﴿وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰى ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا﴾ [النحل: 58:16] جب لڑکی کی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ فی الواقع سیاہ نہیں ہوتا بلکہ مراد مغموم ہونا ہے اور لکھا ہے کہ جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہ کو امارت سپرد کی تو ایک شخص نے کہا: [يَا مُسَوِّدَ وُجُوْهِ الْمُؤْمِنِيْنَ] اے مومنوں کے منہ سیاہ کرنے والے۔ جو لوگ ظاہر کی طرف گئے تھے انہوں نے بھی مراد نور اور ظلمت کا مونہوں پر ہونا لیا ہے۔

كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

کفر کرتے تھے۔(495)

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور جن کے منہ سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں، وہ اسی میں رہیں گے۔(496)

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

یہ اللہ کی باتیں ہیں جن کو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور اللہ جہانوں کے لیے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع 11 8 2

اور اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ کی طرف ہی (سب) کام لوٹائے جاتے ہیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ

تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں (کی بھلائی) کے لیے ظاہر کی گئی ہے، تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو(497)

495- ﴿اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ سے کون لوگ مراد ہیں؟ منافقوں کا یہاں کوئی ذکر نہیں بلکہ ذکر پہلے لوگوں کا ہے جنہوں نے تفرقہ کیا اور دین حق سے اختلاف کیا۔ اس لیے ایمان سے مراد ان کا پہلے انبیاء پر ایمان ہوگا اور کفر سے مراد دین اسلام سے انکار۔ بعض نے ﴿بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ کی تاویل یوں کر لی ہے کہ بعد اس کے کہ تمہارے لیے وہ امور ظاہر ہو گئے جن کا تقاضا یہ تھا کہ تم ایمان لاتے۔

496- ﴿فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ﴾ یہاں جنت کی بجائے رحمۃ اللہ کا لفظ اختیار کیا ہے اور اسی میں خلود بتایا ہے۔ سچ ہے کہ اللہ کی رحمت ہی مومن کی حقیقی جنت ہے۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان جنت میں اپنے اعمال سے داخل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رحمت اور فضل سے ہی جنت ملتی ہے۔

497- كُنْتُمْ۔ یہاں كُنْتُمْ کے استعمال کی کئی توجیہیں کی گئی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ [كُنْتُمْ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ] تم اللہ کے علم میں بہترین امت تھے۔ بعض نے کہا [كُنْتُمْ فِي الْاُمَمِ قَبْلَكُمْ مَذْكُوْرِيْنَ بِاَنَّكُمْ خَيْرُ اُمَّةٍ] یعنی پہلی امتوں میں تمہیں بہترین امت کے نام سے یاد کیا گیا۔ جیسا کہ ﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ﴾ [الفتح: 29:48] ''یہ ان کی مثال توریت میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں۔'' سے ظاہر ہے اور بعض نے کہا كَانَ کو زائد کہہ کر معنی [اَنْتُمْ خَيْرُ

اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو یقیناً ان کے لیے اچھا

اُمَّةٍ] کیے ہیں مگر [دیکھو نمبر: 272] جہاں دکھایا گیا ہے کہ وصف لازم کسی چیز کا ذکر کرنے کے لیے بھی كَانَ کا استعمال ہوتا ہے۔ پس یہاں خیر ہونا گویا اس امت کا وصف لازم قرار دیا گیا ہے اور مراد یہ ہے کہ تم بہترین امت ہو اور ہمیشہ بہترین امت ہی رہو گے۔

اُخْرِجَتْ۔ خَرَجَ کے معنی ہیں اپنی قرارگاہ یا اپنی حالت سے ظاہر ہو گیا یا نکل آیا خواہ اس کی قرارگاہ گھر ہو یا شہر یا لباس اور خواہ اس کا حال۔ اپنے نفس میں اس کی کوئی حالت ہو یا اسباب خارجی میں۔ (غ) یہاں اُخْرِجَتْ کے معنی اُظْهِرَتْ کیے گئے ہیں۔ یعنی ظاہر کیے گئے۔ (ر)

امت محمدیہ کا کام دوسروں کی تکمیل ہے:

لِلنَّاسِ یہاں ل انتفاع کے لیے ہے یعنی تمہارا ظہور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ اسی لیے آگے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے۔ یعنی تمہارا کام دنیا میں نیکیوں کی تعلیم دینا اور نیکیوں پر لوگوں کو قائم کرنا اور بدیوں سے روکنا ہے۔ اور اسی لیے ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ کو جو کمال نفس کا مرتبہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے جو دوسروں کی تکمیل کے لیے ہے پیچھے رکھا ہے؛ کیونکہ اصل غرض یہاں یہی ظاہر کرنے کی ہے کہ تمہارا کام دوسروں کی تکمیل ہے اور ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ یا ان کے اپنے کمال نفس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ تا یہ معلوم ہو کہ وہ ایسی باتیں دوسروں کو نہیں کہتے جو خود نہ کرتے ہوں۔ بلکہ اگر دوسروں کی تکمیل چاہتے ہیں تو اپنے نفس کی تکمیل بھی کرتے ہیں۔

امت کی افضلیت:

اس آیت میں مسلمانوں کو بہترین امت قرار دیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صرف صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے ہے مگر اول تو یہاں لفظ كَانَ کا استعمال اس کے خلاف ہے دوسری کوئی وجہ اس قید کی نہیں۔ تیسرے حدیث سے بھی ثابت ہے کہ ساری امت کو ہی خیر الامم کہا ہے۔ چنانچہ امام احمد نے یہ حدیث روایت کی ہے: [قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "أُعْطِيتُ مَا لَمْ يُعْطَ أَحَدٌ مِّنَ الأَنْبِيَاءِ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَأُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ الأَرْضِ وَسُمِّيتُ أَحْمَدَ وَجُعِلَ التُّرَابُ لِيْ طَهُوراً وَّجُعِلَتْ أُمَّتِي خَيْرَ الأُمَمِ."] (مسند الإمام أحمد: جلد2، صفحہ 156؛ مؤسسة الرسالة) یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے وہ کچھ دیا گیا ہے جو اور کسی نبی کو نہیں دیا گیا میری نصرت رعب سے کی گئی ہے اور مجھے زمین کے خزانے دیئے گئے ہیں اور میرا نام احمد رکھا گیا اور میرے لیے مٹی پاک کرنے والی بنائی گئی اور میری امت بہترین امت بنائی گئی۔'' بے شک صحابہ رضی اللہ عنہم خود اس امت میں سے بھی بہترین گروہ ہے اور اس کی شہادت قرآن کریم سے ملتی ہے کہ ان کو ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [المائدہ: 119:5] ''اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔'' کی سند دی۔ لیکن یہاں ساری امت کی افضلیت کا دوسری امتوں پر ظاہر کرنا مقصود ہے اور اگر اس امت کے معلم اور مزکی محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کے تمام روحانی معلموں

اور مزکیوں سے افضل ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آنجناب کے شاگرد تمام انبیاء کے شاگردوں سے افضل نہ ہوں۔

یہ افضلیت کس بات میں ہے؟ اس کی وجہ خود بتادی ہے، ایک یہ کہ امت دنیا کے تمام لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ ہر ایک نبی کی امت زیادہ تر اپنی قوم کی بہتری میں ہی کوشاں رہی مگر محمد رسول اللہ ﷺ کی امت میں سے قومیت کا نشان مٹا کر ان کو تمام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے قرار دیا گیا۔ وہ صرف مسلمانوں کا ہی بھلا نہیں چاہتے بلکہ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملت کے لوگوں کا بھلا چاہنے والے ہیں۔ قومی تفرقوں کو اسلام نے ہمیشہ کے لیے مٹا دیا اور دوسری وجہ ان کی فضلیت کی ان کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہونا ہے یعنی بھلائیوں کا حکم دینے والے اور بدیوں سے روکنے والے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے انبیاء کی امتیں یہ کام نہ کرتی تھیں؟ اصل بات یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام انبیاء کا کام ہے اور گو سابقہ امتیں بھی ایک حد تک اس کام کو کرتی تھیں مگر ان کا کام بہت محدود تھا اور کئی رنگ میں محدود تھا۔ اور پھر ان کے اندر وقتاً فوقتاً انبیاء کی بعثت بھی ہوتی رہتی تھی۔ مگر یہ انبیاء کا کام اب پہلے سے ایک نہایت وسیع پیمانہ پر اسی امت کے سپرد کیا گیا ہے۔ کل دنیا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور قوائے انسانی کی ساری شاخوں کی پرورش کرنا اور سب کا تزکیہ کرنا یہ وہ عظیم الشان کام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے کسی نبی نے بھی کر کے نہیں دکھایا۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں اس وجہ افضلیت کو صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرة: 143:2] یوں ہم نے تم کو اعلیٰ درجہ کی امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمہارا پیشرو ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں اس امت کے علماء کو [وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ] انبیاء کے وارث اور [كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ] انبیائے بنی اسرائیل کے مثیل قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس امت میں کسی نبی نے آکر بھی کام کرنا ہوتا تو امت کی بحیثیت امت افضلیت دیگر امم پر جاتی رہتی۔ پس نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسرائیلی اس امت کے اندر آکر کام کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح بھی امت کی فضیلت جاتی رہتی ہے اور نہ کوئی دوسرا نبی اس امت کے اندر پیدا ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح بھی امت کی افضلیت دوسری امم پر نہیں رہتی۔

فضیلت کا ثبوت:

اور یہ دعویٰ کہ تم بہترین امت یا خیر الامم ہو بلا ثبوت نہیں چھوڑا گیا۔ جس ردّی حالت میں آنحضرت ﷺ نے عربوں کو پایا کیا بلحاظ عقائد کے اور کیا بلحاظ اعمال کے اور کیا بلحاظ جہالت کے ایسی بدترین حالت کی قوم اور کسی نبی کو اصلاح کے لیے نہیں دی گئی۔ مگر باوجود ایسی ردی حالت میں پانے کے آنحضرت ﷺ کی قوت قدسی نے ان کو ایمانی اور عملی پہلو کے لحاظ سے اور تعلیم اور تہذیب کے لحاظ سے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا کہ کسی نبی نے اپنی امت کو اس مقام پر نہیں پہنچایا۔ وہ نہ صرف زہد و عبادت میں تمام دنیا کی قوموں سے آگے بڑھ گئے بلکہ ہر طرح کے اخلاق فاضلہ کے زیور سے آراستہ ہو کر ہر پہلو میں دنیا کے ہادی اور رہبر بنے۔ کیا فتوحات ملکی کے لحاظ سے، کیا سیاست کے لحاظ سے، کیا تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے، کیا علوم کے لحاظ سے، کیا تہذیب کے لحاظ سے، کیا آزادئ خیال کو قائم کرنے کے لحاظ سے اور کیا مساوات نسل انسانی کے قائم کرنے کے لحاظ سے۔

الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ اَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

ہوتا۔ان میں سے کچھ مومن ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔(498)

لَنۡ يَّضُرُّوۡكُمۡ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَ اِنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ يُوَلُّوۡكُمُ الۡاَدۡبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے سوائے ستانے کے،اور اگر تم سے لڑیں گے تو تمہارے سامنے پیٹھ پھیر لیں گے، پھر ان کو مدد نہ دی جائے گی۔(499)

498- ﴿اَهۡلِ الۡكِتٰبِ﴾۔ اہل کتاب کا لفظ یوں تو وسیع معنی میں آتا ہے۔مگر اکثر جگہ صرف عیسائیوں اور یہودیوں کو اس سے خطاب کیا ہے اور بعض جگہ صرف عیسائیوں کو بھی اس سے خطاب کیا ہے۔مثلا: ﴿يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ﴾[النسآء: 171:4] ''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلومت کرو۔'' اور یہاں اہل کتاب سے صرف یہودی مراد ہیں۔جیسا کہ [آیت:112] کے مضمون سے ظاہر ہے۔ جہاں الفاظ: ﴿ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ﴾ ﴿وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ﴿وَ ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ﴾ استعمال کر کے جو مخصوص طور پر یہود کی سزا کے بارہ میں سورہ بقرہ میں آچکے ہیں صاف بتادیا کہ یہاں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کی یہ سزا پہلی سورت میں بیان ہوچکی ہے۔ایسا ہی الفاظ ﴿يَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ﴾ سے بھی یہی ظاہر ہے کہ صرف یہود کا یہاں ذکر ہے۔ کیونکہ قتل انبیاء کا الزام ہمیشہ انہی پر دیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اب اس سورت کے مضمون کو جنگ احد کے واقعات کی طرف لانا ہے۔اور ان جنگوں میں ہمیشہ یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو شرارت کا خطرہ رہتا تھا۔ کیونکہ ایک بڑی یہودی آبادی مدینہ منورہ میں تھی اس لیے اس جنگ کی تمہید میں ان کے ساتھ تعلقات کا ذکر کر دیا ہے اور واقعات جنگ کے ذکر کے اختتام پر بھی یہودیوں کا ذکر ہے اور بجائے کافر کے فاسق اس لیے کہا کہ ان لوگوں سے محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق عہد بھی لیا گیا تھا۔

499- اَذًى بمقابلہ ضرر وشر خفیف کو کہا جاتا ہے[دیکھو نمبر: 285]۔تکلیف دینے والی باتوں کو بھی اس سورت کے اخیر میں اَذًى کے نام سے موسوم کیا ہے: ﴿وَ لَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَ مِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَذًى كَثِيۡرًا﴾[آل عمران: 186:3] ''اور ضرور تم ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور ان سے جو مشرک ہوئے بہت سی دکھ دینے والی باتیں سنو گے۔'' حدیث میں جمعہ کے دن لوگوں کے اوپر سے گزر کر آنے جانے کو بھی اَذًى کہا ہے اور رستہ میں چھوٹی چھوٹی تکلیف دینے والی چیزوں کو بھی اذیٰ کہا ہے: [إِمَاطَةُ الأَذٰى عَنِ الطَّرِيقِ] (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب شُعَبِ الإِيمَانِ: 162)۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ان پر ذلت کی مار ہے جہاں کہیں وہ پائے جائیں، سوائے (اس کے کہ) اللہ کے عہد اور لوگوں کے عہد کے ذریعہ سے (پناہ لیں) اور وہ اللہ کا غضب کمالائے اور ان پر مسکینی کی مار ہے۔[500] یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے۔

یہود کی شکست کی پیشگوئی:

اس میں یہ پیشگوئی کی ہے کہ یہودیوں سے اہل اسلام کو کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے گی اور اگر وہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے تو شکست کھائیں گے اور اس کے آخر پر ﴿ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾ بڑھایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ منافق اور مشرک ان یہودیوں کو یہ وعدے دیتے رہتے تھے کہ اگر تم جنگ کرو گے تو ہم تمہاری مدد کریں گے جیسا کہ دوسری جگہ ذکر ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَ لَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَّبَدًا ۙ وَّ اِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ [الحشر: 11:59] ''کیا تو نے انہیں نہیں دیکھا جو منافق ہیں وہ اپنے بھائیوں کو جو اہل کتاب میں سے کافر ہیں کہتے ہیں اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے معاملہ میں کبھی کسی کی اطاعت نہ کریں گے۔ اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے۔ اور اللہ (تعالیٰ) گواہی دیتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔'' سو انہی وعدوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ان کی مدد کے لیے وہ ہرگز نہ نکلیں گے۔ بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جنگ میں شکست کھانے کے بعد پھر ان کی کبھی عزت نہ ہوگی یعنی ایسا نہ ہوگا کہ شکست کھا کر پھر وہی غالب آجائیں بلکہ ہمیشہ کے لیے خذلان ہی ان کے شامل حال رہے گا۔

500- ذِلَّةٌ کے معنی [نمبر: 91] میں بیان ہو چکے ہیں۔ گو یہ لفظ محض محکومیت پر بھی صادق آتا ہے مگر انتہا اس کی یہ ہے کہ ایسی قتل و غارت ان پر واقع ہو کہ کسی حالت میں آرام نہ ملے۔ چنانچہ مفسرین نے بھی عموماً [اَلْقَتْلُ وَالْاَسْرُ وَ سَبْيُ الذَّرَارِيْ] مراد لیا ہے۔ (ر) اور چونکہ محض محکومیت مسکنت میں شامل ہے اس لیے یہاں ذلت سے مراد یہی انتہائی ذلت قتل اور غارت کی ہے۔

حَبْلٌ کے معنی عہد اور ذمی اوپر بیان ہو چکے ہیں [نمبر: 490]۔ ﴿حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ سے مراد اللہ کا عہد یا ذمی ہے یعنی حکومت

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(سب) برابر نہیں، اہل کتاب میں سے ایک جماعت (حق پر) قائم ہے جو اللہ کی آیتوں کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

وہ اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں اور نیکیوں کو جلدی لیتے ہیں، اور وہی نیکوں میں سے ہیں۔ (501)

اسلامی جیسا کہ امر اللہ سے بھی کئی جگہ حکومت اسلامی ہی مراد لی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان بموجب فرمان الٰہی ان سے معاملہ کریں گے۔ اس لیے مسلمانوں کا عہد گویا اللہ کا عہد ہے اور ﴿حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ سے لوگوں کا عہد یعنی کوئی غیر اسلامی حکومت مراد ہے۔

یہود کا انجام:

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہود کا انجام ذلت، مسکنت اور اللہ کے غضب کے نیچے آجانا ہے اور یہی انجام ان کا دوسری جگہ سورۃ بقرہ میں بھی بیان ہو چکا ہے [البقرة: 61:2] ذلت اور مسکنت ان کی دنیوی حالت کے متعلق ہے اور ﴿بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ان کی دینی حالت کے متعلق ہے۔ مگر ذلت یعنی قتل و غارت کی حالت سے وہ اس طرح سے نکل سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذمّی میں آجائیں۔ یعنی حکومت اسلامی کے ماتحت آجائیں اور یا کسی دوسری حکومت سے معاہدہ کر کے رہیں (وَ یہاں اَوْ ہے) اور چونکہ غیر اسلامی سلطنتوں میں ان کو پورا آرام ملنا مقدر نہ تھا۔ اس لیے ﴿حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ کو بعد میں رکھا ہے اور یا النّاس سے مراد مسلمان ہیں یعنی اللہ کے عہد اور اہل اسلام کے عہد کے ذریعہ سے ہی یہ پورا امن حاصل کر سکیں گے اور اس طرح ''و'' سے ان دونوں کو حکم واحد میں رکھا ہے مگر مسکنت یا محکومیت سے اور اللہ کے غضب سے یہ کسی حالت میں نہ نکلیں گے۔

501- قَآئِمَةٌ۔ قِيَامٌ مختلف معنی میں آتا ہے۔ ایک قیام ایک وجود کا ہے جو تسخیر سے ہو یا اختیار سے۔ تسخیر سے جیسے: ﴿قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ﴾ [هود: 100:11] ''آباد اور (کچھ) اجڑی ہوئی ہیں۔'' اختیار سے جیسے: ﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا﴾ [الزمر: 9:39] ''کیا وہ جو رات کے وقتوں میں سجدہ کر کے اور کھڑا ہو کر فرمانبرداری کرنے والا ہے۔'' اور کسی چیز کا قیام اس کا نگاہ رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے یہی معنی یہاں ہیں۔ اور ایک قیام کسی چیز پر عزم کر لینا ہے جس کی مثال: ﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾ [المائدہ: 6:5] ''جب تم نماز کو اٹھو'' (غ) مفسرین نے: [مُسْتَقِيْمَةٌ عَادِلَةٌ] یا [قَائِمٌ بِحَقِّ

وَ مَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَ — اور جو کچھ وہ نیکی کریں گے تو اس کی ناقدری نہیں کی

الْعُبُوْدِيَةِ] (غق) یا [مُسْتَقِيْمَةٌ عَلٰى طَاعَةِ اللّٰهِ] (ر) معنی کیے ہیں یعنی حالت استقامت میں رہنے والی، عادل یا حق عبودیت کی حفاظت کرنے والی یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر استقامت اختیار کرنے والی جماعت۔

اٰنَآء۔ اِنٰی یا اِنًیٌ کی جمع ہے رات کی گھڑی۔ اور اَنٰی کے معنی ہیں ایک چیز اپنے وقت اور انتہا کو پہنچ گئی [حَانَ وَ اَدْرَكَ] اسی سے ہے۔ ﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [الحديد: 16:57] ''کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جائیں۔'' اور [اَنًّى الْحَرُّ] کے معنی ہیں گرمی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ ﴿يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَ بَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ﴾ [الرحمن: 44:55] ''وہ اس کے اور کھولتے پانی کے درمیان پھریں گے۔'' اور ﴿عَيْنٍ اٰنِيَةٍ﴾ [الغاشية: 5:88] ''ابلتے ہوئے چشمے۔'' یہی معنی ہیں اور اسی سے اَنٰی کے معنی پکنا ہیں۔ ﴿غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ﴾ [الأحزاب: 53:33] ''(مگر) اس کے بھی پکنے کا انتظار کرنے والے نہ ہو۔'' اور اِنَاءٌ برتن کو کہتے ہیں جس کی جمع اٰنِيَةٌ۔ ﴿وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ﴾ [الدهر: 15:76] ''اور ان پر چاندی کے برتنوں کا دور چلایا جائے گا۔'' (ل)

اہل کتاب کے مومن:

ان دو آیات میں اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے۔ مگر اہل کتاب میں سے ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ یہودیوں کے مذہب پر ہیں بلکہ وہ لوگ جو ان میں سے نکل کر اسلام میں آ گئے تھے جن میں سے عبداللہ بن سلام اور اسد بن عبید اور ثعلبہ بن شعبہ وغیرہم ہیں جیسا کہ اس سورت کے آخر پر فرمایا: ﴿وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ﴾ [199] چونکہ پچھلی آیت میں یہود کی ذلت اور ان پر غضب کا ذکر تھا تو اس لیے اب فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی قوم کے ساتھ یہ کوئی خصوصیت ہے بلکہ یہ ان کے اعمال کی وجہ سے ہے اسی لیے اس دوسرے گروہ کا ذکر کر دیا جو اپنے اعمال و اعتقادات کی وجہ سے ان تمام باتوں سے نکل کر ایک اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔

یہاں ان لوگوں کی کچھ صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مستقیم ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طاعت پر استقامت اختیار کرنے والے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ رات کی گھڑیوں میں آیات اللہ کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں کا ہی خاصہ ہے۔ تیسری صفت یہ ہے کہ ﴿هُمْ يَسْجُدُوْنَ﴾ [113] جس سے مراد یا نماز ہے کیونکہ رکوع اور سجدہ دونوں لفظ بوجہ اپنی عظمت کے نماز پر بولے گئے ہیں اور یا يَسْجُدُوْنَ سے مراد يَخْضَعُوْنَ ہے یعنی خدا کے حضور جھکے رہتے ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ حالت سجدہ میں تلاوت آیات کرتے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ سے روایت ہے: [اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَقْرَاَ رَاكِعًا وَسَاجِدًا] (غق) یعنی مجھے روکا گیا ہے کہ حالت رکوع یا حالت سجدہ میں قرآن شریف پڑھوں۔ ان تین صفات کے بعد جو عمل سے تعلق رکھتی ہیں ان کے عقیدہ کا ذکر فرمایا اور چوتھی صفت ان کی یہ فرمائی کہ وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں۔ ان الفاظ میں ہمیشہ قرآن شریف میں مسلمانوں کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں صفت ان کی یہ ہے کہ دوسروں کی تکمیل کرتے ہیں یعنی امر

اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

جائے گی اور اللہ متقیوں کو خوب جاننے والا ہے۔ (502)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

جنہوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) کے سامنے ان کے کسی کام نہ آئیں گے اور وہی آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔ (503)

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اس کی مثال جو اس دنیا کی زندگی کے متعلق خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ہوا، جس میں سخت سردی ہو وہ ان لوگوں کی کھیتی کو پہنچے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اسے تباہ کر دے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ (504)

بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور چھٹی یہ کہ ہر قسم کی بھلائیوں میں سبقت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان تمام امور کو ایک انسان اس حالت میں بھی کر سکتا ہے کہ سستی سے اور کمزور دلی سے ان کی طرف رغبت کرے مگر ان کی صفت یہ ہے کہ تمام بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں کہ پیچھے نہ رہ جائیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کا دل ان باتوں کے اندر ہے۔

502- يَكْفُرُوْهُ۔ كَفَرَ کے اصل معنی [سِتْرُ الشَّيْءِ] یعنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہیں۔ پس یہاں ﴿فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ﴾ سے مراد ہے: [لَنْ يُّحْرَمُوْا ثَوَابَهُ] یعنی اس کے ثواب سے محروم نہیں کیے جائیں گے۔ یا كُفْرٌ بمقابلہ شُكْرٌ ہے۔ چونکہ پہلی دو آیات میں کامل صالحین کا نقشہ کھینچا تھا۔ اس لیے اب بتایا ہے کہ ہر ایک اگر اس کمال کو حاصل نہ کر سکے تو جتنی بھی نیکی کرے اس کی بھی اللہ کے ہاں قدر ہے۔

503- قریباً یہی الفاظ سورۃ آل عمران کے شروع میں بھی آئے ہیں جہاں خاص طور پر نصاریٰ مخاطب تھے [دیکھو نمبر: 388]۔ یہاں یہود اور مشرکین عرب جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ جنگیں کر رہے تھے، خاص مخاطب ہیں۔

504- صِرٌّ۔ صِرٌّ اور صِرَّةٌ سردی کی شدت کا نام ہے۔ (ل) کیونکہ صِرٌّ کے اصل معنی شَدَّ یعنی کس کر باندھنا ہیں اور اسی سے اصرار ہے اور [صُرَّةٌ] یعنی تھیلی جس میں روپے باندھے جاتے ہیں اور رِيْحٌ صِرٌّ اور ﴿رِيْحٍ صَرْصَرٍ﴾ [الحاقة: 6:69] اس ہوا کو کہتے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَ مَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنوں کے سوائے (اپنے) راز دار نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، وہی چاہتے ہیں جو تمہیں تکلیف دے ان کے مونہوں سے بغض ظاہر ہو چکا ہے، اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بڑھ کر ہے۔ یقیناً ہم نے تمہارے لیے باتیں کھول کر بیان کر دی ہیں اگر تم عقل سے کام لو۔ (505)

ہیں جس میں سخت سردی ہو یا بعض کے نزدیک سخت آواز ہو۔ (ل) اور زجاج نے صِرٌّ کے معنی [صَوْتُ لَهِيْبِ النَّارِ]۔ (ر) کیے ہیں یعنی آگ کے شعلے کی آواز اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں اس کے معنی نار یعنی آگ بھی آئے ہیں (غق) مراد اس سے ایسی ہوا ہے جو بوجہ شدت سردی (یا بوجہ شدت گرمی کے) کھیتی کو تباہ کر دے۔

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ ان لوگوں کے مال اور اولاد جن کے فخر پر وہ تخریب اسلام کے درپے ہیں ان کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔ یہاں ان کی ان کوششوں کا انجام ایک مثال کے رنگ میں سمجھایا ہے ان کے خرچ کرنے کو [مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا] قرار دیا ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے تھے محض نمود اور ریا کے لیے تھا۔ ان کے لشکروں کی تیاری اور دیگر ایذا رسانی پر مال خرچ کرنے کو ایک کھیتی سے تشبیہ دی ہے جس کو آخر ایک عذاب کی ہوا تباہ کر دے گی اور ان کے ہاتھ میں سوائے حسرت اور ندامت کے کچھ نہ آئے گا اور آخر پر فرمایا کہ ان کی کوششوں کی ناکامی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظلم کے طور پر نہیں بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ کیونکہ بجائے نیکی اور تائید حق کے اپنے اموال کو معصیت اور تخریب حق پر خرچ کرتے ہیں اس لیے وہ سزا کے مستحق ہیں۔

505- بِطَانَةٌ۔ بَطْنٌ اصل میں پیٹ ہے لیکن ہر چیز میں اس کے ظاہر کے خلاف کو اس کا بطن کہہ دیتے ہیں اور اسی طرح بِطَانَةٌ خلاف طَهَارَةٌ ہے اور بطور استعارہ بِطَانَةٌ کا استعمال اس شخص پر ہوتا ہے جس کو تم اپنے معاملہ کے باطن یعنی راز پر اطلاع دینے کے لیے خاص کر لو۔ (غ) اور ایک حدیث میں جس کو بخاری، نسائی وغیرھما نے روایت کیا ہے بِطَانَةٌ اس ملک اور شیطان پر بولا گیا ہے جو انسان کا قرین ہے۔ [مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَّبِيٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيفَةٍ إِلَّا كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ بِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالْخَيْرِ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ وَبِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحُثُّهُ عَلَيْهِ وَالْمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَ اللّٰهُ] (صحيح البخاري، كتاب الأحكام، باب بِطَانَةِ الإِمَامِ وَأَهْلِ مَشُورَتِهِ: 7198) یعنی اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کوئی خلیفہ بنایا ہے مگر اس کے لیے دو صاحب سر ہوتے ہیں۔ ایک صاحب سر جو اسے نیکی کا حکم کرتا ہے اور اس کی ترغیب دلاتا ہے اور ایک صاحب سر جو اسے برائی کا امر کرتا ہے اور اس پر برانگیختہ کرتا ہے اور معصوم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچا لے۔ اس سے

هٰٓاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَلَا يُحِبُّوۡنَكُمۡ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَيۡظِ ؕ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ ؕ

سنو! تم وہ ہو جو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے، حالانکہ تم ساری کی ساری کتاب پر ایمان لاتے ہو۔ اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو سخت غصے کے مارے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہہ، اپنے غصے میں مرجاؤ۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے خلفائے مامورین یعنی مجددین بھی یوں تو اس قانون کے ماتحت ہیں جس کے ماتحت سب انسان ہیں مگر اللہ اپنے فضل سے ہی جس کو چاہتا ہے بچا لیتا ہے۔ اس سے **انبیاءؑ کی عصمت پر بھی دلیل ملتی ہے۔**

خَبَالًا۔ خَبَالٌ وہ فساد ہے جو کسی جاندار کو پا کر اس میں اضطراب پیدا کر دے جیسے جنون یا ایسی بیماری جو عقل وفکر پر اثر ڈالے۔ (غ)

البَغْضَآءَ۔ بُغْضٌ نفس کا اس چیز سے نفرت کرنا ہے جس کو تم ناپسند کرو۔ (غ) اور بَغْضَآءُ شدت بغض ہے۔

اَفْوَاهٌ۔ اس کا واحد فَمٌ ہے جس کے معنی منہ ہیں مگر اصل اس کا فُوْهٌ ہے۔

اس آیت میں **اپنے دشمنوں کو راز دار دوست بنانے کی ممانعت کی ہے** اور یہ امر ظاہر ہے کہ اپنے دشمن کو راز دار دوست بنانا اپنی ہی تخریب ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ﴿مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ﴾ عام الفاظ ہیں ان کو دشمنوں کے ساتھ خاص کیوں کیا جائے تو اس کی وجہ خود آگے بیان کر دی ہے۔ کیونکہ ان کے متعلق خود فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ بلکہ چاہتے ہیں کہ ان پر کوئی ہلاک کرنے والی مصیبت آئے۔ پھر یہ ان کی باتیں مخفی ہی نہیں بلکہ یہ بغض ان کے الفاظ سے ظاہر ہو چکا ہے۔ ہاں جس قدر انہوں نے ظاہر کیا ہے اس سے بہت بڑھ کر ابھی ان کے سینوں میں مخفی ہے۔ یہ سب کچھ کھول کر مسلمانوں کو بتا دیا تا کہ وہ جلد ان کی ہلاک کر دینے والی دوستی سے بچیں۔

یہودیوں کی منافقت اور بدزبانی:

یہود نے جیسا کہ اگلی آیت سے معلوم ہوگا، منافقانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ ادھر نبی کریم ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر رکھا تھا ادھر اندر ہی اندر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور مسلمانوں کے دشمنوں کو مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کے لیے اکساتے رہتے تھے۔ ان مخفی شرارتوں کے علاوہ ان کی بدزبانی بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی جیسا کہ ﴿قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ﴾ سے ظاہر ہے نبی کریم ﷺ کے سامنے بھی شرارت کے الفاظ بول دیتے تھے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ذکر آ چکا ہے مگر اس سے بڑھ کر بھی مسلمانوں کو بدزبانی سے ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔ اور اشعار میں پاک دامن مسلمان عورتوں پر گندے حملے کرتے رہتے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾ اللہ سینوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔ (506)

اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۫ وَ اِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع 12 11 3

اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچے ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی برائی پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو تو ان کی تدبیر تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے گی، اللہ اس کا جو وہ کرتے ہیں احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (507)

506- ﴿وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ﴾ میں واؤ حالیہ ہے اور الکتاب سے مراد جنس کتاب ہے یعنی تم سب کتب الٰہی پر ایمان لاتے ہو جن میں ان کی کتاب بھی شامل ہے۔

﴿عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ﴾ عَضَّ دانتوں سے کاٹنے کو کہتے ہیں اور اَنَامِلُ۔ اَنْمِلَۃٌ کی جمع ہے اور اس کے معنی انگلیوں کی اطراف یعنی پورے ہیں۔ اور عَضُّ اَنَامِلَ خاص محاورہ ہے جس سے مراد اظہار ندامت ہوتا ہے (غ) کیونکہ یہ لوگوں کی عادت ہے کہ ندامت کے وقت ایسا کرتے ہیں اور سخت غصہ کے وقت بھی انسان ایسا ہی کرتا ہے۔ گویا اپنے آپ کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

اَلْغَيْظُ۔ غَيْظٌ شدید غضب کو کہتے ہیں اور یہ وہ حرارت ہے جو انسان قلب کے خون کے جوش میں آنے سے اپنے اندر پاتا ہے۔ (غ)

﴿قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ﴾ یہ ان کی حالت کا اظہار ہے گویا عملاً ان کو یہ کہہ دینا چاہیے کہ وہ غیظ میں ہی مر جائیں اور مطلب یہ ہے کہ یہ غیظ ان کا جو مسلمانوں کی کامیابیوں پر پیدا ہوتا ہے روز بروز بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور یوں بھی یہ الفاظ ان کو پہنچا ہی دیئے گئے۔

اس آیت میں اول مسلمانوں کو ان کی محبت سے روکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ان کی شرارتوں کے مسلمان اپنی پاک فطرتوں کی وجہ سے ان سے محبت ہی کرتے تھے اور اگر معمولی حالات رہتے خواہ وہ اسلام میں داخل نہ ہوتے تو مسلمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نہ روکتا۔ مگر روکنے کی وجہ بھی بتادی کہ ان کا غیظ وغضب تم پر حد سے بڑھا ہوا ہے۔ پہلے فرمایا: ﴿وَ لَا يُحِبُّوۡنَكُمۡ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ﴾ یعنی حالانکہ تم تو ان کی کتاب پر بھی ایمان لاتے ہو پھر بھی وہ تم سے محبت نہیں کرتے۔ حالانکہ حق یہ تھا کہ جب مذہب کے رو سے بھی مسلمان ان کی کتابوں کو اصولاً منزل من اللہ مانتے تھے تو وہ ان سے محبت کرتے تو فرمایا کہ جب باوجود اس کے تم ان کی کتاب پر ایمان لاتے ہو وہ تم سے محبت نہیں کرتے تو وہ نہ صرف تمہاری کتاب پر ہی ایمان نہیں لاتے بلکہ تمہارے ساتھ اس قدر بغض رکھتے ہیں کہ تمہارا سکھ ان کے لیے موجب دکھ ہے۔

507- حَسَنَۃٌ۔ حَسَنٌ ہر ایک خوش کرنے والے امر کو کہتے ہیں جس میں رغبت کی جائے اور اسی سے حَسَنَۃٌ جس سے مراد ہر ایک نعمت

وَ اِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾

اور جب تو سویرے اپنے گھر والوں سے چلا مومنوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر بٹھاتا تھا، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(508)

ہے جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا حالت میں پہنچے اور اس کی ضد سَيِّئَةٌ ہے۔(غ) مزید تفصیل کے لیے [دیکھو نمبر: 105]

كَيْدُ۔ كَيْدٌ کے اصل معنی زبان عربی میں احتیال اور اجتھاد ہیں یعنی باریک یا خفیہ تدبیر اور کوشش کرنا۔(ل۔غ۔ن) اور امام راغب کہتے ہیں کبھی کید مقام مدح میں ہوتا ہے اور کبھی مقام ذم میں گو اس کا اکثر استعمال مقام ذم میں ہے کئی احادیث میں یہ لفظ آتا ہے۔ایک میں ہے: [فِيْ عُقُوْلٍ كَادَهَا خَالَقَهَا] جس کے معنی ابن اثیر کرتے ہیں [اَرَادَهَا بِسُوْءٍ] یعنی ان کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا ہے۔ایک میں ہے: [دَخَلَ عَلٰى سَعْدٍ وَهُوَ يَكِيدُ بِنَفْسِهِ] جہاں معنی کیے گئے ہیں اَلنَّزْعُ یعنی آپ سعد رضی اللہ عنہ پر داخل ہوئے اور وہ حالت نزع میں تھے۔کیونکہ کید کے معنی اَلسَّوْقُ یعنی چلانا بھی آتے ہیں۔گویا وہ اپنی جان کو نکال رہے تھے۔اور ایک میں آتا ہے: [اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ غَزَا غَزْوَةَ كَذَا فَرَجَعَ وَلَمْ يَلْقَ كَيْدًا] یعنی آپ فلاں غزوہ میں گئے اور آپ واپس آئے اور کوئی کید نہیں ملا۔ جہاں کید کے معنی حرب یعنی جنگ آئے ہیں یعنی جنگ کوئی نہیں ہوئی۔

اس آیت میں ان کی خطرناک عداوت کا مزید بیان کیا ہے اور پھر ان کی چالوں اور تدبیروں سے بچنے کی راہ بتائی ہے۔ پہلے فرمایا کہ ان کی عداوت کا یہ حال ہے کہ تم کو سکھ چھو بھی جائے تو ان کو برا لگتا ہے اور تم پر دکھ کی مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

یہاں سکھ کے لیے تَمْسَسْكُمْ استعمال کیا ہے اور دکھ کے لیے تُصِبْكُمْ۔یعنی وارد ہو جانا۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ سکھ کا محض چھو جانا یعنی خدا سے سکھ کا ان کو ملنا بھی ان کے لیے باعث تکلیف ہوتا ہے۔ حالانکہ دکھ اور تکلیف جب کبھی کسی شخص کو پہنچے تو فطرت انسانی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ رنجش اور کدورت جو تھوڑی بہت باہم ہو وہ دور ہو کر اس کی جگہ ہمدردی پیدا ہو جائے۔مگر ان کی عداوت اس قدر شدید ہے کہ مسلمانوں پر مصیبت وارد ہو تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

508- غَدَوْتَ اس کا مادہ غَدَا سے اور غُدْوَةٌ اور غَدَاةٌ دن کے ابتدا کو کہتے ہیں اور غَدَاءٌ اس طعام کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت کھایا جائے۔(غ) پس غَدَوْتَ کے معنی ہوئے صبح کے وقت نکلا۔

حضرت عائشہؓ کا جنگ اُحد میں شریک ہونا:

﴿مِنْ اَهْلِكَ﴾ اَهْلٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 137]۔خصوصیت سے یہ لفظ بی بی پر بولا جاتا ہے۔(غ) تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس جنگ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں غزوہ احد کے بیان

اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ جب تم میں سے دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں

میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں حالت جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اپنی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ پانی کی مشکیں بھر بھر کر اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لاتی اور زخمیوں کو پلاتی تھیں اور ام سلیط رضی اللہ عنہا کے بھی زخمیوں کو پانی پلانے کا ذکر بخاری میں ہے اور ام عمارہ رضی اللہ عنہا کا ذکر ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنوں کا دفاع بھی کرتی تھیں۔ **عورتوں کا جنگوں میں شامل ہونا** تاریخی امر ہے اور احد کے میدان میں بھی ان کی شمولیت ثابت ہے۔ پس اَهْلِكَ سے مراد یہاں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں اور انہی کے گھر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُٹھ کر ہفتہ کے دن صبح ہی مومنوں کو لڑائی کے موقعوں پر آراستہ کیا۔

تُبَوِّئُ۔ بَوَّأَ سے ہے اور بَوَّأَ اصل میں مکان میں اجزاء کی مساوات کو کہتے ہیں یعنی ہموار کی کو، [دیکھو نمبر: 91]۔ اور [بَوَّأْتُ لَهُ مَكَانًا] کے معنی ہیں سَوَّيْتُهُ (غ) یعنی اس کے لیے مکان کو ہموار کیا۔ مطلب یہ کہ اس کو ایسا مکان دیا جس میں وہ مضبوطی سے قدم جما سکے اور صرف جگہ یا مکان دینے پر بولا جاتا ہے: ﴿اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا﴾ [یونس: 87:10] ''اپنی قوم کے لیے مصر میں گھر بناؤ۔'' ﴿وَ لَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [یونس: 93:10] ''اور بلاشبہ ہم نے بنی اسرائیل کو ٹھہرایا۔'' ﴿يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ﴾ [یوسف: 56:12] ''وہ اس میں جہاں چاہتا اختیار رکھتا تھا۔''

مَقَاعِدَ۔ مَقْعَدٌ کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ ہیں اور ﴿مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ قِتَالٌ کے لیے بیٹھنے کی جگہیں ہیں جس سے مورچے مراد ہیں۔ (غ) یہاں سے جنگ احد کا ذکر شروع ہوتا ہے اور طرز عبارت ﴿وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ﴾ گویا یہ کسی پہلے بیان پر بطور عطف ہے ایسی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ مضمون ایک ہی چل رہا ہے۔ ابو مسلم نے اسے ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا﴾ [13] ''ان دو گروہوں میں جن کی آپس میں مڈھ بھیڑ ہوئی یقیناً تمہارے لیے نشان تھا۔'' پر عطف قرار دیا ہے یعنی ایک تو نشان جنگ بدر میں تھا اور ایک نشان جنگ احد میں ہے۔ مگر میرے نزدیک اس کا تعلق پچھلے رکوع کی آخری آیت سے ہے کیونکہ وہاں فرمایا تھا کہ تم کو کوئی دکھ پہنچے تو اہل کتاب خوش ہوتے ہیں اور تم کو خوشی پہنچے تو انہیں برا لگتا ہے۔ تو اب اس واقعہ کا ذکر آتا ہے جس میں مسلمانوں کو کچھ دکھ پہنچا اور واقعہ جنگ احد کا ہے اور اس رکوع میں اس جنگ کی طرف نکلنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے لشکروں کو مورچوں پر بٹھانے اور نصرت ملائکہ کا ذکر ہے۔

جنگ بدر میں سخت ہزیمت اٹھانے کے بعد قریش مکہ نے ایک بڑی بھاری کوشش اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے اور پہلی ہزیمت کا داغ مٹانے کے لیے کی اور اگلے سال یعنی 3 ہجری میں تین ہزار کا لشکر لے کر جس میں دو سو سوار تھے شوال کے مہینہ میں احد کے مقام پر جو مدینہ کے شمال میں صرف چار میل کے فاصلہ پر ہے پہنچ گئے۔ ان کا وہاں ٹھہر جانا اس لیے تھا کہ تا مسلمان کسی طرح مدینہ سے باہر نکل آئیں کیونکہ مدینہ کے اندر رہنے سے ان کی حالت زیادہ مضبوط رہتی۔ چنانچہ بدھ کے دن وہ مقام اُحد پر پہنچے۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تیاری کی اور جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ آپ چلے اور ہفتہ کے دن صبح صف

آرائی کی اور اسی دن جنگ اُحد ہوئی۔ بعض نے لکھا ہے کہ 11 شوال تھی اور بعض نے اسے نصف شوال کہا ہے۔

جنگ اُحد کے متعلق مشورہ:

نکلنے سے پہلے نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ ہم کو باہر نکل کر ان کے ساتھ جنگ کرنی چاہیے یا مدینہ کے اندر رہ کر اور اس مشورہ میں عبداللہ بن اُبی کو بھی جو بعد میں رئیس المنافقین کے نام سے مشہور ہوا بلایا۔ اس سے پہلے آپ نے اسے کبھی نہ بلایا تھا۔ عبداللہ نے یہ مشورہ دیا کہ مدینہ کے اندر ہی رہ کر جنگ کرنی چاہیے۔ انصار کے بعض لوگوں نے بھی یہی مشورہ دیا مگر دوسرے لوگوں نے عرض کیا کہ ہم کو باہر نکلنا چاہیے۔ کیونکہ اگر ہم باہر نکل کر نہ لڑیں تو ان کا خیال ہوگا کہ مسلمان ہم سے ڈر گئے اور محصور ہو کر جنگ کی۔ رسول اللہ ﷺ کی اپنی رائے بھی پہلے گروہ کے ساتھ تھی۔

آنحضرت ﷺ کی تین رؤیا: اور آپ نے تین خواب بھی اس بارہ میں دیکھے تھے ایک یہ کہ میرے لیے ایک گائے ذبح کی گئی ہے۔ اس کی تعبیر آپ نے کی کہ ہمارے لیے بہتری ہے۔ دوسرا یہ کہ میں نے اپنی تلوار کی دھاریں بعض جگہ شکستہ دیکھی ہیں اور اس کی تعبیر آپ نے یہ کی کہ ہمارے غلبہ میں کچھ آثار ہزیمت کے ہوں گے۔ تیسرا یہ کہ میں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے اور اس کی تعبیر آپ نے مدینہ سے کی یعنی اگر ہم مدینہ میں رہیں گے تو یہ ہمیں ایک مضبوط زرہ کا کام دے گا۔ مگر کثرت رائے یہی تھی کہ باہر نکلنا چاہیے۔ اسی کے مطابق آپ نے فیصلہ کیا۔ یہ ہے **مشورہ کی عزت** اور شوریٰ کے فیصلہ کی عزت جو نبی کریم ﷺ نے جو خود مہبط وحی تھے کر کے دکھائی کہ اپنی رائے بلکہ اپنی رؤیا کے خلاف شوریٰ کے فیصلہ کو ترجیح دی۔

واقعات جنگ اُحد:

غرض جمعہ کے بعد ایک ہزار آدمی کو لے کر آپ باہر نکلے جب ایک مقام شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن اُبی ایک تہائی آدمیوں کو ساتھ لے کر اس لیے واپس آ گیا کہ میرے مشورے کے مطابق کیوں کام نہیں کیا گیا؟ سو آپ چھ سو اور سات سو کے درمیان آدمیوں کو لے کر احد کے مقام پر پہنچے اور اگلے دن علی الصباح پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھ کر اپنے لشکر کو جنگ کے لیے تیار کیا اور ایک مورچہ پر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ماتحت پچاس تیراندازوں کو کھڑا کیا اور ان کو حکم دیا کہ ہم کو فتح ہو یا شکست، تم نے کسی صورت میں اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا ہوگا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے ایسے جوش سے حملہ کیا کہ سات سو کے سامنے تین ہزار کے پاؤں اکھڑ گئے ان کے علمبردار یکے بعد دیگرے مارے گئے اور بہت سے آدمی ان میں سے زخمی ہو گئے آخر وہ قائم نہ رہ سکے اور بھاگ اٹھے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور خوب دور نکل گئے۔ تیراندازوں نے سمجھا اب فتح کامل ہو گئی ہے اور اب اس جگہ کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اپنے امیر کے حکم کے خلاف جگہ کو چھوڑا۔ قریش کے رسالہ پر خالد بن ولید اور عکرمہ تھے انہوں نے جب اس مورچہ کو خالی دیکھا تو فوراً رسالہ کے ساتھ عقب سے حملہ کیا ادھر قریش کا بھاگتا ہوا لشکر سنبھلا۔ مسلمان تعاقب کی وجہ سے پہلے ہی منتشر تھے۔ اب دو طرف سے حملہ ہوا۔ یہ ایک بڑا سخت وقت تھا اور فوج تتر بتر تھی اتنے میں نبی کریم ﷺ نے اس حالت کو دیکھ کر بلند آواز سے پکارا [إِلَيَّ عِبَادَ اللهِ أَنَا رَسُولُ اللهِ] ''اے اللہ کے بندو! میری طرف آ جاؤ میں اللہ

وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

اور اللہ ان دونوں کا ولی تھا، اور اللہ پر ہی مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ (509)

کا رسول ہوں۔'' کفار کی اصل غرض تو یہی تھی کہ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کو ماریں۔ ان الفاظ کے ساتھ اگر ایک طرف کچھ صحابہ آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہو گئے تو دوسری طرف کفار کے حملے کا سارا زور اسی موقعہ پر ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کے سر میں زخم آیا اور کچھ دانت بھی زخمی ہو گئے اور آپ گر گئے مگر ساتھ ہی آپ کے صحابہ نے آپ کے اردگرد اور دشمن کے مقابل پر ایک مضبوط دیوار بنالی اور سب مسلمان آہستہ آہستہ یہاں جمع ہو گئے۔ اور چند ایک نفوس مدینہ کی طرف بھاگ گئے۔ جب دشمن نے دیکھا کہ مسلمانوں کی پراگندہ جمعیت پھر اکٹھی ہو گئی ہے تو انہوں نے فوراً واپسی کی ٹھان لی اور مسلمانوں کو میدان جنگ میں چھوڑ کر مکہ واپس ہوئے۔ مسلمانوں کو نقصان ضرور پہنچا، مارے بھی گئے، زخمی بھی ہوئے مگر انہوں نے شکست نہیں کھائی۔ کفار سخت نقصان اور کھلی ہزیمت سے ضرور بچ گئے مگر انہوں نے فتح حاصل نہیں کی بلکہ صرف مسلمانوں کے تعاقب سے محفوظ ہو کر گھر کی راہ لی۔

آنحضرت ﷺ کے مختلف کام:

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر قسم کی ذمہ داری کے کام کو خود ہی کرتے تھے۔ یہاں مسلمان فوج کو مورچوں پر بٹھانا بھی آپ کا کام بتایا ہے۔ گویا جرنیل یا کمانڈر کا اصل کام آپ خود ہی کرتے تھے۔ کس قدر مختلف شعبے کام کے آپ کی ذات میں جمع تھے۔ خود ہی نمازوں کی امامت کرائیں، خود ہی تعلیم دین دیں، خود ہی جھگڑوں کے فیصلے کریں، خود ہی قوانین بنائیں، خود میدان جنگ میں جا کر لڑیں اور خود ایک جرنیل کا کام بھی کریں۔ غرض کوئی پہلو ایسا نظر نہیں آتا جس میں آپ نے خود ہی ایک نمونہ قائم نہ کیا ہو۔

509- هَمَّتْ۔ هَمٌّ ایسے غم کو کہتے ہیں جو انسان کو پگھلا دے۔ (غ) اس لیے [اَهَمَّهُ الْاَمْرُ] کے معنی ہیں [اَقْلَقَهُ۔ اَحْزَنَهُ] (ل) یعنی اس امر نے اس کو قلق میں یا حزن میں ڈالا۔ اسی لیے [مُهِمَّاتُ الْاُمُوْرِ] ان سخت امور کو کہتے ہیں جو حزن میں ڈالنے والے ہوں اور [هُمْ بِالشَّیْءِ] کے معنی ہیں اس کی نیت یا ارادہ کیا یا اس پر عزم کیا۔ (ل) هِمَّةٌ اور هِمَامٌ اسی سے ہے هِمَّةٌ کسی امر کے کر لینے کے قصد کا نام ہے اور هِمَامٌ۔ [عَظِيْمُ الْهِمَّةِ] آدمی کو کہتے ہیں اور یہاں هَمَّتْ کے معنی صرف دل میں ایک خیال کا لانا ہے جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے کہ ان سے وہ کمزوری سرزد نہیں ہوئی۔

تَفْشَلَا۔ فَشَلٌ سے ہے جس کے معنی ہیں وہ کمزوری جس کے ساتھ بزدلی ملی ہوئی ہو۔ (غ)

يَتَوَكَّلُ۔ وَكَّلَ سے ہے [وَكَّلْتُ اَمْرِیْ اِلٰی فُلَانٍ] کے معنی ہیں دوسرے کی طرف ایک امر کو لے گیا اور اس بارہ میں اس پر اعتماد کیا۔ (ل) اور توکل کا استعمال دو طرح پر ہے ایک صلہ لام کے ساتھ [تَوَكَّلْتُ لِفُلَانٍ] کے معنی ہیں [تَوَكَّلْتُ لَهُ] یعنی اس کی خاطر میں اس کا متولی ہو گیا اور [تَوَكَّلْتُ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں [اِعْتَمَدْتُّ عَلَيْهِ] یعنی اس پر میں نے اعتماد

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ اور یقیناً اللہ نے تم کو بدر میں مدد دی جب تم کمزور تھے

کیا۔(غ) اور اللہ تعالیٰ کا وکیل ہونا اسی معنی میں ہے کہ وہ سب امور کا متولی ہے۔(غ)

یہ دو گروہ جن کا ذکر اس آیت میں ہے کون تھے؟ بخاری میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: [فِينَا نَزَلَتْ (اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا) قَالَ نَحْنُ الطَّائِفَتَانِ بَنُو حَارِثَةَ وَبَنُو سَلِمَةَ، وَمَا نُحِبُّ أَنَّهَا لَمْ تُنْزَلْ لِقَوْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا): 4558) یعنی یہ آیت ہمارے متعلق اتری اور ہم بنو حارثہ اور بنو سلمہ وہ دو گروہ ہیں اور ہم کو یہ پسند نہیں کہ یہ نہ اترتی کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ ان دونوں کا کارساز اور مددگار ہے۔ ان کا هَمٌّ یا ارادہ محض حدیث نفس کے طور پر تھا۔ اس لیے اگر عزم ہوتا تو وہ کر بھی گزرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فوج کفار کے مقابلہ پر اس قدر قلت کو دیکھ کر ایک اور چار کی نسبت سے بھی کفار زیادہ تھے ان کے دلوں میں یہ کمزوری کا خیال آیا۔

اللہ پر توکل کرنے سے کیا مراد ہے؟ لفظی معنی بھروسہ یا اعتماد کرنا ہیں مگر کیا خدا پر بھروسہ کرنے سے یہ مطلب ہے کہ ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیے اور کام کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ جو چاہے کرے۔ یہی معنی آج کل مسلمانوں نے توکل کے سمجھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی معنی توکل کے نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے سمجھے ہوتے تو نہ وہ جنگ کو نکلتے، نہ دشمن کی خبر رکھتے، نہ دور دور دشمنوں کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجتے، نہ مہمات کا فکر کرتے، نہ ان کے لیے روپیہ جمع کرتے، نہ ہتھیار فراہم کرتے، نہ دن رات مسلح رہتے اور یہ سب کچھ وہ کرتے تھے۔ خود اسی موقعہ پر جو توکل کی ہدایت ہوئی ہے تو کس معنی میں؟ دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ جنگ سے واپس ہو جائیں مگر خدا نے ان کو اس ارادہ کے عمل میں آنے سے بچا لیا اور فرمایا کہ مومن خدا پر توکل کیا کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ جنگ کرنا توکل تھا اور جنگ نہ کرنا خلاف توکل تھا۔ پس قرآن کریم کے اس استعمال نے بتا دیا کہ توکل اسباب سے کام لینے کا نام ہے، اسباب کو ترک کرنے کا نام نہیں۔ اور فی الحقیقت وہ شخص خدا پر بھروسہ کرنے والا نہیں کہلا سکتا جو خدا کے پیدا کیے ہوئے اسباب سے کام نہیں لیتا بلکہ حقیقت توکل یہ ہے کہ اسباب خواہ کمزور بھی نظر آئیں تو بھی ان سے کام لے۔ کیونکہ یہاں دو گروہوں کو جنگ نہ کرنے کا خیال اس لیے پیدا ہوا کہ دشمن طاقتور تھا اور ادھر تین ہزار کے مقابلہ میں سات سو تھے۔ تو حکم ہوا کہ تم اپنا پورا زور لگاؤ اور یہ پروا نہ کرو کہ کیا ہوگا۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ اسباب سے پورا کام لے کر نتیجہ کو خدا پر چھوڑے یہ توکل ہے۔ کام کرے گو نتیجہ خلاف امید بھی ہو تو بھی کام نہ چھوڑے اور یہ سمجھ لے کہ میرا فرض تو کام کرنا ہے اس پر نتیجہ مترتب کرنا خدا کا کام ہے۔ پس خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ اسباب پر پورا زور لگائے نتیجہ کو سپرد خدا کرے۔ یہ توکل انسان کی ہمت بڑھانے والی چیز ہے اور مصائب کے نیچے اس کو ہمت ہارنے سے روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے صبر کے ساتھ توکل کو جمع کیا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے اور دوسری جگہ ہے: ﴿وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۠ ﴾[إبراهيم: 12:14] ''اور کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں اور اسی نے ہمیں ہمارے رستوں کی ہدایت کی ہے اور ضرور ہم اس پر صبر

فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ پس اللہ کا تقویٰ کرو تا کہ تم شکر گزار بنو۔ (510)

کریں گے جو تم ہمیں ایذا دیتے ہو اور چاہیے کہ بھروسا کرنے والے اللہ پر ہی بھروسا کریں۔'' ﴿الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ﴾ [النحل: 42:16] ''جنہوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔'' اور ایک جگہ کمال صفائی سے عمل اور صبر اور توکل کو جمع کیا ہے: ﴿نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ۙ﴿۵۹﴾ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ﴿۶۰﴾﴾ [العنکبوت: 29:58-59] عمل یعنی کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے وہ جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ پس قرآن کریم کی اس صریح تعلیم کے مطابق توکل یہ ہے کہ انسان اسباب سے خوب کام لے اور نتیجہ خلاف بھی ہو تو گھبرائے نہیں بلکہ نتیجہ کو خدا پر چھوڑے۔

احادیث سے توکل کے معنی پر روشنی:

احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ حج میں جو لوگ زادراہ لیے بغیر جایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے [نَحْنُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ] ان کو قرآن کریم نے وَتَزَوَّدُوا کہہ کر روکا، بتادیا کہ اسباب سے کام نہ لینا یہ توکل نہیں۔ نبی کریم ﷺ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اونٹ کو خدا کے توکل پر کھلا چھوڑ دوں۔ تو فرمایا: [اَعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ] اس کے گھٹنے کو رسی سے باندھ دو اور توکل کرو۔ یعنی اسباب سے کام لو اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دو۔ اور اس کے خلاف جن احادیث سے نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ مثلاً یہ حدیث: [لَوْ أَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُونَ عَلَى اللهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُو خِمَاصاً وَتَرُوحُ بِطَاناً] (مسند أحمد:جلد1، صفحہ 332؛ مؤسسة الرسالة) یعنی اگر تم اللہ پر توکل کرو جو حق توکل کا ہے تو تم کو رزق دے جس طرح پرند کو رزق دیتا ہے کہ صبح کے وقت بھوکا نکلتا ہے اور شام کو پیٹ بھر کر آتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ طلب معاش کی ضرورت نہیں حدیث کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ حدیث میں یہ نہیں کہ پرند کو گھونسلے میں رزق بھیج دیتا ہے بلکہ پرند تلاش رزق کے لیے نکلتا ہے تو اسے بھی مل جاتا ہے۔ تو مطلب صاف ہوا کہ تم اگر تلاش کرو گے تو تم کو بھوکا نہیں مارے گا۔ مسلمانوں کے ادبار کے اسباب میں سے توکل کا غلط مفہوم بھی ایک بھاری سبب ہے۔

510- بدر مکہ اور مدینہ کے درمیان (مدینہ سے تین منزل اور مکہ سے دس منزل دور) ایک مقام کا نام ہے اور یہ ایک کنویں کے نام پر ہے جو اسی نام کے ایک شخص نے لگوایا تھا۔ اس مقام پر نبی کریم ﷺ کی پہلی جنگ قریش مکہ سے ہوئی جس میں قریش مغلوب ہوئے۔

اَذِلَّةٌ۔ ذلیل کی جمع ہے اور ذُلّ نقیض عز ہے اور ذُلّ کے معنی رفق اور مرحمت بھی آتے ہیں۔ (ل) اور دوسری جگہ ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ [المآئدۃ: 5:54] ''مومنوں کے سامنے نرم۔'' میں یہی مراد ہے اور یہاں اَذِلَّةٌ کا لفظ محض ان کی تعداد کی قلت کو ظاہر کرنے کے لیے بولا گیا ہے۔ بدر میں مسلمانوں کو اَذِلَّةٌ اس لحاظ سے کہا ہے کہ وہ بسبب اپنی قلت تعداد کے غالب آنے کے قابل نہ تھے بلکہ بظاہر مغلوب کی حیثیت میں تھے اور ذُلّ کے معنی مقابلہ سے عاجز ہونا بھی ہیں۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

جب تو مومنوں سے کہتا تھا کہ کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے؟

بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

ہاں! اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو اور وہ اپنے پورے جوش میں تم پر حملہ کریں تمہارا رب پانچ ہزار (دشمن کو) تباہ کرنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔(511)

اوپر کی آیت میں دو گروہوں کی کمزوری کے خیال کا ذکر کیا تھا۔ تو اب ان کی ہمت بندھاتا ہے کہ اگر یہاں تم تھوڑے ہو تو یہی حالت تمہاری بدر میں بھی تھی کہ وہاں بھی تم قلیل تھے۔ بلکہ سامان جنگ کے لحاظ سے تو بالکل مقابلہ کے قابل ہی نہ تھے۔ پھر جب وہاں اللہ تعالیٰ نے تمہیں مدد دی تو کیا اب نہ دے گا۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ اللہ کا تقویٰ کرو تا کہ تم شکر کرنے والے بنو۔ مومن تو پہلے شکر گزار تھے۔ پھر یہاں تقویٰ کرنے کا نتیجہ شکر گزار بننے سے کیا مراد ہے؟ اللہ تعالیٰ جب انسان کو کوئی نئی نعمت عطا فرماتا ہے تو اس کے لیے ایک نئی شکر گزاری کا موقع ہوتا ہے۔ پس شکر گزار بننے میں اس نئی نعمت کی طرف اشارہ ہے یعنی جیسا پہلے تمہیں نصرت ملی تو اس نعمت کی وجہ سے ایک شکر گزاری کا موقع ملا۔ اسی طرح اگر اب بھی تقویٰ اختیار کرو تو پھر تمہیں نصرت عطا ہوگی اور اس نعمت کی وجہ سے شکر گزاری کا موقع ملے گا۔

511- فَوْرِ۔ فَوْرٌ شدت جوش کا نام ہے اور اس کا استعمال آگ کے متعلق ہوتا ہے جب وہ بھڑکے اور ہانڈی کے متعلق (جب وہ ابلے) اور غضب کے متعلق (جب اس میں سخت جوش پیدا ہو)۔ (غ) نَارَ جَهَنَّمَ کے متعلق آتا ہے: ﴿وَّ هِيَ تَفُوْرُ﴾ [الملك: 7:67] ''اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔'' [فَعَلْتُ كَذَا مِنْ فَوْرِيْ] سے مراد ہے ایسا کام جوش کی حالت میں کیا۔ (غ) [فَارَ الشَّيْءُ فَوْرًا .... جَاشَ] یعنی فور کے معنی جوش میں آنا ہیں۔ (ل) اور اسی سے بطور استعارہ فور کے معنی فی الحال بھی ہیں اور یہی لفظ ہماری زبان میں فوراً استعمال ہوتا ہے لیکن اصل معنی جوش اور غلیان ہی ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔

مُسَوِّمِيْنَ۔ اصل اس کا سَوْمٌ ہے جس کے معنی میں امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کا اصل کسی چیز کی تلاش میں جانا ہے مگر پھر اس کا استعمال اس مرکب معنی کے دونوں اجزا پر الگ الگ ہوا ہے یعنی صرف ذِهَابٌ (جانا) اور صرف اِبْتِغَاءٌ (تلاش کرنا) اور لسان العرب میں ہے کہ **سَامَ چار معنی میں آتا ہے**۔ چرنے کے لیے چھوڑا اور طلب کیا اور بیچا اور عذاب دیا۔ اور یہاں مُسَوِّمٌ میں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ یعنی عذاب دینے والے اور اسی کے مطابق [سَوَّمْتُ عَلَى الْقَوْمِ] آتا ہے۔ [اِذَا اَغَرْتَ عَلَيْهِمْ فَعِثْتَ فِيْهِم] (ل) یعنی ان پر گھوڑے کو دوڑایا اور ان میں تباہی ڈالی۔ پس مُسَوِّمِيْنَ

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰی لَكُمۡ وَ اور اللہ نے اسے صرف تمہارے لیے خوش خبری ٹھہرایا اور

سے مراد ہے تباہی ڈالنے والے یا عذاب دینے والے اور عام طور پر نشان لگانے والے معنی کیے گئے ہیں۔

ان دو آیات میں سے پہلی آیت میں تین ہزار فرشتوں کے نزول کا ذکر ہے اور دوسری میں پانچ ہزار کا۔ بعض مفسرین نے یہ کوشش کی ہے کہ ان تمام کو جنگ بدر کے متعلق ہی لگایا جائے۔ حالانکہ سورۃ انفال میں صراحت سے فرمایا: ﴿اَنِّیۡ مُمِدُّكُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُرۡدِفِيۡنَ﴾ [الأنفال: 9:8] ''میں ایک ہزار آگے چلنے والے فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں۔'' یعنی جنگ بدر میں کھلے طور پر ایک ہزار ملائکہ کی امداد کا ذکر ہے اور یہاں تین ہزار فرشتوں کی امداد کا ذکر ہے اس لیے یہ واقعہ بدر کے متعلق نہیں۔ علاوہ ازیں یہاں اِذۡ کے ساتھ بار بار جنگ اُحد کے واقعات کی طرف ہی توجہ دلائی ہے۔ ﴿وَ اِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ﴾ ﴿اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ﴾ اور یہاں تیسری مرتبہ اِذۡ تَقُوۡلُ فرمایا۔ پھر اسی سورت میں دوسری جگہ یہ بھی فرمایا: ﴿وَ لَقَدۡ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ اِذۡ تَحُسُّوۡنَهُمۡ بِاِذۡنِهٖ﴾ [آل عمران: 152:3] ''اللہ نے یقیناً اپنا وعدہ تم سے سچا کر دکھایا جب تم اس کے اذن سے اُن کو کاٹ رہے تھے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی وعدہ نصرت کا بھی اس جنگ کے متعلق تھا۔ اور وہ وعدہ صرف انہی الفاظ میں ہے: ﴿اَلَنۡ يَّكۡفِيَكُمۡ اَنۡ يُّمِدَّكُمۡ رَبُّكُمۡ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُنۡزَلِيۡنَ﴾ اور بالآخر یہ بات قابل غور ہے کہ جہاں بدر میں ایک ہزار دشمن ہے تو ایک ہزار ملائکہ کی نصرت کا ذکر ہے اور چونکہ احد میں تین ہزار دشمن ہے اس لیے تین ہزار ملائکہ کا تعلق اسی جنگ سے قرین قیاس ہے۔

اس کے بعد جو دوسری آیت میں پانچ ہزار ملائکہ کی آمد کا ذکر ہے وہ ایک تیسری جنگ کے متعلق ہے بدر اور احد کے متعلق نہیں اور وہ جنگ احزاب ہے جس کا ذکر یہاں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ﴿وَ يَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا﴾ اپنے پورے جوش میں تم پر ٹوٹ پڑیں۔ اور جہاں جنگ احزاب کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے وہاں بھی اسی قسم کا نقشہ کھینچا ہے: ﴿اِذۡ جَآءُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ وَ مِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ وَ اِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ وَ بَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوۡنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوۡنَا ۝ هُنَالِكَ ابۡتُلِىَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ زُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِيۡدًا ۝﴾ [الأحزاب: 33:10-11] ''جب وہ تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے تم پر آ گئے اور جب آنکھوں میں اندھیرا آ گیا اور دل (دہشت سے گویا) گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ پر مختلف قسم کے ظن کرنے لگے۔ وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت مصائب میں ڈالے گئے۔'' یہ نقشہ صریحاً وہی دشمن کے جوش میں ٹوٹ پڑنے کا نقشہ ہے اور اس جنگ میں دس ہزار یا بعض اقوال میں چوبیس ہزار فوج کے ساتھ دشمن آیا تھا۔ کیونکہ قریش نے دوسری قوموں کو بھی اکسا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ قریش خود بمشکل کوئی پانچ ہزار کے قریب ہی ہوں گے اور اصل دشمن وہی تھے۔

تین ہی بڑی جنگیں تھیں جن میں دشمن یعنی کفار قریش مسلمانوں پر چڑھ کر آئے۔ جنگ بدر، جنگ احد، جنگ احزاب۔ ان تینوں لڑائیوں میں مسلمانوں کی تعداد کفار کی تعداد کے مقابل کچھ نسبت نہ رکھتی تھی۔ تینوں جنگوں کی غرض مسلمانوں اور اسلام کا استیصال تھا۔ تینوں میں کفار اپنے مقصد میں ناکام ہو کر واپس ہوئے اور تینوں کے متعلق ہی نزول ملائکہ کا ذکر بھی ہے اور دشمن کی تعداد سے خاص نسبت رکھتا ہے۔ جنگ احزاب کے بعد پھر دشمن کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد

لِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُكُمۡ بِهٖ‌ؕ وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ۙ﴿۱۲۶﴾

تا کہ تمہارے دل اس سے اطمینان پکڑیں اور مدد تو اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہی ہے۔ (512)

چڑھائی ہوئی وہ آنحضرت ﷺ کا دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہونا تھا اور اس موقعہ پر کفار کو مقابلہ کی جرأت مطلق نہ ہوئی۔ اب دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کو دو قسم کا وعدہ دیا گیا تھا جس کے متعلق وہ بار بار مطالبہ بھی کرتے تھے: ﴿هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ اَمۡرُ رَبِّكَ﴾ [النحل: 33:16] کیا وہ اس امر کا انتظار کرتے ہیں کہ فرشتے ان پر آئیں یا تیرے رب کا امر ہی آ جائے؟ سو اللہ تعالیٰ نے ان تینوں جنگوں میں جہاں کفار کی چڑھائی مسلمانوں پر تھی ملائکہ کے ساتھ مسلمانوں کی نصرت فرمائی اور کفار کو سزا دی اور ان کو اپنے ارادوں میں ناکام رکھا اور فتح مکہ میں گویا امر رب ہی آ گیا۔ کیونکہ اسلام کی حکومت قائم ہوگئی اور نبی ﷺ کی یہ چڑھائی ایسی پرشوکت تھی کہ وہ کفار جو ہزارہا کا لشکر لے کر مٹھی بھر مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے جایا کرتے تھے اب ان میں اتنی بھی ہمت اور جرأت نہ رہی کہ آنحضرت ﷺ کے دس ہزار قدوسیوں کے مقابلہ میں میدان میں بھی نکل سکیں اور امر رب کا مقابلہ کر کون سکتا تھا۔ پس ملائکہ کے نزول میں گویا درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا ہے جس کا مطالبہ بار بار کفار کی طرف سے ہوتا تھا۔

یہ نزول ملائکہ کوئی فرضی بات نہ تھی بلکہ ایک حقیقت تھی ورنہ یہ ناممکن تھا کہ معدودے چند مسلمان اس قدر فوجوں کا مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتے۔ غور کا مقام ہے کہ ایک آدھ میدان میں اگر تھوڑے بہتوں پر غالب آ جائیں تو اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ گو وہاں بھی کوئی نہ کوئی وجوہ کامیابی کی ضرور ہونی چاہئیں۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ اول میدان بدر میں کفار کی جمعیت تگنی، میدان کا اچھا حصہ ان کے ہاتھ میں، پانی ان کے قبضہ میں، ان کی فوج میں تجربہ کار جنگی جوان بالمقابل مسلمانوں میں بچے اور بوڑھے شامل، ہتھیار ندارد، میدان کی مشکلات، پھر بھی کفار سخت نقصان اٹھاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ پھر میدان اُحد میں بجائے تگنے کے اب کفار کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہے۔ سواروں کی ایک بڑی جمعیت ان کی فوج میں ہے۔ خالد جیسے بہادر بھی ساتھ ہیں مگر پھر بھی کفار خالی ہاتھ اور ناکام واپس جاتے ہیں۔ جنگ احزاب میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے دس گنی، علاوہ ازیں اندر یہودی دشمن، منافق جاسوسوں کا کام کرنے والے موجود، مگر وہاں بھی خدا نے اس بڑی فوج کو ناکام اور نامراد کر کے واپس پھیرا اور وہ سخت پریشانی کی حالت میں بھاگے۔ یہ نزول ملائکہ کا ہی نتیجہ تھا۔

512- یہاں فرمایا کہ نزول ملائکہ کے وعدہ کو اللہ تعالیٰ نے صرف تمہارے لیے بشارت ٹھہرایا اور تا کہ تمہارے دل اس کے ساتھ مطمئن ہو جائیں۔ اسی طرح سورہ انفال میں فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰى وَلِتَطۡمَئِنَّ بِهٖ قُلُوۡبُكُمۡ﴾ [الأنفال: 10:8] ''اور اللہ نے اسے صرف ایک خوشخبری ٹھہرایا اور تا کہ اس کے ساتھ تمہارے دلوں کو اطمینان ہو۔'' اور وہاں آگے چل کر فرمایا: ﴿اِذۡ يُوۡحِىۡ رَبُّكَ اِلَى الۡمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىۡ مَعَكُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا‌ؕ سَاُلۡقِىۡ فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا الرُّعۡبَ﴾ [الأنفال: 12:8] جب تیرا رب ملائکہ کو وحی کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو ان لوگوں کو جو ایمان لائے ثابت قدم رکھو۔ میں ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا رعب ڈالوں گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ مومنوں کو ثابت قدم کرتا

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

تا کہ ان لوگوں سے جو کافر ہوئے ایک حصہ کو کاٹ دے یا ان کو ذلیل کر کے لوٹا دے سو وہ نامراد واپس جائیں۔(513)

اور کفار کے دلوں میں رعب ڈالتا ہے اور شاید یہی وجہ ہو کہ ملائکہ کی تعداد کو کفار کی جمعیت سے ہر میدان میں ایک خاص نسبت نظر آتی ہے۔

ملائکہ نے قتال نہیں کیا:

اگر ملائکہ کا نزول ہوا تو کیا انہوں نے انسانوں کی شکل میں ہو کر جنگ بھی کی؟ جس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو نازل کیا وہ تو خود ہی بتا دی ہے۔ اور حق یہی ہے کہ ملائکہ کا تعلق قلوب سے ہوتا ہے۔ پس مومنوں کو اطمینان قلب عطا کرنا اور کفار کے دل میں رعب ڈالنا یہ وہ غرض تھی جس کے لیے قرآن کریم کی تصریح کے مطابق ملائکہ کا نزول ہوا۔ بعض مفسرین نے بھی اسی کے مطابق لکھا ہے۔ چنانچہ غرائب القرآن میں یہ قول مذکور ہے: [وَمِنْهُمْ مَنْ قَالَ اِنَّ نَصْرَ الْمَلَائِكَةَ بِالْقَاءِ الرُّعْبِ فِيْ قُلُوْبِ الْكُفَّارِ وَبِاِشْعَارِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ النَّصْرَ لَهُمْ] یعنی بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی نصرت کافروں کے قلوب میں القائے رعب تھی اور مومنوں کو یہ علم دینے کے لیے کہ نصرت ان کے لیے ہے۔ یہ جنگ بدر اور جنگ اُحد دونوں کے متعلق ہے اور جنگ اُحد کے متعلق تو قریباً قریباً اتفاق ہے کہ وہاں ملائکہ نے قتال نہیں کیا۔ چنانچہ امام مجاہد کا قول منقول ہے: [عَنْ مُجَاهِدٍ اَنَّهُ قَالَ حَضْرَتِ الْمَلَائِكَةُ يَوْمَ اُحَدٍ وَلٰكِنَّهُمْ لَمْ يُقَاتِلُوْا] یعنی آپ نے فرمایا کہ فرشتے احد کے دن موجود تھے لیکن انہوں نے جنگ نہیں کی۔ ایسا ہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: [عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهُ قَالَ لَمْ تُقَاتِلِ الْمَلَائِكَةُ سِوَى يَوْمِ بَدْرٍ وَفِيْهَا سِوَاءٌ كَانُوْا عَدَدًا وَمَدَدًا لَا يُقَاتِلُوْنَ وَلَا يَضْرِبُوْنَ] (تفسیر الرازی: جلد1، صفحہ 1246) یعنی سوائے بدر کے دن کے ملائکہ نے جنگ نہیں کی اور اس کے سوائے جہاں وہ آئے وہ تعداد اور مدد دینے کے لیے تھے۔ انہوں نے قتال نہیں کیا اور نہ کسی کو مارا۔ بدر کے دن ملائکہ کے قتال کرنے یا نہ کرنے پر بحث سورہ انفال میں ہوگی۔

513- يَقْطَعَ۔ قَطَعَ کے اصل معنی کاٹنا ہیں مگر ہلاک کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مفردات میں ہے: [لِيَقْطَعَ طَرَفًا اَيْ لِيَهْلِكَ جَمَاعَةً مِّنْهُمْ] یعنی ان میں سے ایک جماعت کو ہلاک کر دے۔

طَرَفًا۔ کسی چیز کی طَرَف سے مراد اس کی ایک جانب ہے اور اس کا استعمال اجسام میں، اوقات اور اس کے سوائے بھی ہوتا ہے۔ (غ) ﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا﴾ میں مراد ایک حصہ یا ایک جماعت ہے۔ جیسا اوپر ذکر ہوا اور امام راغب کہتے ہیں کہ طَرَف کی تخصیص اس لیے کی کہ کسی چیز کی طرف یا ایک جانب کے کم کرنے سے اس کی توہین اور اس کے نابود کرنے کی طرف پہنچا جاتا ہے۔

يَكْبِتَ۔ كَبَتَ سختی کے ساتھ اور ذلیل کر کے رد کر دینا ہے۔ (غ) اور لسان العرب میں ہے: [اَلْكَبْتُ الصَّرْفِ وَالْاِذْلَالِ] یعنی كَبَتَ کے معنی پھیر دینا اور ذلیل کرنا ہے۔ پس [كَبَتَ اللّٰهُ الْعَدُوَّ] کے معنی ہیں [صَرَّفَهُ وَ اَذَلَّهُ]

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

اس کام میں تیرا کچھ (دخل) نہیں خواہ وہ ان پر رحمت سے لوٹے یا انہیں عذاب دے کہ وہ ظالم ہیں۔ (514)

(ل) اسے واپس پھیر دیا اور ذلیل کیا اور کَبَتَ کسی چیز کے منہ کے بل گرا دینے کو بھی کہتے ہیں۔

خَآئِبِيْنَ۔ [خَابَ، لَمْ يَنَلْ مَا طَلَبَ] (ل) خَابَ کے معنی ہیں جو کچھ طلب کیا تھا وہ نہ پایا یعنی حصول مقصد میں ناکام ہوا اور خَيْبَةٌ، ظَفَرَ کا نقیض ہے پس جو خائب ہو وہ مظفر نہیں کہلا سکتا۔

اُحد میں کفار کی ناکامی:

جنگ اُحد میں نصرت الٰہی کی دو اغراض بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی ایک جماعت کو ہلاک کر دے اور دوسرا یہ کہ ان کو سختی اور ذلت سے لوٹا دے اور وہ بلا نیل و مرام اور بلا حصول مقصد واپس جائیں۔ چنانچہ یہ دونوں باتیں اسی طرح وقوع میں آئیں۔ ابتدائے جنگ میں مسلمانوں نے کفار کے ایک حصہ کو ہلاک کیا اور بہتوں کو زخمی کیا اور آخر کار بھی وہ ذلیل ہو کر لوٹے اور جس غرض کو مدنظر رکھ کر آئے تھے اسے حاصل کیے بغیر واپس ہوئے اور یوں یہ آیت اس بات پر قطعی دلیل ہے کہ جنگ اُحد میں کفار کو فتح نہیں ہوئی بلکہ قرآن کریم نے انہیں نامراد قرار دیا ہے۔ کفار کا حملہ اس غرض سے تھا کہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں اور اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی اس غرض کو حاصل کیے بغیر واپس ہوئے، اور یہ ان کے لیے بڑی ذلت تھی۔ مسلمانوں کا لشکر اسی طرح میدان جنگ میں موجود تھا اس لیے وہ مدینہ پر حملہ آور نہیں ہو سکے اور وہ مسلمانوں کا ایک برائے نام قیدی بھی پکڑ کر نہ لے گئے۔ پس ایک طرف قرآن کریم اور دوسری طرف واقعات قریش کے لشکر کو ناکام ٹھہراتے ہیں۔

514- ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ اسی سورت میں آگے آتا ہے: ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ [154] اگر ہمارا بھی معاملہ میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ یہی معنی یہاں ہیں۔ یعنی تیرا اس معاملہ میں کچھ دخل نہیں۔ اور وہ امر یا معاملہ کیا ہے۔ کفار کی سزا یا ان پر رجوع برحمت کرنا یعنی یہ معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے اور کسی انسان کا خواہ وہ نبی ہی ہو اس میں کچھ دخل نہیں۔

آنحضرت ﷺ کا بددعا کرنا:

بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: [شُجَّ النَّبِيُّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ فَقَالَ: "كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ شَجُّوا نَبِيَّهُمْ"؟ فَنَزَلَتْ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ] (صحيح البخاري، المغازي، باب قوله: ليس لك من الأمر...) یعنی اُحد کے دن نبی کریم ﷺ کے سر میں زخم آیا تو آپ نے فرمایا: ''کس طرح وہ قوم کامیاب ہوگی جنہوں نے اپنے نبی کو زخمی کیا؟'' تو یہ آیت ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ نازل ہوئی۔ لیکن سالم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ جب آپ فجر کی نماز میں دوسری رکعت میں رکوع سے اٹھتے تو سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کہنے کے بعد کہتے [اَللّٰهُمَّ الْعَنْ

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع 13 9 4

اور اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فُلَانًا وَفُلَانًا وَفُلَانًا] ''اے اللہ فلاں فلاں فلاں پر لعنت کر۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری [لَيْسَ لَكَ مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ] اور دوسری روایت میں سالم نے ہی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بجائے [اَللّٰهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا] کے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ آپ صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو اور حارث بن ہشام پر بددعا کیا کرتے تھے تو یہ آیت اتری۔ یہ غزوۂ احد کے ذکر میں ہے اور اسی کے قریب قریب نسائی میں بھی روایت ہے اور غزوۂ احد میں علاوہ اس کے کہ بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور نبی کریم ﷺ کو زخم پہنچے۔ کفار نے مسلمانوں کی لاشوں کی بھی بے حرمتی کی اور ان کا مثلہ کیا اور یہ واقعات ایسے دردناک تھے کہ ان پر ظالموں کی سزا کی خواہش بالکل حق بجانب تھی۔ لیکن ایک دوسری روایت کی بنا پر بعض مفسروں نے اس آیت کا نزول <u>غزوہ بئر معونہ</u> کے واقعہ کے متعلق بیان کیا اور وہ واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ستر قاریوں کو ایک سردار قوم کی درخواست پر اس قوم کی تعلیم کے لیے بھیجا تو جب یہ رستہ میں ہی تھے تو ایک کنویں کے پاس جس کا نام بئر معونہ ہے اس قوم کے چند قبیلوں نے غداری سے ان سب کو قتل کر دیا اور یہ قبائل رعل اور ذکوان اور عصیہ اور بنی لحیان تھے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ایک مہینہ قنوت میں جو آپ نماز صبح کی دوسری رکعت میں بعد رکوع پڑھتے تھے ان پر بددعا کی اور بخاری نے کتاب التفسیر میں جو حدیث ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے اس میں یہ لفظ آتے ہیں: [وَكَانَ يَقُولُ فِي بَعْضِ صَلَاتِهِ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ: "اَللّٰهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وَفُلَانًا". لِأَحْيَاءٍ مِّنَ الْعَرَبِ، حَتَّى أَنْزَلَ اللّٰهُ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (لَيْسَ لَكَ مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ): 4560) یعنی آپ نماز فجر کے کسی حصہ میں کہا کرتے تھے اے اللہ فلاں فلاں پر لعنت کر۔ عرب کے کچھ قبیلوں کا نام لے کر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ تو اس حدیث کی رو سے آیت کا نزول واقعہ بئر معونہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر یہ درحقیقت اختلاف نہیں اور دونوں روایتیں درست ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے کہ بئر معونہ کا واقعہ اور جنگ اُحد کا واقعہ بالکل قریب قریب ہیں اور ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جنگ اُحد کے صرف چار ماہ بعد غزوہ بئر معونہ ہوا۔ تو اس لیے یہ واقعہ جنگ اُحد کا واقعہ ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور غالباً دونوں پر نبی کریم ﷺ نے اکٹھی بددعا کی ہے اور امام احمد نے جو روایت سالم بن عبداللہ سے کی ہے تو اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ ان دونوں بددعاؤں کو اکٹھا کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں: [قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: "اَللّٰهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وَفُلَانًا اَللّٰهُمَّ الْعَنِ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ اَللّٰهُمَّ الْعَنْ سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو اَللّٰهُمَّ الْعَنْ صَفْوَانَ بْنَ أُمَيَّةَ". قَالَ فَنَزَلَتْ هَذِهِ الآيَةُ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ] (جامع الترمذي، كتاب تفسير القرآن، باب سورة آل عمران: 3004؛ مسند أحمد: جلد9، صفحہ 486) یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ ''اے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰٓوا اے لوگو! جو ایمان لائے ہو بڑھا بڑھا کر سود نہ کھاؤ

اللہ! فلاں پر لعنت کر، فلاں پر لعنت کر۔ اے اللہ! حارث بن ہشام پر لعنت کر۔ اے اللہ! سہیل بن عمرو پر لعنت کر۔ اے اللہ! صفوان بن امیہ پر لعنت کر۔ پس یہ آیت نازل ہوئی ﴿لَيۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ﴾۔ اب اس میں فلاں اور فلاں کا ذکر الگ بھی ہے اور اس سے مراد وہی قبائل عرب ہیں جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ لفظ فلاں فلاں کی تشریح میں موجود بھی ہیں یعنی رعل اور ذکوان وغیرہ اور سرداران قریش کا ذکر الگ ہے۔ تو پس اگر سالم بن عبداللہ کی دونوں روایتوں کو جو بخاری میں ہیں اکٹھا کیا جائے جن میں سے ایک میں لفظ فلاں وفلاں ہیں اور دوسری میں حارث بن ہشام وغیرہ کے نام ہیں تو وہ روایت بالکل صحیح ٹھہرے گی جس کو امام احمد نے بیان کیا ہے۔ اور اس طرح پر معلوم ہوگا کہ درحقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف اُحد کی تکلیفیں اٹھا کر اور دوسری طرف اپنے ستر قاریوں کے دھوکے سے قتل کیا جانے پر دونوں قوموں پر اکٹھی بددعا کی اور تیس دن تک آپ کے بددعا کرنے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی جس میں آپ کو اس بددعا سے روکا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بددعا سے روکنے میں سبق:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجود اس قدر خطرناک مصائب اعداء کے ہاتھ سے پیش آنے کے بددعا سے روکا جانے میں یہ سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں کیا کہ آپ کا وجود رحمۃ للعالمین کسی پر بددعا بھی کرے۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ تینوں شخص جن پر آپ نے بددعا کی بعد میں مسلمان بھی ہو گئے۔ ایسا ہی وہ قبائل بھی مسلمان ہو گئے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو بات بات میں اپنے مسلمان بھائیوں پر لعنت کرتے اور ان کو بددعاؤں کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ بلکہ بددعائیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کے خلاف ہے۔

یہ سوال کیا جائے گا کہ تیس دن تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں بددعا کرتے رہے؟ سو وہ واقعات جن پر آپ نے بددعا کی ہے ایسے دلخراش ہیں کہ ایک شخص جو مخلوق الٰہی پر رحم کرے یہی خیال کرے گا کہ ایسے ظالموں کا وجود دنیا سے مٹ جائے۔ پس ایسے ظالموں کے لیے بددعا کرنا بالکل حق تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دوسرے پہلو کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو توجہ دلائی ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کر کے ایسے لوگوں پر بھی رجوع برحمت کر سکتا ہے۔ پس گو بددعا کرنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہوں مگر یہ درحقیقت آپ کا کام نہ تھا۔ جس طرح اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہل مکہ کو جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا فتح مکہ پر قتل کر دیتے تو آپ حق بجانب ہوتے۔ مگر آپ نے افضل طریق کو اختیار کیا اور سب کو معاف کر دیا بلکہ ان پر ملامت تک نہ کی۔ اسی طرح بتقاضائے بشریت آپ نے بددعا کی اور اس بددعا میں کوئی ناانصافی نہ تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک افضل مقام کی طرف توجہ دلائی۔ اور اب ہم مسلمانوں کے لیے وہی طریق مناسب ہے جس پر چلنے کی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہدایت کی۔

رحمت کا غضب پر سبقت لے جانا:

اس آیت میں رجوع برحمت کرنے کو عذاب پر مقدم کیا ہے (حالانکہ ﴿فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ﴾ میں صاف بتا دیا ہے کہ مستحق تو بے

اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۚ﴿۱۳۰﴾ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (515)

شک یہ عذاب کے ہیں) اور اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور عذاب کے ذکر میں مغفرت کو عذاب پر مقدم کیا اور اس طرح پر بتا دیا ہے کہ مغفرت اور رحمت کا جوش کس قدر وسیع ہے اور رحمت غضب پر سبقت لے گئی ہے پھر اس آیت کا خاتمہ تو ﴿فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ﴾ پر کیا یعنی لوگوں کی حالت کیسی ہے اور اگلی آیت کا خاتمہ ﴿وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴾ پر کیا یعنی اس کی صفات کا تقاضا غفور رحم ہے گو انسان ظلم ہی کرے۔

515- ﴿اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ اَضۡعَافٌ۔ ضِعۡفٌ کی جمع ہے [نمبر: 314] اور ﴿اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ رِبوٰ سے حال واقع ہوا ہے۔ عرب میں یہ دستور تھا اور ایسا ہی دستور قریباً تمام سود خواروں میں ہے کہ جب قرضہ کی میعاد پوری ہو جاتی اور قرضہ ادا نہ ہوتا تو سود کو اصل رقم میں بڑھا کر پھر از سر نو اس پر سود لگایا جاتا اور یوں تھوڑی مدت میں مدیون کی ناداری سے ایک چھوٹی سی رقم بڑی بھاری رقم بن جاتی۔ اور مطلب یہ نہیں کہ صرف کئی گنا کر کے سود مت کھاؤ اور تھوڑا کھا لو بلکہ مراد تو بیخ کنی ہے۔ یعنی سود کی تو حالت یہی ہے کہ وہ کئی کئی گنا بن جاتا ہے پس تم سود مت کھاؤ۔

حرمت سود جنگوں کے روکنے میں معاون ہے:

چونکہ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو اپنی کسی غلطی کی وجہ سے بہت سی تکلیف اٹھانی پڑی اس لیے اسی جنگ کے ذکر میں اب اس رکوع میں یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کو کن راہوں پر چلنا چاہیے اور ان کی کامیابی کی اصل راہیں کیا ہیں۔ سب سے پہلی آیت میں حرمت سود کا ذکر ہے۔ تعلق یہ ہے کہ پہلے رکوع میں جنگ اُحد کا ذکر تھا اور اسی اثنا میں اہل اسلام کی نصرت اور کفار کے کاٹنے کا ذکر کیا تو اب ایک ایسے امر کی طرف توجہ دلاتا ہے جس پر عموماً دنیا نے جنگوں کی کامیابی کا دارومدار رکھا ہے اور وہ سود ہے۔ اور یہ صرف آج کی بات ہی نہیں کہ سود کے روپے کے ساتھ جنگوں کو جاری رکھا جاتا ہے اور جس قدر کوئی قوم زیادہ سودی روپیہ لے سکتی ہے اسی پر اس کی جنگ میں کامیابی کا دارومدار ہے۔ بلکہ عرب میں بھی جنگوں کا انحصار بہت کچھ سود پر تھا۔ کیونکہ یہ لوگ جو روپیہ جنگوں پر خرچ کرتے تھے وہ عموماً سود اور جوئے کی کمائی کا روپیہ ہوتا تھا۔ اسی لیے سورہ بقرہ میں جنگوں کے ذکر میں شراب اور جوئے سے منع کیا تھا۔ تو اب جنگ کے ہی ذکر میں سود سے روکا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ [اِنَّ اَكۡثَرَ اَمۡوَالَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ كَانَتۡ قَدِ اجۡتَمَعَتۡ مِنَ الرِّبَا وَكَانُوۡا يُنۡفِقُوۡنَ تِلۡكَ الۡاَمۡوَالِ عَلَى الۡعَسَاكِرِ] (تفسیر غرائب القرآن) یعنی اکثر مال مشرکوں کے سود سے جمع ہوتے تھے اور یہی جمع شدہ مال وہ لشکروں پر خرچ کرتے تھے۔ اسلام نے جہاں ایک طرف ضرورتِ جنگ کو تسلیم کیا ہے اور ان حالات میں جب ایک قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہو اسے ضروری قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ان تمام موجبات کو جو جنگ کے بلا ضرورت جاری رکھنے کا موجب ہو سکتے ہیں دور یا کم کرنا چاہا ہے۔ اب سود پر روپیہ ملتا جانے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو اشخاص برسر حکومت ہوں وہ بلا ضرورت اور

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ۚ﴿۱۳۱﴾ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۚ﴿۱۳۲﴾ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔(516)

بغیر قوم کی خواہش کے جنگ کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اگر سود کو اڑا دیا جائے تو ہر قوم صرف اس حد تک جنگ جاری رکھ سکے گی جب تک اس کی اپنی ہستی معرض خطر میں ہو اور اس حال میں قوم کا ہر ایک بہی خواہ اپنے مال اور اپنی طاقت کو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے پر لگائے گا۔ لیکن اگر قوم اپنے آپ کو ایسا معرض خطر میں نہیں سمجھتی اور اپنی طاقت اور مال کو جنگ پر لگانے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ جنگ کو بھی محض سود سے روپیہ حاصل کرنے کا اور دوسری قوموں کو سودی روپیہ دے کر اپنے نیچے دبا کر رکھنے کا ایک ذریعہ بنانا چاہتی ہے، تو یہ جنگ بلا ضرورت ہے۔ اگر ہمدردی انسانی جنگ کی محرک ہے تو روپیہ اور طاقت اس پر بلا معاوضہ خرچ ہونا چاہیے۔ سود پر روپیہ دینا کسی ہمدردی انسانی کے باعث نہیں ہوتا بلکہ روپیہ کمانے کی غرض سے ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو سمجھایا جاتا کہ تمہاری جنگوں کا صرف ایک ہی موجب ہوسکتا ہے بقائے قوم یا قیامِ امن کی ضرورت۔ سو اس ضرورت پر بتقاضائے ہمدردی انسانی اپنے مال اور طاقت کو لگاؤ اور یہ نہ کرو کہ جنگوں کو روپیہ کمانے کا ذریعہ بنا کر بلا وجہ ان جنگوں کو طول دیتے جاؤ۔

حرمت سود کے دو موقعوں پر ذکر کرنے میں ایک بہ تعلق صدقات و انفاق اور دوسرے جنگوں کے تعلق میں ایک اور حکمت بھی معلوم ہوتی ہے۔ پہلی سورت میں اصل خطاب یہود سے تھا اور یہودیوں میں سود خواری نے بخل کا مرض پیدا کیا تھا کہ وہ خیراتی کاموں پر روپیہ لگانے میں بہت مضائقہ کرتے، اس لیے وہاں صدقات کا ذکر کرتے ہوئے سود سے روکا۔ اور اس سورت میں عیسائی بالخصوص مخاطب ہیں۔ اس لیے یہاں عین جنگ کے ذکر میں سود خواری سے روکا ہے۔ کیونکہ عیسائی قوم نے سود خواری سے بڑا فائدہ یہ اٹھانا تھا کہ اس کے ذریعہ سے بلا ضرورت جنگیں کر کے نسل انسانی کو تباہ کریں۔

516- **مسلمانوں کی کامیابی اللہ اور رسول کی اطاعت میں ہے:** اس آیت میں بتایا ہے کہ اصل کامیابی تمہاری یہ نہیں کہ تم جنگ کر کے بڑی فاتح قوم بن جاؤ بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر قائم رہو۔ مسلمانوں نے جنگیں کیں، بڑے فاتح بھی دنیا میں بنے، دنیا کے مالک بھی بنے مگر جب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت چھوڑ دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ترقی کے اوج سے قعر مذلت میں گرے۔ اب بھی اگر وہ دنیا میں اٹھ سکتے ہیں تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے نہ اپنی تجویز کردہ راہوں سے۔

رسول کی اطاعت شرک نہیں اور اللہ کی اطاعت میں داخل ہے:

اس زمانہ میں جب مسلمانوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی بجائے ﴿اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں

وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے،

پر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے علماء اور پیروں کے پیچھے لگ گئے تو ایک گروہ نے تفریط میں مبتلا ہو کر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے جوئے کو بھی پھینک دینا چاہا اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کے شامل کرنے کو بھی شرک قرار دیا [نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ]۔ انہوں نے شاید اطاعت اور عبادت کا مفہوم ایک لے لیا ہے۔ عبادت غیر اللہ کی خواہ نبی کی ہو بے شک شرک ہے لیکن اطاعت تو اولوالامر یعنی حکام کی بھی ہو سکتی ہے پھر نبی کی اطاعت شرک کیونکر ہو گئی۔ یہ کہنا کہ رسول اللہ کی اطاعت ان آیات کے خلاف ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ﴾ [الأنعام: 57:6] ''حکم اللہ ہی کا ہے۔ وہ حق بیان کرتا ہے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔'' ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ [يوسف: 40:12] ''حکم اللہ کے سوا اور کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔'' یعنی حکم صرف اللہ کے لیے ہی ہے اور ﴿لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾ [الكهف: 26:18] وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا صحیح نہیں۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ خود ہی یہ حکم دے کہ تم رسول کی اطاعت کرو تو پھر رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت میں داخل ہوئی اور وہ کوئی علیحدہ بات نہیں۔ جس طرح ایک بادشاہ جب بعض وزراء کے سپرد ایک کام کر دیتا ہے یا وزراء گورنروں کے سپرد ایک کام کر دیتے ہیں علیٰ ہذا تو ان گورنروں اور وزرا کے حکم کی اطاعت بادشاہ کے حکم کی اطاعت ہی ہے، سوائے اس صورت کے کہ وہ لوگ بادشاہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم جاری کریں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ [النسآء: 59:4] ''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحبان امر کی۔'' تو کیا اب اولی الامر کی اطاعت شرک میں داخل ہے اور نعوذ باللہ خدا نے خود ہی شرک کی تعلیم دی؟ نہیں بلکہ ان کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت ہی ہے۔ چونکہ اسی کے حکم کے ماتحت ہے اس کی اور مثالیں بھی ہیں ایک جگہ ہے: ﴿اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا﴾ [الأنعام: 114:6] کیا میں اللہ کے سوائے کوئی حکم چاہوں۔ دوسری جگہ ہے: ﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ [النسآء: 35:5] ایک حکم مرد کے اہل سے اور ایک عورت کے اہل سے مقرر کر لو۔ خدا بھی حکم اور یہ بھی حکم مگر چونکہ وہ خدا کے حکم کے ماتحت حکم ہیں اس لیے یہ شرک نہیں۔

اور ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ﴾ کی جو تاویل کی جاتی ہے کہ یہاں واؤ تفسیری ہے اور رسول کے معنی یہاں پیغام ہیں نہ پیغامبر۔ تو اس کے لیے کوئی دلیل چاہیے۔ لیکن نہ صرف دلیل اس کی تائید میں کوئی نہیں بلکہ کئی دلائل سے اس کا بطلان ہوتا ہے۔

اوّل: یہ کہ واؤ تفسیر کے لیے آیا کرتی ہے یہ دعویٰ بلا دلیل ہے جس کی کوئی سند عربی زبان میں نہیں۔ ہاں واؤ کا استعمال بعض وقت عطف علی المرادف کے لیے ہوتا ہے دیکھو مغنی اللبیب بیان واؤ۔ یعنی دو مرادف لفظ (ایسے لفظ جن کے معنی قریباً یکساں ہیں اور بہت باریک فرق ہے ایک دوسرے پر واؤ کے ذریعہ سے عطف ہو جاتے ہیں) جیسے: ﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ

اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ وہ متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (517)

اِلَى اللّٰهِ﴾ [یوسف: 86:12] ''میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت اللہ سے ہی کرتا ہوں۔'' میں بَثٌّ اور حَزَنٌ ایک دوسرے پر عطف ہیں مگر اللہ اور رسول کو آج تک کسی نے مرادف نہیں کہا کہ یہاں واؤ کا استعمال عطف علی المرادف کے طور پر لیا جائے۔

دوم: رسول کے بہرحال دو معنی ان تاویل کنندگان کو بھی مسلم ہیں ایک پیغامبر اور دوسرے پیغام۔ اور اللہ کے معنی ایک کے سوائے دوسرے آج تک کسی نے نہیں سنے۔ اور تفسیر مبہم یا ذو معنی لفظ کی واضح لفظ سے ہوا کرتی ہے نہ واضح لفظ کی مبہم سے۔ اب اللہ واضح ہے اس کی تفسیر ایسے لفظ سے جو دو معنی رکھتا ہے انسان بھی نہیں کرے گا۔ چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس بات کو منسوب کیا جائے۔

سوم: اگر واضح لفظ کی تفسیر کی ضرورت ہی تھی تو ایک دفعہ تفسیر کر دینا کافی تھا، بار بار اس تفسیر کی کیا ضرورت تھی؟

چہارم: گو لغت میں رسول کے معنی پیغام بر اور پیغام دونوں لکھے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے خود فیصلہ کر دیا جب فرمایا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ [الفتح: 29:48] ''محمد اللہ کا رسول ہے۔'' حالانکہ [اَلْقُرْاٰنُ رَسُوْلُ اللّٰهِ] کہیں نہیں فرمایا۔

پس جب قرآن شریف نے خود تصریح کر دی کہ رسول اللہ محمد ہیں تو اس معنی کو چھوڑ کر ہم دوسرے معنی کیوں اختیار کریں۔

517- ﴿عَرۡضُ﴾۔ عَرۡضٌ کے اصل معنی چوڑائی ہیں جو طول کے خلاف ہو اور اصل استعمال اس کا اجسام کے متعلق ہے۔ لیکن غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے: ﴿فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ﴾ [حم السجدة: 51:41] ''تو لمبی چوڑی دعا میں لگ جاتا ہے۔'' اور کہا گیا ہے کہ اس کے عرض سے مراد اس کی وسعت ہے مگر نہ بلحاظ مساحت کے بلکہ بلحاظ مسرت کے۔ (غ) اور اس کی مثال امام راغب نے یہ دی ہے کہ جیسا کہ اس کے خلاف کہہ دیا جاتا ہے: [اَلدُّنْيَا عَلٰى فُلَانٍ حَلْقَةُ خَاتِمٍ] دنیا فلاں پر ایک انگوٹھی کا حلقہ بن گئی۔ یا کہا جاتا ہے: [وُسْعَةُ هٰذَا الدَّارِ كَسَعَةِ الْاَرْضِ] اس گھر کی وسعت زمین کی وسعت کی طرح ہے۔ اور تیسرے معنی عرض کے امام راغب نے یہاں بدل اور عوض کیے ہیں یعنی اس کی قیمت زمین و آسمان ہیں۔

کیا پاک تعلیم ہے۔ کہاں جنگوں کا ذکر اور کہاں یہ ہدایات؟ کیا خوبی سے بتا دیا کہ جنگ کوئی اصل غرض نہیں **بلکہ اصل غرض اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا حاصل کرنا ہے۔** اس کو حاصل کرنے کے جو سامان مختلف کسی وقت میں ہوں گے ان کے حصول کے لیے جلدی کرنی چاہیے۔ اور چونکہ اوپر ذکر کیا تھا کہ نار کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے تو یہاں بتایا ہے کہ متقیوں کے لیے تو جنت تیار کی گئی ہے۔ پس اس کے حصول کے لیے جلدی قدم اٹھانا چاہیے اور جیسے کافر کے لیے آگ اور متقی کے لیے تو جنت آخرت میں ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں بھی کافر کے دل پر آگ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الۡكٰظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ وَ الۡعَافِيۡنَ عَنِ

جولوگ آسودگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں اور سخت غضب کو دبالینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور

وسعت جنت:

یہاں جنت کے متعلق فرمایا کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ اس سے کیا منشا ہے۔ بعض کے نزدیک آخرت کے آسمان اور زمین اور ہوں گے اس لیے مراد یہ ہے کہ جنت کی چوڑائی اس دنیا کے آسمان وزمین کے برابر ہوگی۔ اور اس پر ﴿يَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَيۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ﴾ [إبراهيم: 48:14] ''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی۔'' کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ (غ) اور بعض نے اس کے معنی قیمت کر لیے ہیں جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ اور بعض نے کہا کہ یہ کلام کنایہ ہے حد درجہ کی فراخی سے۔ (ر) گویا اتنی وسیع جنت ہوگی جو انسان کے وہم وگمان میں آسکتی ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل میں ایک حدیث ہے کہ ہرقل نے نبی کریم ﷺ کو لکھا تھا کہ آپ مجھے اس جنت کی طرف بلاتے ہیں جس کا عرض آسمان اور زمین ہیں تو پھر دوزخ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: [سُبْحَانَ اللهِ أَيْنَ اللَّيْلُ إِذَا جَاءَ النَّهَارُ] (مسند احمد، جلد33، صفحہ199، حدیث:16060) پاک ہے ذات اللہ تعالیٰ کی رات کہاں ہوتی ہے جب دن آجاتا ہے۔ اور ابن جریر میں بھی ایسی ہی روایت ہے اور ایک روایت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی جواب یہود کو دینا معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی جواب ایک اہل کتاب کو دیا۔ اور ایک روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے انہی الفاظ کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسا فرمایا تھا۔ (ث) پس اس قدر مختلف طریقوں سے یہ روایت آتی ہے کہ الفاظ قرآنی کی تفسیر میں مقدم اسی کو کرنا ہوگا۔

مکان جنت کی کیفیت اس عالم کی طرح نہیں:

اس مثال کی مفسرین نے عموماً یہ توجیہ کی ہے کہ جب ایک حصہ پر دن ہوتا ہے تو دوسرے حصہ پر رات ہوتی ہے۔ یہ تو صحیح ہے مگر اس صورت میں کوئی شخص یہ نہ کہے گا کہ دن سارے آسمان اور زمین پر محیط ہے۔ اصل یہ ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے جنت ونار کی وسعت کو سمجھانے کے لیے مکان کی بجائے کیفیت کی مثال دی ہے۔ کیونکہ دن اور رات یا نور وظلمت درحقیقت دو کیفیات ہیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ جنت ونار کی تمام چیزوں کی کیفیات وہ نہیں جو اس عالم کی ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِيَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡيُنٍ﴾ [السجدة: 17:32] ''پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔'' اور حدیث فرماتی ہے: [مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ] (صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، باب مَا جَاءَ فِي صِفَةِ الْجَنَّةِ وَأَنَّهَا مَخْلُوقَةٌ: 3244) تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم اس عالم کے مکان کے تصور کے ماتحت جنت ونار کو نہ لاؤ بلکہ اس کو سمجھانے کے لیے دو کیفیات روشنی اور تاریکی کی مثال دی ہے۔ اور جب ہم زیادہ غور کرتے ہیں تو حق یہی معلوم ہوتا ہے اس

النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۚ﴿۱۳۴﴾ اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (518)

لیے کہ قرآن کریم میں جو نقشہ جنت و نار کا کھینچا گیا ہے اس میں ایک طرف تو ان دونوں میں اس قدر بعد ہے کہ فرمایا: ﴿لَا يَسۡمَعُوۡنَ حَسِيۡسَهَا﴾ [الانبیاء: 102:21] اہل جنت تو دوزخ کی آہٹ کو بھی نہ سنیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں کہ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز کو نہ سنیں گے۔ بلکہ اصل غرض صرف اظہار بعد ہے اور دوزخ کا نظارہ آنکھ کے سامنے رہنا اس حقیقی راحت کے ساتھ کیونکر جمع ہوسکتا ہے جس کا اہل جنت کو حاصل ہونا قرآن کریم سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ دوسری طرف اہل جنت اور اہل نار باہم بات چیت بھی کرتے ہیں اور دوزخ والے جنتیوں سے پانی بھی مانگتے ہیں اور دیگر نعماء کا بھی سوال کرتے ہیں اور جنتی ان کو جواب بھی دیتے ہیں۔ پس وہ ایک دوسرے کی باتوں کو سنتے ہیں مگر اس خطرناک آگ کی آہٹ کو نہیں سنتے جس کی زفیر وشہیق کی دنیا میں کوئی نظیر ہی نہیں۔ پھر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں: ﴿فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ﴾ [الصافات: 55:37] ''سو اس نے جھانکا تو اس کو دوزخ کے درمیان دیکھا'' مگر آگ کی لپٹوں اور اس کی خطرناک اذیتوں کو نہیں دیکھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس عالم مکان کا وہ رنگ نہیں جو اُس عالم میں ہے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بعض کے نزدیک اتنی بڑی جنت جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے وہ ایک ایک شخص کے لیے ہوگی [وَ قِيۡلَ اَنَّ الۡجَنَّةَ الَّتِيۡ عَرۡضُهَا عَرۡضَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّمَا تَكُوۡنُ لِلرَّجُلِ الۡوَاحِدِ لِاَنَّ الۡاِنۡسَانَ اِنَّمَا يَرۡغَبُ فِيۡمَا يَصِيۡرُ مِلۡكًا لَهُ.] (غق) اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک شخص کی جنت اس قدر وسیع ہے کہ سارے آسمانوں اور زمین پر محیط ہوگی۔ لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے دخل سے محفوظ ہوگی۔ کیونکہ خاص اسی کی ملک ہوگی جس طرح ہر ایک شخص اللہ تعالیٰ کی پوری پوری مغفرت کو حاصل کرسکتا ہے مگر اس کا اسے حاصل کرنا دوسرے کے لیے مانع نہیں۔ اسی طرح ہر ایک شخص ساری جنت کو بھی حاصل کرسکتا ہے مگر اس کا اس کو حاصل کرلینا دوسرے کے حاصل کرلینے سے مانع نہیں۔ اس کی مثالیں اس دنیا میں بھی ملتی ہیں جیسے مثلاً سورج ہم میں سے ہر ایک کا بھی ہے اور سب کا بھی ہے۔ جو فائدہ میں اس سے اٹھاتا ہوں وہ دوسرے کے لیے مانع نہیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ کچھ رنگ اس دنیا میں جنت و نار کا ہر ایک کو مل جاتا ہے۔ اس سے جو کچھ ہر ایک انسان خود سمجھ سکتا ہے وہ دوسرے کو الفاظ میں سمجھا نہیں سکتا۔

518- السَّرَّآء۔ الضَّرَّآء۔ سَرَّاءٌ سُرُوۡرٌ سے ہے (مادہ سَرَرٌ سے ہے) اور ضَرَّاءُ ضَرَرٌ سے ہے اور ضَرَّاءُ کے مقابلہ پر سَرَّاءُ بھی آتا ہے اور نَعۡمَاءُ بھی۔ پہلے کی مثال یہی ہے اور دوسرے کی مثال ہے ﴿وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰهُ نَعۡمَآءَ بَعۡدَ ضَرَّآءَ﴾ [ھود: 10:11] ''اور اگر دکھ کے بعد جو ہم اسے سکھ پہنچائیں۔'' اور سَرَّاءُ حالت غنا کا نام ہے اور ضَرَّاءُ حالت فقر کا۔

اَلۡكَاظِمِيۡنَ۔ كَظَمَ۔ مخرج النفس کو کہتے ہیں یعنی سانس کے مخرج کو اور كَظۡمٌ احتباس النفس یعنی سانس کا روکنا ہے اور اس سے مراد خاموش ہونا لیا جاتا ہے۔ كَظۡمِ غَيۡظ سے مراد غضب کا روکنا ہے اور [كَظَمَ السِّقَاءِ] کے معنی ہیں مشکیزہ کو بھر کر اس کا منہ باندھ دیا تاکہ پانی باہر نہ نکلے۔ (غ) كَظَمَ غَيۡظ کا استعارہ بھی اسی سے لیا گیا ہے۔ غیظ کے لیے [دیکھو نمبر: 506]۔

وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا	اور وہ کہ جب وہ کوئی برا کام کرتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم
اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا	کر بیٹھتے ہیں اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی
لِذُنُوۡبِهِمۡ ۟ وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا	بخشش مانگتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے

خوشحالی اور تنگی میں انفاق:

اس آیت میں متقیوں کے چار اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ اول وہ خوشحالی اور تنگی میں برابر خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ دونوں آخری حدود کے اندر تمام درمیانہ حالتیں خود ہی آجاتی ہیں۔ اور انسان کے لیے دو حالتوں میں خرچ کرنا ہی بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک جب وہ حد درجہ کے آرام اور راحت میں ہو کہ اس وقت خدا کو بھول جاتا ہے۔ اور دوسرے جب حد درجہ کی تنگی کی حالت میں ہو کہ اس وقت جو کچھ اسے ملے بمشکل اپنی ہی ضرورت پورا کرنے کے لیے مکتفی ہوتا ہے۔ پس ان حالتوں کا ذکر کر کے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایسا تعلق ہونا چاہیے کہ جب تمام طرف راحت کے ہی سامان نظر آتے ہوں اور دنیا میں انسان اپنے آپ کو کسی کا محتاج نہ سمجھتا ہو۔ تب بھی خدا کا محتاج اپنے آپ کو جان کر اس کی راہ میں دے اور مال کی محبت پر اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دے اور جب یہ سمجھتا ہو کہ میں اس قدر تنگدست ہوں کہ میری ضرورتوں سے کچھ نہیں بچتا تب بھی اپنی ضرورتوں کو پیچھے کر کے اور محرومی کے باوجود اپنے آپ کو محروم کرتے ہوئے خدا کی راہ میں خرچ کرے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نے پوچھا کہ تم میں سے کون ہے جس کے نزدیک اپنے مال سے اپنے وارث کا مال زیادہ محبوب ہو؟ تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ سب کے نزدیک اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ حالت اس کے برعکس ہے: [مَا لَكَ مِنْ مَّالِكَ إِلَّا مَا قَدَّمَتْ، ومَالُ وَارِثُكَ مَا أَخَّرْتَ] (ث) تیرے مال سے کچھ بھی تیرے لیے نہیں مگر وہی جو تو آگے بھیجے اور جو تو پیچھے رکھتا ہے وہی تیرے وارث کا مال ہے۔

غضب کا دبانا:

دوسری صفت کظم غیظ ہے۔ جو شخص اس بات پر قادر ہو کہ وہ غیظ یعنی سخت سے سخت غضب کو روک لے وہ گویا اپنے کل جذبات پر قادر ہو گیا۔ صحیح حدیث میں ہے: [لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ وَلَكِنَّ الشَّدِيْدَ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ] (صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الْحَذَرِ مِنَ الْغَضَبِ: 6114) یعنی ''پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں دوسروں کو پچھاڑ لیتا ہے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غضب کے وقت اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے۔'' (متفق علیہ) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى إِنْفَاذِهِ مَلَأَهُ اللّٰهُ جَوْفَهُ أَمْنًا وَإِيْمَانًا] (سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب مَنْ كَظَمَ غَيْظًا: 4779) (ث) ''جو شخص سخت غضب کو روک ہے درآنحالیکہ وہ اس کے نکالنے پر قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ کو امن و ایمان سے بھر دیتا ہے۔'' اور ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان کو غضب آئے تو اس کے دبانے میں اس سے بھی مدد ملتی ہے کہ اس حالت میں وضو کرے اس سے غضب کی آگ فرو ہو جاتی ہے۔

اللّٰهُ ۫ وَ لَمۡ يُصِرُّوۡا عَلٰى مَا فَعَلُوۡا وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

اور جو کر بیٹھیں اس پر اصرار نہیں کرتے درآنحالیکہ وہ جانتے ہوں۔ (519)

تیسری صفت ﴿عَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ کی ہے۔ لوگوں کی خطاؤں پر درگزر کرنے والے یہاں تک کہ ان کی خطاؤں کو مٹا ہوا سمجھیں۔ یہ کظم غیظ سے بڑھ کر صفت ہے۔ اس لیے کہ کظم غیظ صرف غصہ کو روک لینے کا نام ہے اور عفو یہ چاہتا ہے کہ خطا کو بالکل کالعدم سمجھا جائے اور اس پر کسی قسم کی گرفت نہ کی جائے نہ کسی قسم کے انتقام کا خیال دل میں لایا جائے۔ حدیث میں آتا ہے: [ثَلاثَةٌ أُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ؛ مَا نَقَصَ مَالٌ مِّنْ صَدَقَةٍ، وَمَا زَادَ اللهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ.] (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب اسْتِحْبَابِ الْعَفْوِ وَالتَّوَاضُعِ: 6757) (ث) ''تین باتوں پر میں قسم کھاتا ہوں، ایک یہ کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ جو شخص عفو کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عزت میں ہی بڑھاتا ہے اور تیسرے یہ کہ جو اللہ کے لیے تواضع کرے اللہ اس کا رفع کرتا ہے۔''

پھر خطاؤں کے عفو سے بڑھ کر محسنین کا مرتبہ ہے جو کسی کی خطا پر غضب کو ہی نہیں روکتے اس سے عفو ہی نہیں کرتے بلکہ اس پر احسان بھی کرتے ہیں یہ کمال کا آخری مرتبہ ہے۔

اُحد کی جنگ میں بعض لوگوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اس لیے اب ان کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ نہ صرف اپنے غصہ کو دبا جائیں، نہ صرف ان کی خطاؤں کو معاف کریں بلکہ ان پر احسان بھی کریں۔ ایسا ہی معاملہ احد کے موقع پر اور فتح مکہ میں قریش کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے کیا۔

519- فَاحِشَةً۔ فعل ہو یا قول جس کی قباحت بھاری ہو [نمبر: 206]۔ یہاں ﴿اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ﴾ کے بالمقابل فاحشۃ کو لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ فَاحِشَةٌ سے یہاں وہ امور مراد ہیں جن کی قباحت کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے اور ﴿ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ﴾ سے مراد وہ ذنوب ہیں جن کا بد اثر دوسروں پر تو نہ ہو مگر اپنے آپ کو ہی ان کا نقصان پہنچے۔

يُصِرُّوۡا۔ صَرَّ کے اصل معنی مضبوط باندھنا ہیں اور اصرار کے معنی ہیں کسی قصور پر پختہ ہو جانا اور اس میں مضبوط ہو جانا اور اس سے جدا ہونے سے رکنا۔ (غ)

پہلی آیت کے متقی تو نہایت اعلیٰ درجہ پر ہیں۔ جو دوسروں کے قصوروں کو معاف کرنے والے اور ان سے احسان کرنے والے ہیں۔ اس آیت میں اس سے کم مرتبہ کے متقیوں کا ذکر ہے۔ ان سے بعض وقت کوئی بڑی قباحت والا کام سرزد ہو جاتا ہے یا اپنی ہی جان پر ظلم کرتے ہیں تو وہ استغفار کرتے ہیں۔ یہاں استغفار میں دونوں باتیں داخل ہیں جو کچھ کر چکے ہیں؛ اس کے بد تاثرات سے بچنے کی دعا اور آئندہ ایسے گناہ میں پڑنے سے بچنے کی دعا۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَ نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ ﴿۱۳۶﴾

یہ لوگ ان کا بدلہ اپنے رب کی مغفرت اور باغ ہیں جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں ان میں رہیں گے، اور کام کرنے والوں کا اجر کیا ہی اچھا ہے۔ (520)

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۳۷﴾

تم سے پہلے واقعات گزر چکے ہیں۔ پس تم زمین میں پھرو، پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ (521)

520- عَامِلِيْنَ۔ عمل ہر وہ فعل ہے جو ایک جاندار قصد سے کرتا ہے۔ پس فعل عام ہے اور عمل خاص ہے۔ انسان کے سوائے دوسرے حیوانات سے بھی فعل سرزد ہوسکتا ہے مگر عمل نہیں۔ (غ) عمل وہی ہے جو انسان کو کسی اچھے یا برے اجر کا مستحق ٹھہراتا ہے اور گو عمل اچھے اور برے دونوں پر آتا ہے مگر قرینہ صاف بتاتا ہے کہ یہاں عاملین سے مراد اچھے کام کرنے والے ہیں۔ آیت 133 میں فرمایا تھا کہ مغفرت اور جنت کی طرف جلدی آؤ تو درمیان میں ان لوگوں کی صفات بیان کر کے جو مغفرت اور جنت کے حقدار ہوتے ہیں یہاں پھر ان کا اجر بیان فرمایا کہ ایسے لوگوں کو ضرور مغفرت اور جنت عطا ہوتی ہے۔ مغفرت کو قرآن کریم نے جنت کے ساتھ جمع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ مقام ہے۔ آیت کے آخر پر پھر ﴿نِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِيۡنَ﴾ لا کر بتا دیا کہ یہ عظیم الشان اجر کام کرنے پر ہی ملتا ہے۔

521- سُنَنٌ۔ سُنَّةٌ کی جمع ہے (جس کا مادہ سنن ہے) اور سُنَّةٌ طریقہ کو کہتے ہیں اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی سنت سے مراد آپ کا طریقہ ہے جس پر آپ چلتے تھے اور سُنَّةُ اللہ کے معنی ہیں: [طَرِيْقَةُ حِكْمَتِهِ وَ طَرِيْقَةُ طَاعَتِهِ] (غ) یعنی اس کی حکمت کی راہ اور اس کی فرمانبرداری کی راہ اور یہاں لفظ عام ہے اور مراد اس کی سیاق عبارت سے ظاہر ہے یعنی امم سابقہ کی ہلاکت اور استیصال کے طریق۔ یا ان کے ساتھ جو واقعات گزرے اور مغفل نے یہاں مراد محض امم لی ہے کیونکہ عرب کے کلام میں سُنَّةٌ بمعنی اُمَّةٌ بھی آیا ہے۔ (ر) اور عطاء نے معنی شرائع اور ادیان لیے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ تم سے پہلے قومیں گزر چکی ہیں یا دین ہو چکے ہیں یا واقعات ہلاکت ہو چکے ہیں۔ غرض سب کی ایک ہے۔

اَلۡمُكَذِّبِيۡنَ۔ تَكۡذِيۡبٌ کے معنی کسی شخص کو جھوٹ کی طرف منسوب کرنا یعنی اسے اپنے کلام یا دعوے میں کاذب قرار دینا خواہ وہ سچا ہو یا جھوٹا۔ مگر قرآن شریف میں صادق کی تکذیب پر ہی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اس لیے کوئی قرینہ نہ ہو تو مکذب سے مراد سچائی کا جھٹلانے والا ہوگا۔ اس آیت سے پھر جنگ احد کی طرف رجوع کیا ہے اور پہلے مومنوں کو تسلی دی ہے کہ مکذبین محمد رسول اللہ ﷺ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تم سے پہلے بہت مثالیں گزر چکی ہیں اگر کوئی شخص چاہے تو زمین میں پھر کر دیکھ

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

یہ لوگوں کے لیے بیان اور متقیوں کے لیے ہدایت اور وعظ ہے۔ (522)

وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

اور نہ سست ہو اور نہ غمگین ہو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ (523)

لے۔ ﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ میں سیر فی الارض کا امر لازمی نہیں بلکہ صرف ان کا حال معلوم کرنے کی ایک راہ بتائی ہے کہ چاہو تو زمین میں پھر کر دیکھ لو۔ ہر زمین میں یہی خدا کا قانون پاؤ گے کہ حق کی تکذیب کرنے والے برباد ہو گئے۔

522- هٰذَا میں اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے یا جو کچھ کفار اور متقیوں کے متعلق بیان ہوا ہے اس کی طرف یا انجام مکذبین کی طرف۔

بَيَانٌ۔ بَانَ سے ہے اور بیان کے معنی [اَلْكَشْفُ عَنِ الشَّيْءِ] (غ) کسی چیز کی اصل حقیقت کا واضح کرنا۔ اور یہ لفظ نطق سے عام ہے کیونکہ نطق انسان سے خاص ہے اور بیان کسی خاص حالت پر دلالت کرنے کو بھی کہا جا سکتا ہے اور خبر دینے کو بھی خواہ وہ بذریعہ نطق ہو یا لکھ کر یا کنایہ کے طور پر۔ (غ) اور بیان اور ہدیٰ میں یہ فرق ہے کہ بیان عام ہے یعنی خواہ کسی قسم کا بھی اظہار معنی ہو اور هُدًى خاص ہے۔ مَوْعِظَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 95]

یہاں قرآن کریم کو یا جس حالت کا یہاں ذکر کیا ہے اسے لوگوں کے لیے کھول کر بتا دینے والا کہا ہے۔ پھر اسے ہدایت کہا ہے یعنی بھلائی کی راہ بتانے والا بیان۔ یہ دونوں لِلنَّاسِ ہیں یعنی سب لوگوں کے لیے اور بالآخر اسے متقیوں کے لیے وعظ کہا ہے۔ یعنی متقیوں کو بری راہ سے ہٹا دینے والا اور خیر کی راہ پر چلانے والا۔

523- تَهِنُوْا۔ وَهَنَ سے ہے جس کے معنی ہیں کمزوری جو جسمانی بناوٹ کے سبب سے ہو یا خلق کے۔ (غ) ﴿وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ﴾ [مریم: 4:19] ''میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں۔''

اِنْ بعض نے ان کو اس موقعہ پر شرطیہ لیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طرز محض زیادہ ترغیب کے لیے اختیار کی گئی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو کہے [اِنْ كُنْتَ ابْنِيْ فَلَا تَفْعَلْ كَذَا]۔ اگر تو میرا بیٹا ہے تو ایسا مت کر۔ مگر کوفیوں کے نزدیک یہاں اِنْ بمعنی اِذْ ہے یعنی جب۔ کیونکہ شرط تو ہمیشہ آئندہ کے متعلق ہوتی ہے اور یہ امر واقع ہو چکا ہے۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ مثلاً: ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴾ [الفتح: 27:48] ''اگر اللہ نے چاہا تو تم ضرور مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے۔'' اور نبی ﷺ کا قول: [إِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُونَ] (صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب مَا يُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لأَهْلِهَا: 2301) پس جہاں فعل محقق الوقوع ہے وہاں اِنْ کے معنی اِذْ ہوں گے۔ (مغنی)

جنگ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہو گئے اور بہت سی تکلیف ان کو پہنچی اور یہ امر طبائع میں کچھ سستی اور کمزوری پیدا کر سکتا تھا اور اس سے مسلمانوں کو غم بھی پہنچا تھا تو تقویت کے لیے فرمایا کہ اس پر تم سے کوئی کمزوری ظاہر نہ ہو، اور نہ اب جو کچھ ہو چکا ہے اس پر

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۴۰﴾

اگر تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو یقیناً اسی طرح کا زخم (مخالف) قوم کو (بھی) پہنچا ہے اور ان دنوں کو ہم لوگوں میں نوبت بہ نوبت لاتے رہتے ہیں اور تا کہ اللہ ان کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے شہید بنائے اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ (524)

غمگین ہو۔ اور پھر ان کی تسلی کے لیے فرمایا کہ وہ جو وعدے تمہارے غلبہ کے ہیں وہ تو سچ ہو کر رہیں گے کیونکہ تم مومن ہو اور ہلاکت مکذبوں کا انجام ہے نہ مومنوں کا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھی دشمن کے واپس لوٹنے پر گھبرا اٹھے اور ادھر خالد کا لشکر عقب کی طرف سے حملہ آور ہوا تو مسلمان فوج کے گھر کر بالکل تباہ ہو جانے کا خطرہ ہو گیا تو اس وقت آنحضرت ﷺ نے دعا کی [اَللّٰهُمَّ لَا يَعْلُنَّ عَلَيْنَا اَللّٰهُمَّ لَا قُوَّةَ لَنَا اِلَّا بِكَ اَللّٰهُمَّ لَيْسَ يَعْبُدُكَ بِهٰذِهِ الْبَلْدَةَ غَيْرِ هٰؤُلَاءِ النَّفَرُ] (غق) اے اللہ یہ ہم پر غالب نہ آئیں۔ اے اللہ ہمیں کوئی قوت نہیں مگر تیرے ساتھ۔ اے اللہ سوائے اس گروہ کے اس شہر میں کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں۔ اور لکھا ہے کہ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بطور تسلی نازل کی۔

524- ﴿قَرْحٌ﴾۔ قَرْحٌ اس زخم کے اثر کو کہتے ہیں جو کسی خارجی شے سے انسان کو پہنچے اور قُرْحٌ اس کو جو داخلی شے سے ہو اور قَرْحٌ اور قُرْحٌ میں بعض وقت یہ فرق بھی کیا جاتا ہے کہ اول الذکر کا استعمال زخم پر ہوتا ہے اور دوسرے کا درد جو اس سے پیدا ہو۔ (غ) اور یہاں قَرْحٌ سے مراد وہ تکلیف ہے جو مسلمانوں کو جنگ اُحد میں پہنچی۔

اَلْاَيَّامُ۔ اَيَّامٌ۔ يَوْمٌ کی جمع ہے اور اس کا اصل اطلاق زمانہ کی ایک مدت پر ہی ہوتا ہے [نمبر: 3]۔ مگر عرب ایام کو بمعنی وقائع یعنی واقعات بھی استعمال کرتے ہیں۔ (ل) مثلاً کہتے ہیں [هُوَ عَالِمٌ بِاَيَّامِ الْعَرَبِ] یعنی وہ عرب کے واقعات کا عالم ہے اسی لحاظ سے: ﴿وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ﴾ [ابراھیم: 5:14] ''اور ان کو اللہ (کی نعمتوں) کے دن یاد دلا'' میں ایام اللہ سے مراد [نِعَمُ اللّٰهِ وَ نِقَمُ اللّٰهِ] لیے گئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کی عقوبتیں۔ اور مجاہد نے اس کے معنی صرف [نِعْمُ اللّٰهِ] کیے ہیں۔ (ل)

نُدَاوِلُهَا۔ دَوْلٌ سے ہے اور دَوْلَةٌ اور دُوْلَةٌ گردش یا نوبت کو کہتے ہیں دَوْلَةٌ مال میں اور دُوْلَةٌ جنگ میں اور [تَدَاوَلَ الْقَوْمُ كَذَا] سے مراد [تَنَاوَلُوْهُ مِنْ حَيْثُ الدَّوْلَةِ] یعنی ایک چیز کو نوبت بنوبت لیا اور اسی سے ہے [دَاوَلَ اللّٰهُ كَذَا بَيْنَهُمْ] یعنی اللہ تعالیٰ ایک شے کو نوبت بنوبت ان پر لایا۔

﴿يَعْلَمَ اللّٰهُ﴾۔ لفظ علم کے اس استعمال کے لیے [دیکھو نمبر: 179]۔

وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ يَمۡحَقَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۴۱﴾

اور تا کہ اللہ ان لوگوں کو کھرا کر دے جو ایمان لائے اور کافروں کو مٹا دے۔ (525)

قرآن کریم نے عموماً اللہ کے علم کو اس جگہ بیان کیا ہے جہاں مقصود اعمال کی جزا و سزا ہے۔ پس یہاں ﴿لِيَعۡلَمِ اللّٰهُ﴾ سے مراد وہ علم بھی ہو سکتا ہے جس کا تعلق جزا و سزا سے ہے کیونکہ گو اللہ تعالیٰ کو سب موجود و غیر موجود کا علم ہے ﴿عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَ الشَّهَادَةِ﴾ اس کا نام ہے۔ مگر اس کی جزا و سزا محض علم پر نہیں ہوتی بلکہ وقوع پر ہوتی ہے۔ پس ﴿لِيَعۡلَمِ اللّٰهُ﴾ سے مراد ہوئی تا کہ جزا دینے کے لیے جان لے اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسے علم کے ساتھ جان لے جو ان کو ان کے غیر سے ممیز کر دے۔

اس آیت میں بتایا ہے کہ اُحد کی جنگ میں اگر تم کو کچھ تکلیف پہنچی ہے تو ویسی ہی تکلیف تمہارے دشمنوں کو بھی پہنچی ہے کیونکہ جنگ کے شروع میں کفار نے بھی نقصان اٹھایا تھا۔ یہ جنگ بدر کے متعلق نہیں ہے کیونکہ جنگ بدر کے واقعہ کو لے کر قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ نہیں رہ جاتا بلکہ جیسا کہ خود قرآن کریم نے آگے چل کر فرمایا ہے ﴿اَوَ لَمَّاۤ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا﴾ [آل عمران: 165:3] ''اور کیا جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی کہ اس جیسی دو چند تم پہنچا چکے ہو۔'' جہاں دو مثلوں میں جنگ بدر اور جنگ اُحد ہیں۔

اس کے بعد ان الفاظ میں ﴿وَ تِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ﴾ فرمایا کہ دکھ اور تکلیفوں کے واقعات جیسے کافروں پر آتے ہیں مومنوں پر بھی آتے ہیں اور جنگوں میں ایسا ہو جاتا ہے کہ کبھی ایک فریق کو دکھ پہنچ جاتا ہے کبھی دوسرے کو۔ اس کا تعلق فتح و ظفر سے کچھ نہیں۔

تکالیف کی غرض:

اگر دکھ اور تکلیفیں نوبت بہ نوبت آتی رہنے والی چیزیں ہیں تو اس کی غرض کیا ہے۔ کیوں مسلمانوں کو جو خدا پر ایمان لاتے ہیں دکھ اور تکلیفیں پہنچیں؟ اس لیے کہ یہ دکھ اور تکلیفیں مومنوں کو منافقوں سے کھروں اور کھوٹوں سے الگ کرتی ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ایسا امتیاز ہوتا رہے۔ اور مومنوں کا ایمان ظاہر ہو کر وہ اس اجر کے مستحق قرار پائیں جو ایمان پر ملتا ہے اور دوسری ضرورت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اس اعلیٰ مقام پر پہنچائے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنی جانیں دے دیں اور جو بچ گئے وہ بھی اسی مقام پر ہیں کیونکہ اپنی طرف سے انہوں نے بھی اپنی جانیں خدا کی راہ میں دے دیں تھیں گو اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا۔ اور یا شہداء سے مراد پیشرو اور امام ہے۔ یعنی تم سے یہ قربانیاں کرا کر تم کو دنیا کے لوگوں کے لیے پیشرو اور امام بنائے کیونکہ بغیر دکھوں اور تکلیفوں میں پڑنے کے اور ان میں ثابت قدمی دکھانے کے کوئی شخص لوگوں کا پیشرو اور امام نہیں بن سکتا۔

525- يُمَحِّصَ۔ مَحَصَ کے اصل معنی ہیں ایک چیز کا ہر عیب سے جو اس میں ہو پاک کر دینا۔ سونے کا محص یا تمحیص اسے کہتے ہیں جو اس میں میل ہے اسے دور کر کے خالص سونا بنا دیا جائے۔ (غ)

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَ يَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۴۲﴾

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں جانا جو جہاد کرتے ہیں اور (تاکہ) وہ صبر کرنے والوں کو جانے۔ (526)

وَ لَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ ۖ فَقَدۡ رَاَيۡتُمُوۡهُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۴۳﴾ ع 14 14 5

اور یقیناً تم جنگ چاہتے تھے قبل اس کے کہ اسے ملو۔ سو اب تم نے اسے دیکھ لیا اور تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ (527)

يَمۡحَقَ۔ مَحَقَ کے معنی ہیں بے برکت کرنا یا کم کرنا [نمبر: 353]۔ ایک چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے یا تدریجاً کم کرنا۔ (ض)

تکلیف سے فائدہ اٹھانا مومن کا کام ہے:

یہاں دو مزید نتائج بیان فرمائے ہیں۔ مومنوں کی تمحیص اور کافروں کی بے برکتی یا نقصان۔ یعنی جو تکلیف مومن کو پہنچتی ہے وہ اس کے ذنوب اور عیوب سے تطہیر کا موجب ہو کہ اس کی ترقی کا موجب ہوتی ہے وہ تکلیف کے آنے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کافر چونکہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس لیے اس کے لیے تکلیف کا نتیجہ نقصان اور بے برکتی ہوتی ہے۔

526- لَمَّا۔ اصل میں لَمۡ نافیہ اور مَا ہے۔

یہ آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے علم سے مراد جزا و سزا کا علم ہے کیونکہ یہاں فرمایا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے گویا تمہارے جنت میں داخل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لے۔ اب جنت میں داخل ہونا جہاد کرنے اور صبر کرنے پر منحصر ہے۔ یعنی ان امور کے واقع ہونے پر۔ پس یہاں اللہ کے علم سے مراد ان چیزوں کے وقوع کا علم ہے جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جزا ملے کہ وہ لوگ جنت میں داخل ہوں۔

527- اَلۡمَوۡتُ یہاں موت کا لفظ اسباب موت پر بولا گیا ہے۔ (ج) آگے آتا ہے تم اسے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ موت کو کوئی شخص نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں اسباب موت دیکھے جا سکتے ہیں اس لیے بھی موت سے مراد اس کا سبب یعنی جہاد اور قتل ہے اور یا موت کی تمنا سے مراد صرف خدا کی راہ میں جان دے دینے کی آرزو ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [لَوَدِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ] (صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب الْجِهَادُ مِنَ الإِيمَانِ: 36) ''میں اس بات سے محبت رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔'' خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو سب آرزوؤں سے بہتر ہے۔

﴿تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ﴾ سے اشارہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس خواہش کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کھلے میدان

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ

اور محمد ایک رسول ہی ہے، اس سے پہلے (سب) رسول مر چکے ہیں۔ پھر اگر وہ مر جائے یا قتل کیا جائے تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ (528) اور جو کوئی الٹے

میں دشمن کے ساتھ جنگ کریں گے یا بعض صحابہ جو جنگ بدر میں رہ گئے تھے اس بات کے آرزومند تھے کہ انہیں بھی کسی جہاد میں شامل ہونے کا موقعہ ملے۔

528- مُحَمَّدٌ اس کا مادہ حَمْدٌ ہے اور یہ سب سے زیادہ مشہور اسم ہمارے نبی کریم ﷺ کا ہے اور اس کے معنی ہیں [اَلَّذِیْ کَثُرَتِ الْخِصَالَةُ الْمَحْمُوْدَةُ]۔ (ل) وہ جس کی قابل تعریف خصلتیں بہت بڑھی ہوئی ہوں۔ اور محمد اور احمد ہمارے رسول مصطفیٰ ﷺ کے ناموں میں سے ہیں (ل) لسان العرب میں سات نام دیئے ہیں جن کا نام ایام جاہلیت میں محمد رکھا گیا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے دادا عبدالمطلب نے یہ نام آپ کا رکھا تھا اور انہوں نے کہا تھا کہ یہ نام آپ کا مجھے رؤیا میں بتایا گیا ہے۔ (ر) اور حدیث متفق علیہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَنَا أَحْمَدُ] (صحيح البخاری، کتاب التفسير، باب قَوْلُهُ تَعَالٰى: مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ، حديث: 4896) ''میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں۔'' اور ایک حدیث میں ہے: [أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ يَصْرِفُ اللهُ عَنِّي لَعْنَ قُرَيْشٍ وَشَتْمَهُمْ يَسُبُّونَ مُذَمَّمًا وَأَنَا مُحَمَّدٌ] (صحيح البخاری، کتاب المناقب، باب مَا جَاءَ فِي أَسْمَاءِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: 3533؛ مسند الإمام أحمد: جلد14، صفحه 183) ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ سے قریش کی لعنت اور ان کی گالی گلوچ کو پھیر دیا ہے؟ وہ کسی مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں محمد ہوں۔''

خَلَتْ۔ خَلَا کے معنی [نمبر: 26] و [نمبر: 169] میں بیان ہو چکے ہیں۔ لیکن جب کسی انسان کے متعلق کہا جائے خَلَا تو اس سے مراد اس کی موت ہوتی ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ابن الاعرابی کا قول منقول ہے: [خَلَا فُلَانٌ اِذَا مَاتَ] اور یہ ظاہر بھی ہے کیونکہ انسان کا گزر جانا یہی ہے کہ وہ اس عالم سے دوسرے عالم کی طرف انتقال کر جائے اور اس کا دروازہ موت ہی ہے اور یہاں خَلَتْ کے مقابلہ پر ﴿مَّاتَ اَوْ قُتِلَ﴾ لا کر صاف بتا دیا کہ جن کے خَلَا کا ذکر ہے وہ ان کا گزر جانا بذریعہ موت یا قتل ہی ہوا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا بھی ان دو طریقوں میں سے کسی ایک طریق پر گزر جانا ضروری ہے۔ پس ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے رسول بذریعہ موت یا قتل گزر چکے۔ اگر کوئی تیسری صورت گزر جانے کی بھی قَدْ خَلَتْ میں شامل ہوتی تو ضرور تھا کہ اس کا ذکر بھی خَلَتْ کے مقابلہ پر کر دیا جاتا۔ جیسے کہ مَاتَ کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں خبر تو مشہور صرف قتل کی ہوئی تھی۔ پس اگر پہلے رسولوں کے گزر جانے کے ساری صورتوں کا ذکر مقصود نہ ہوتا تو صرف [اَفَائِنْ قُتِلَ] کہنا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ مَّاتَ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔

﴿مَّاتَ اَوْ قُتِلَ﴾۔ مَوْتٌ سے مراد [مَوْتٌ عَلَى الْفِرَاشِ] ہے یعنی طبعی موت۔ اور قتل سے مراد وہ موت ہے جو کسی ایسے

عَلٰی عَقِبَیۡهِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیۡئًا ؕ وَ سَیَجۡزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِیۡنَ ﴿۱۴۴﴾

پاؤں پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑے گا، اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد بدلہ دے گا۔

واسطہ سے ہو جو جسم انسانی کا ناقص ہو۔

اِنۡقَلَبۡتُمۡ۔ [اِنْقِلَابٌ] قَلَبَ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا ایک رخ سے دوسرے رخ کی طرف پھیرنا۔ اور انقلاب کے معنی [اِنْصِرَافٌ] ہیں یعنی پھر جانا۔ (غ)

أَعۡقَابٌ۔ عَقِبٌ کی جمع ہے اور عَقِبٌ ایڑی کو کہتے ہیں اور [رَجَعَ عَلٰی عَقِبِهٖ] کے معنی کیے ہیں [اِنْثَنٰی رَاجِعًا] (غ) الٹا پھر گیا۔ یہی معنی [اِنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ] کے ہیں اور یہ بعینہٖ وہی خیال ہے جو ہماری زبان میں الٹے پاؤں پھر جانے سے ادا ہوتا ہے: ﴿اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انْقَلَبْتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِكُمۡ﴾ میں ہمزہ انکاری ہے اور انکار سے مراد انکار [اِنْقِلَابٌ عَلَی الْاَعْقَابِ] ہے یعنی ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم مرتد ہو جاؤ۔ اور بعض نے [اِنْقِلَابٌ عَلَی الْاَعْقَابِ] سے مراد محض جنگ سے فرار لیا ہے۔ اس صورت میں اشارہ ان چند نفوس کی طرف ہے جو میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے اور بعض نے [اِنْقِلَابٌ عَلَی الْاَعْقَابِ] سے مراد صرف ایمانی کمزوری کا دکھانا لیا ہے۔ کیونکہ فرار کسی کمزوری کا نتیجہ ہی تھا اور چونکہ یہ آیت آنحضرت ﷺ کی وفات کا ذکر کرتی ہے اس لیے اس میں ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے جو آنحضرت ﷺ کی وفات پر مرتد ہو گئے تھے۔

اُحد میں آنحضرت ﷺ کے قتل کی خبر کا مشہور ہو جانا:

اس آیت میں جنگ اُحد کے اس نازک ترین موقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے قریش مکہ کا رسالہ خالد کے ماتحت لشکر اسلامی کی عقب کی طرف سے حملہ آور ہوا اور بھاگتا ہوا لشکر کفار بھی لوٹا اور مسلمان پریشانی کی حالت میں ہو گئے۔ اس حالت میں نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے لیے بلند آواز سے یہ کہنا شروع کیا: [اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ] ''اے اللہ کے بندو میری طرف آجاؤ میں رسول اللہ ہوں۔'' اس آواز کے بلند ہوتے ہی کفار نے نہایت تندی سے آنحضرت ﷺ پر حملہ کیا اور ابن قمہ حارثی نے رسول اللہ ﷺ پر ایک بڑا پتھر پھینکا جس سے آپ کے سامنے کے دانت مبارک شہید ہو گئے اور منہ اور سر زخمی ہو گیا اور یہ شخص آگے بڑھا کہ آپ کو قتل کر دے کہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ صاحب الرایۃ درمیان میں حائل ہو گئے اور خود شہید ہو کر نبی کریم ﷺ کو بچا لیا اور آہستہ آہستہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے صحابہ کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔ مگر آپ زخم کی شدت سے گر گئے۔ ادھر جب ابن قمہ آپ کو قتل نہ کر سکا تو اس نے یہ خبر اڑا دی کہ محمد رسول اللہ ﷺ قتل ہو گئے اور یہ آواز سارے لشکر میں بلند ہو گئی۔ اسی واقعہ کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انْقَلَبْتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِكُمۡ﴾ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے قدم میں اس خبر سے کوئی تزلزل نہیں آیا سوائے چند نفر کے جو لشکر سے کٹ جانے کی وجہ سے بھاگ گئے۔ بلکہ ان میں وہ لوگ تھے جنہوں نے

وَ مَا كَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تَمُوۡتَ اِلَّا بِاِذۡنِ اور کسی شخص کے لیے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے اذن کے سوا

کہا: [اِنْ كَانَ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ فَاِنَّ رَبَّ مُحَمَّدٍ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ فَقَاتِلُوا عَلٰى مَا قَاتَلَ عَلَيْهِ] (روح المعانی: جلد4، صفحہ 72) اگر محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں تو رب محمد زندہ ہے جو کبھی نہیں مرے گا۔ سو تم بھی اس بات کے لیے جنگ کرو جس کے لیے آپ جنگ کرتے تھے۔

اس آیت ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ﴾ سے ایک اور اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ وہ آیت ہے جس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی وفات پر استدلال کیا اور جس استدلال کے سامنے سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی گردنیں جھک گئیں۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کی خبر جب شائع ہوئی تو کون مسلمان ہوگا جس کا دل چاہتا ہو کہ اس خبر پر یقین کرے۔ صحابہ کو جو آپ ﷺ سے محبت تھی وہ ایسی تھی کہ وہ لوگ آپ کی وفات کا کلمہ بھی منہ پر لانا پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عام مجمع میں یہ کہہ دیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کو وفات یافتہ کہے گا میں اس کا سر اڑا دوں گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اتنے میں آئے اور سیدھے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں چلے گئے۔ کپڑا چہرہ مبارک سے اٹھایا اور دیکھا کہ آپ رفیق اعلیٰ سے جا ملے ہیں۔ تو آپ نے واپس مسجد میں آ کر ایک خطبہ پڑھا جس میں آپ نے فرمایا: [أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللهَ فَإِنَّ اللهَ حَيٌّ لَّا يَمُوتُ] (صحيح البخاری، كتاب فضل الصحابة: 3668) اے لوگو! جو کوئی محمد (ﷺ) کی عبادت کرتا تھا تو محمد (ﷺ) فوت ہو گئے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت قرآن کریم کی پڑھی ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ﴾ محمد ﷺ ایک رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے سب رسول گزر چکے۔ اور اس سے یہ استدلال کیا کہ آنحضرت ﷺ فوت ہو گئے تو سب لوگ خاموش ہو گئے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ استدلال اسی صورت میں کام دے سکتا تھا جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ اعتقاد ہو کہ **آنحضرت ﷺ سے پہلے تمام رسول وفات پا چکے ہیں۔** کیونکہ اگر پہلے رسولوں میں سے کچھ ایسے بھی مانے جائیں کہ انہوں نے وفات نہ پائی ہو تو پھر ایک رسول کی وفات پر یہ کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اگر بعض رسولوں نے وفات پائی اور بعض نے نہیں پائی تو پھر کیوں رسول اللہ ﷺ ان میں نہ ہوں جنہوں نے وفات نہیں پائی۔ ہاں اگر سب رسول ہی وفات پا چکے تو پھر آنحضرت ﷺ کی وفات پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس استدلال کی صحت کے سامنے سارے صحابہ کا خاموش ہو جانا ایک قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ سے پہلے کل رسولوں کو وفات یافتہ مانتے تھے۔ گویا آنحضرت ﷺ سے پہلے کل نبیوں کی وفات پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔ یہ امر کہ اس سے سارے رسولوں کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے اور تمام رسولوں کا آنحضرت ﷺ سے پہلے موت یا قتل سے جن کو قرآن کریم نے بمقابلہ خَلَا استعمال کیا ہے گزر جانا ہی مانا ہے۔ چنانچہ بیضاوی نے ان الفاظ ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ﴾ کی تفسیر یوں کی ہے: [فَسَيَخْلَوْا كَمَا خَلَوْا بِالْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ] پس آپ بھی گزر جائیں گے جیسے وہ گزر گئے موت سے یا قتل سے جس سے سارے پہلے انبیاء کا موت یا

اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ مرجائے (موت کا) وقت لکھا ہوا ہے،[529] اور جو کوئی دنیا

قتل سے گزر جانا ثابت ہے۔ اور تفسیر غرائب القرآن میں ان الفاظ ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ میں دو دلیلیں مانی ہیں جن میں سے دوسری دلیل کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: [وَثَانِيْهُمَا الْقِيَاسِ عَلٰى مَوْتِ سَائِرِ الْاَنْبِيَاءِ اَوْ قَتْلِهِمْ] یعنی دوسری بات تمام کے تمام انبیاء کی موت یا ان کے قتل پر قیاس ہے اور تفسیر روح المعانی میں انہی الفاظ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے کہ [وَبَيْنَ أَنْ حَكَمَ النَّبِيُّ ﷺ حَكَمَ مَنْ سَبَقَ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ صَلَوَاتُ اللهِ تَعَالٰى وَسَلَامُهُ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِيْنَ فِيْ أَنَّهُمْ مَاتُوْا وَبَقِيَ أَتْبَاعُهُمْ مُتَمَسِّكِيْنَ بِدِيْنِهِمْ] یعنی اللہ تعالیٰ نے نے یہاں کھول کر بیان کر دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا حکم ان انبیاء کا حکم ہے جو پہلے گزر چکے سب پر اللہ کی صلوٰت اور سلام ہو اس بارہ میں کہ وہ مر گئے اور ان کے پیرو ان کے دین پر متمسک رہے۔ اور پھر لکھا ہے: [فَتَكُوْنُ جُمْلَةُ قَدْ خَلَتْ ...إلخ صِفَةٌ لِرَسُوْلٍ مُنَبِّئَةٌ عَنْ كَوْنِهِ ﷺ فِيْ شَرْفِ الْخُلُوِّ فَإِنَّ خُلُوَّ مَشَارِكِيْهِ فِيْ مَنْصَبِ الرِّسَالَةِ مِنْ شَوَاهِدِ خُلُوِّهِ لَا مُحَالَةَ كَأَنَّهُ قِيْلَ: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ أَمْثَالُهُ فَسَيَخْلُوْ كَمَا خَلَوْا] یعنی اس صورت میں یہ جملہ قَدْ خَلَتْ رسول کی صفت ہوگا۔ خبر دینے والا اس بات کی کہ آنحضرت ﷺ کو شرف گزر جانے کا حاصل ہے کیونکہ منصب رسالت میں جو آپ کے شریک ہیں ان کا گزر جانا لامحالہ آپ کے گزر جانے کے شواہد میں سے ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اس کی مثل اس سے پہلے گزر گئے۔ پس جس طرح وہ گزر گئے اسی طرح یہ بھی گزر جائے گا۔

علاوہ ازیں اس آیت کا مقابلہ اگر ایک دوسری آیت قرآنی سے کیا جائے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر انہی الفاظ میں آتا ہے تو اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے کل رسول اس آیت کے نزول سے پیشتر مر چکے تھے اور وہ آیت یوں ہے: ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ [المآئدة: 75:5] مسیح ابن مریم ایک رسول ہی ہے اس سے پہلے رسول گزر چکے۔ اب اس میں شک نہیں کہ یہ آیت حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر استدلال کے طور پر ہے کہ جس طرح پہلے رسول گزر چکے وہ بھی گزر گئے اور یہاں جو ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ فرمایا تو اس پر بہر حال قریباً سب کا اتفاق ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے تمام رسول وفات پا چکے۔ اب تعجب ہے کہ یہ آیت تو حضرت مسیح سے پہلے سارے رسولوں کے مرنے پر دلیل ہو اور بعینہٖ ایسی ہی آیت ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ آنحضرت ﷺ سے پیشتر تمام رسولوں پر وفات کی دلیل نہ مانی جائے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آیت ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ [المآئدة: 75:5] سے تو حضرت مسیح سے پیشتر تمام رسولوں کی وفات ثابت ہے مگر آیت ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ سے ایک بھی رسول کی وفات ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ باقی سب تو دوسری آیت کی رو سے مر چکے اور اس آیت کی رو سے ایک حضرت مسیح بھی نہ مرے۔

529- ﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اِذْنٌ کے معنی اجازت اور رخصت کا اعلام ہے اور علم کے معنی میں بھی آتا ہے [نمبر: 123]۔ اور ابو مسلم نے یہاں اذن کے معنی امر کیے ہیں۔ (غق) اور بعض نے اس کے معنی تَخْلِيَةٌ اور اطلاق یعنی چھوڑ دینا لیے ہیں اور مراد ﴿وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ

الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو اس سے دے دیتے ہیں، اور جو کوئی آخرت کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو اس سے دے دیتے ہیں، اور شکر کرنے والوں کو ہم جلد بدلہ دیں گے۔ (530)

تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ سے یہ لی ہے کہ کوئی شخص قتل کے ذریعہ سے نہیں مرسکتا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ قاتل کو چھوڑ دے کہ وہ مقتول کو مار ڈالے۔ (غق) گویا یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر ان لوگوں کو غالب نہیں آنے دیا کہ باوجود اسباب قتل کے جمع ہوجانے کے وہ آپ کے قتل پر مسلط ہوجاتے۔

﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ كِتَابٌ۔ مصدر ہے جو یہاں مقدر كَتَبَ الْمَوْتِ کے لیے بطور تاکید لایا گیا ہے اور مؤجل کے معنی وہ جس کے لیے اجل مقرر کی گئی ہے اور اجل وہ مدت معینہ ہے جو کسی چیز کے لیے مقرر کی گئی ہو اور عام طور پر انسان کی زندگی کی مدت معینہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ان الفاظ میں ان لوگوں کی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنہوں نے یہ مشہور کیا تھا کہ آنحضرت ﷺ فوت ہوگئے اور بالخصوص بعض منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہم عبداللہ بن ابی کے ذریعہ سے ابوسفیان سے امان طلب کریں گے۔ (حالانکہ ابوسفیان خود مکہ سے بہت دور نکل چکا تھا) اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی انسان بھی اذن الٰہی کے بغیر نہیں مرتا اس لیے گو محمد رسول اللہ ﷺ کی موت کے سب سامان جمع ہو چکے تھے مگر اللہ تعالیٰ کا یہ اذن نہ تھا کہ آپ اس وقت وفات پائیں۔ گو الفاظ میں عمومیت ہے مگر اصل غرض آنحضرت ﷺ کی حفاظت کی طرف ہی توجہ دلانا ہے۔ بے شک ایسے اسباب اس جنگ میں جمع ہو چکے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ وفات پا جاتے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا تھا کہ آپ کو مخالفین پر غالب کرے گا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان وعدوں کو پورا فرمایا اور آنحضرت ﷺ کی حفاظت فرمائی اور الفاظ کو عام کر کے یہ بتایا ہے کہ کسی شخص کو بھی نہ چاہیے کہ جب اس کا فرض اس کو موت کے مقام پر کھڑا ہونے کے لیے بلاتا ہو تو گھبرا کر وہاں سے بھاگے۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اسباب موت کے جمع ہونے کے باوجود بھی اس کو بچالے۔

530- ثَوَابَ۔ ثَوْبٌ سے مشتق ہے جس کے اصل معنی دو طرح پر ہیں۔ یعنی اول ایک چیز کا اپنی پہلی حالت کی طرف جس پر وہ تھی لوٹ آنا اسی معنی میں آتا ہے۔ [ثَابَ فُلَانٌ اِلٰى دَارِهٖ] فلاں شخص اپنے گھر کی طرف لوٹ آیا۔ اور دوسرے معنی ہیں: [رُجُوْعُ الشَّيْءِ اِلَى الْحَالَةِ الْمُقَدَّرَةِ بِالْفِكْرَةِ] یعنی ایک چیز کا لوٹ کر ایسی حالت کی طرف آجانا جو اس کے لیے بروئے فکر و عقل مقدر تھی۔ اس معنی کے لحاظ سے ثوب لباس کو کہتے ہیں کیونکہ سوت کا کاتنا اس غرض کے لیے تھا کہ اس سے کپڑا بنے اور اسی معنی میں ثواب عمل ہے یعنی وہ چیز جو انسان کے اعمال کے بدلہ سے اس کی طرف لوٹ کر آتی ہے اور جزاء یا بدلہ کو ثواب اس خیال سے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ اصل چیز ہی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بعض جگہ جزا کو نفس فعل ہی قرار دیا گیا ہے جیسے فرمایا: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝﴾ [الزلزال: 7:99] ''جو کوئی شخص ایک ذرہ کے برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ

وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوۡنَ كَثِيۡرٌ ۚ فَمَا وَ هَنُوۡا لِمَاۤ اَصَابَهُمۡ فِىۡ

اور کتنے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے ربانی لوگ لڑے،(531) پھر اس وجہ سے وہ سست نہ

لے گا'' اور یہ نہیں کہا کہ وہ اس کی جزا کو دیکھ لے گا۔(غ)

لفظ ثواب کو جزائے اعمال کے لیے اختیار کر کے **فلسفہ اعمال** کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جب انسان ایک اچھا یا برا فعل کرتا ہے تو اس کے کرنے کے ساتھ وہ فعل ختم نہیں ہو جاتا۔(گو انسان ایسا ہی سمجھتا ہے کہ بس جو ہونا تھا ہو چکا اسی لحاظ سے عمل کو دوسری جگہ طائر کہا ہے۔گویا کرنے والے کے نزدیک وہ اڑ جاتا ہے۔گو قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ اڑتا نہیں بلکہ [فِیْ عُنُقِہٖ] یعنی اس کے ساتھ لازم ہو جاتا ہے۔) بلکہ وہی فعل ایک دوسرے رنگ میں لوٹ آتا ہے اور ہر ایک نتیجہ درحقیقت اصل فعل کی ہی ایک دوسری صورت ہے۔

لفظ ثواب خیر اور شر دونوں پر استعمال ہوتا ہے گو اس کا زیادہ استعمال خیر پر ہے۔

اس حصہ آیت میں **دو گروہوں کا ذکر** کیا ہے ﴿مَنۡ يُّرِيۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا﴾ اور ﴿مَنۡ يُّرِدۡ ثَوَابَ الۡاٰخِرَةِ﴾ مفسرین نے عموماً یہاں گروہ اول سے مراد تیراندازوں کا وہ حصہ لیا ہے جنہوں نے مال غنیمت کی خاطر نبی کریم ﷺ کے حکم کے خلاف کیا اور اپنی جگہ کو چھوڑ دیا۔مگر میرے نزدیک اس سے مراد منافق ہیں جن کو جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اڑتی اڑتی افواہ آنحضرت ﷺ کی وفات کی مدینہ میں پہنچی تو وہ خوش ہوئے کہ وہ ساتھ نہ تھے اور ان کو وہ تکلیف نہ پہنچی جو مسلمانوں کو پہنچی۔تو ان کو بتاتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص دنیوی فائدہ اپنے عمل سے حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ دے دیتا ہے اور جو انجام کی بھلائی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ وہ بھی دے دیتا ہے۔جو انجام میں بھلائی کے لیے کوشش کرتا ہے اس کو ضرور ہے کہ ابتدا میں کچھ دکھ اٹھانا پڑے اور جو موجودہ وقت کی بھلائی چاہتا ہے اس کو وہ مل جاتی ہے مگر انجام کار دکھ اٹھانا پڑتا ہے۔

531- كَاَيِّنۡ۔ بعض کے نزدیک اس میں نون اصلی ہے اور یہ لفظ بسیط خاص اس معنی کے لیے موضوع ہے اور مشہور یہ ہے کہ یہ مرکب ہے کاف تشبیہ سے۔اور اَیٍّ سے جو ابہام کے لیے آتا ہے اور اَیٍّ کی تنوین نے نون کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کی مثال کَذَا ہے جو كَ اور ذَا سے مرکب ہے اور كَاَيِّنۡ بمعنی كَمۡ ہے یعنی کتنے۔

رِبِّيُّوۡنَ۔ رِبِّيٌّ کی جمع ہے۔امام راغب کے نزدیک ربی اور ربانی کے ایک ہی معنی ہیں جس کے لیے [دیکھو نمبر: 470]۔اور لسان العرب میں ربی کو منسوب اِلَی الرَّبّ ہی لکھا ہے گویا ربی اور ربانی کے ایک ہی معنی ہیں۔مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی جَمُوۡعٌ یعنی جماعتیں مروی ہیں۔(ر) اور یہی معنی فراء اور زجاج نے کیے ہیں۔(غق) اور اس صورت میں یہ رِبَّةٌ یا رَبْوَةٌ سے مشتق ہے جس کے معنی جماعت ہیں اور ضحاک نے اس کو ایک ہزار کے ساتھ مخصوص کیا ہے مگر یہاں تعداد اور گنتی کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں اور اس کا ذکر لفظ کثیر میں موجود ہے۔بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو جنگیں کرنی پڑیں اور ان کے ساتھ بڑے بڑے ربانی لوگوں کو علماء، فقہاء کو بھی جنگیں کرنی پڑیں تو ان کو ان جنگوں میں تکلیفیں بھی اٹھانی پڑیں مگر اس کا

سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوۡا وَ مَا اسۡتَكَانُوۡا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۴۶﴾

ہوئے جو ان کو اللہ کی راہ میں مصیبت پیش آئی اور نہ کمزور ہوئے اور نہ عاجزی اختیار کی، اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ (532)

وَ مَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ اِسۡرَافَنَا فِىۡۤ اَمۡرِنَا وَ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۴۷﴾

اور ان کی بات سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ انہوں نے کہا ہمارے رب ہمارے گناہ اور جو ہم سے زیادتی ہوئی ہمیں بخش دے اور ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔ (533)

نتیجہ یہ نہیں ہوا کہ وہ کمزور ہو گئے ہوں۔

532- وَهَنُوۡا۔ وَهَنٌ کے معنی بیان ہو چکے ہیں۔ ضعف خُلق یا خَلق اور حدیث میں آتا ہے: [لَا وَاهِنًا فِيْ عَزْمٍ] جس کے معنی ہیں [ضَعِيْفًا فِيْ رَأْيٍ] (ل) اور چونکہ یہاں ضعف کا الگ ذکر ہے اس لیے اس سے مراد ضعف رائے ہے یعنی ارادہ میں سست ہو جانا۔ لسان العرب میں فَمَاوَهَنُوْا کے معنی بیان کیے ہیں [مَا فَتَرُوْا وَمَا جَبَنُوْا مِنْ قِتَالِ عَدُوِّهِمْ] یعنی دشمن کی جنگ میں نہ وقفہ کیا اور نہ بزدل ہوئے۔

اِسۡتَكَانُوۡا اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے مفرادت میں اس کا اشتقاق کان سے باب استفعال میں مانا ہے اور معنی تضرع ہیں یعنی عاجزی اختیار کی اور لسان العرب میں اِسۡتِكَانَةٌ کا اصل سکن یا سکون سے مانا ہے اور معنی اس کے [خَضَعَ وَ ذَلَّ] ہی کیے ہیں۔ یعنی عاجزی اور فرمانبرداری اختیار کی اور اس صورت میں تعلق اصل معنی سے ظاہر ہے اور لسان العرب میں ہے کہ اصل میں اِسْكَتَنُوْا تھا اشباع سے اِسۡتَكَانُوۡا ہو گیا ہے۔ دوسری جگہ قرآن شریف میں آتا ہے: ﴿فَمَا اسۡتَكَانُوۡا لِرَبِّهِمۡ﴾ [المؤمنون: 76:23] ''مگر وہ اپنے رب کے آگے نہ گرے۔'' اور غرائب القرآن میں ہے وَهَنٌ وہ ضعف ہے جو دل سے تعلق رکھتا ہے اور ضعف مطلق قوت جسمانی میں کمزوری ہے اور اِسۡتِكَانَةٌ اس عاجزی اور ضعف کا اظہار ہے۔

یہاں جو تین لفظ اختیار کیے ہیں یہ تین الگ الگ مراتب کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وَهۡنٌ یا رائے کی سستی اور ارادہ کی کمزوری ہے جس کا تعلق گویا دشمن کی تیاری سے ہے اور اس کی جموع کثیرہ اور اس کے سامان جنگ سے۔ دوسرا ضعف یا کمزوری کا پیدا ہو جانا ہے جس کا تعلق بعض کے قتل ہو جانے اور بعض کے زخمی ہو جانے سے ہے اور تیسرا اظہار عاجزی ہے جس کا تعلق دشمن کی آنی فتحیابی سے۔ گویا بہر حال انسان کو دشمن کے مقابلہ پر مضبوط اور قوی رہنا چاہیے اور دب نہیں جانا چاہیے۔

533- اِسۡرَافَنَا۔ اِسۡرَافٌ۔ سَرَفَ سے ہے۔ ہر فعل میں جو انسان کرے حد سے گزر جانے کا نام سرف یا اسراف ہے۔ (غ) گو مال

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَ حُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۴۸﴾ ع 15 5 6

سو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا اچھا ثواب دیا اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (534)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم ان کی اطاعت کرو گے جو کافر ہوئے تو وہ تم کو الٹے پاؤں لوٹا دیں گے پس تم نقصان اٹھانے والے ہو کر پھر جاؤ گے۔ (535)

کے متعلق اس کے معنی کی زیادہ شہرت ہے۔

﴿ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا﴾ لفظی معنی تو یہی ہیں کہ ہمارے قدموں کو مضبوط کر۔ مگر مراد اس سے یہ ہے کہ دلوں سے خوف دور ہو۔ اور ہر قسم کے خیالات فاسدہ سینوں سے نکلے رہیں۔ (غق) قدموں کی مضبوطی کو دل کی قوت سے شدید تعلق ہے۔

یہاں بتایا ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوریوں کا علاج اور خطاؤں کی معافی چاہو دوسری طرف دشمن پر نصرت کے طالب بنو۔ اگر اپنے نفسوں میں کمزوریاں بھری رہیں تو دشمن پر فتح پانے سے انسان کو کیا فائدہ ہوسکتا ہے۔

534- اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں کوشش کرتے ہیں اور دنیا کو دین پر قربان کر دیتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ دنیا کا ثواب بھی ضرور دیتا ہے اور آخرت کا ثواب تو نہایت اعلیٰ درجہ کا ملتا ہے۔ ان لوگوں کو یہاں محسن کہا ہے احسان کے معنی حدیث میں آئے ہیں [تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ] (صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الإِيمَانِ وَالإِسْلاَمِ وَالإِحْسَانِ وَعِلْمِ السَّاعَةِ: 50) ''اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ اسے دیکھ رہا ہے۔'' اور جو شخص اپنے فوائد دنیوی کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیتا ہے یہاں تک کہ اپنا سر بھی خدا کی راہ میں دے دیتا ہے یا دینے کے لیے تیار ہوتا ہے وہ واقعی احسان کی اس تعریف کے نیچے آتا ہے۔

535- **اطاعت کفار:** ﴿اِنۡ تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ اَطَاعَةٌ کے معنی گزر چکے کسی کے امر کی پیروی کرنا [نمبر: 487]۔ یہاں اطاعت سے مراد یا تو کافروں کے سامنے کمزور ہو کر عاجزی اختیار کر لینا اور ان کی ماتحتی قبول کر لینا ہے جیسا کہ [آیت: 146] میں فرمایا تھا کہ نبی کے ساتھی ایسے کمزور نہیں ہوتے کہ دشمن کو ذرا غالب دیکھا تو فوراً اس کے آگے جھک گئے اور یہ اس لیے فرمایا کہ منافق جو راستہ سے واپس ہو گئے تھے اب اس مصیبت کو دیکھ کر اس بات پر تلے بیٹھے تھے کہ ابوسفیان مدینہ کا رخ کرے تو فوراً اس کی اطاعت کر لیں۔ اس لیے مومنوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ان کافروں کی اطاعت کا نتیجہ صرف ایک ہی ہوسکتا ہے کہ وہ دین اسلام سے تم کو پھیر دیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ لَا يَزَالُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ حَتّٰى يَرُدُّوۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِكُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا﴾

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ بلکہ اللہ ہی تمہارا مولیٰ ہے اور سب سے اچھا مددگار ہے۔ (536)

[البقرۃ: 217:2] ''اور وہ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے لوٹا دیں اگر انہیں طاقت ہو۔'' اور یا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی رائے کو دین کے بارے میں مت قبول کرو اور ان کو اپنے خیر خواہ سمجھ کر ان کے پیچھے نہ چلو۔ [فِيْمَا يَأْمُرُوْنَكُمْ بِهٖ وَفِيْمَا يَنْهَوْنَكُمْ عَنْهُ تَقْبَلُوْا رَأْيَهُمْ فِيْ ذٰلِكَ](ج) اور فی الحقیقت دونوں معنی درست ہیں۔ اگر مسلمانوں کو کفار کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے یا وہ کہیں میدان جنگ میں غالب بھی آ جائیں تو مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ فوراً ہمت ہار کر ان کی اطاعت قبول کر لیں اور امور دینی میں بالخصوص اور ہر حال میں کافروں کے تتبع سے بچنا چاہیے۔ ﴿الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ سے مراد بعض نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو لیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منافق مراد ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو کہا کہ اپنے بھائیوں کی طرف لوٹ جاؤ اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ۔ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ آیت دونوں پر صادق آتی ہے۔ اور حسن کا قول ہے یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شبہات ڈال کر دین اسلام سے منحرف کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ تُطِيْعُوا کے دوسرے مفہوم کے لحاظ سے درست ہے اور بعض نے کہا کہ یہ آیت عام ہے اور صحیح یہی ہے کیونکہ ہر زمانہ میں ہی کافر ایک یا دوسرے معنی کے لحاظ سے اسلام کے خلاف لگے رہتے ہیں۔

536- **آنحضرت ﷺ کی غیرت توحید باری کی ایک مثال:** بخاری میں ہے کہ اُحد کے دن جب مسلمان بہت سا نقصان اٹھا کر آخر پھر ایک جگہ آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہو گئے اور آنحضرت ﷺ زخموں سے نڈھال ہو کر گر گئے تھے اور آپ کی وفات کی خبر بھی دشمنوں میں مشہور ہو چکی تھی تو ابوسفیان نے میدان سے واپس ہوتے وقت بلند آواز سے کہا کہ کیا قوم میں محمد ﷺ ہیں۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا کیا قوم میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا قوم میں عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب ہیں اور ساتھ ہی کہا اگر یہ لوگ زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم سب تم کو ذلیل کرنے کے لیے زندہ ہیں۔ تب ابوسفیان پکارا [أُعْلُ هُبَلْ] یعنی ہبل کی جے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس کو جواب دو [اَللّٰهُ أَعْلٰى وَأَجَلُّ]۔ اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے زیادہ جلال والا ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا [لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ]۔ ہمارا (بت) عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس کو جواب دو اور کہو [اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ] اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ آیت کے الفاظ ﴿بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ﴾ میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو توحید الٰہی کے لیے کس قدر غیرت تھی۔ جب اپنی زندگی یا موت کا سوال ہوا تو خاموشی کا حکم دیا لیکن جب بت کی بڑائی کی گئی تو چونکہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر حملہ تھا اس لیے آپ نے فوراً جواب دینے کا حکم دیا اور بتایا کہ ہم یعنی مسلمان کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہمارا مولیٰ اور مددگار اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بالآخر کافر ہی ذلیل ہوں گے۔ گو درمیان میں وہ مسلمانوں کو کچھ نقصان بھی پہنچا لیں۔

سَنُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ بِمَاۤ اَشۡرَکُوۡا بِاللّٰہِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ سُلۡطٰنًا ۚ وَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئۡسَ مَثۡوَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾

ہم عنقریب ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے جو کافر ہوئے اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا ہے جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری، اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کی کیا ہی بری جگہ ہے۔ (537)

537- الرُّعۡبَ۔ رُعۡبٌ انقطاع ہے جو خوف سے بھر جانے سے پیدا ہو۔ اسی لیے باعتبار بھرنے کے [رَعَبۡتُ الۡحَوۡضَ] کے معنی ہیں میں نے حوض کو بھر دیا اور باعتبار انقطاع کے [رَعَبۡتُ السِّنَامِ] کے معنی ہیں میں نے سنام کو کاٹ دیا۔ (غ)

سُلۡطَانٌ۔ اس کا مادہ سَلَطٌ ہے اور سَلَاطَةٌ کے معنی ہیں غالب آ کر مضبوط ہو جانا اور اسی معنی میں سلطان آتا ہے۔ جیسے: ﴿وَ مَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِیِّہٖ سُلۡطٰنًا﴾ [بنی إسرائیل: 33:17] ''اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا ہے۔'' ﴿اِنَّہٗ لَیۡسَ لَہٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ [النحل: 99:16] ''کیوں کہ اس کا کوئی غلبہ ان لوگوں پر نہیں جو ایمان لائے۔'' ﴿اِنَّمَا سُلۡطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَوَلَّوۡنَہٗ﴾ [النحل: 100:16] ''اس کا غلبہ صرف انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو اسے دوست بناتے ہیں۔'' ﴿لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ﴾ [الرحمن: 33:55] ''تم نہیں نکل سکتے، مگر غلبہ کے ساتھ۔'' (غ) اور حُجَّةٌ یعنی دلیل کو سلطان اس لیے کہا گیا ہے کہ دلوں کو وہ پکڑ لیتی ہے اور ان پر غالب آ جاتی ہے لیکن اس کا تسلط بیشتر اہل علم و حکمت پر ہوتا ہے۔ (غ)

مَاۡوٰی۔ [أَوٰی إِلٰی کَذَا] کے معنی ہیں [اِنۡضَمَّ اِلَیۡہِ] اس کے ساتھ یا اس کی طرف مل گیا۔

مَثۡوٰی۔ ثَوِیَ سے ہے اور ثَوَاءٌ کے معنی ہیں استقرار کے ساتھ ٹھہرنا یا قرارگاہ بنا کر ٹھہرنا۔ (غ)

واقعات سے ظاہر ہے کہ اُحد کے میدان میں باوجود مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچانے کے **کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب تھا**۔ ان کو صاف معلوم ہو گیا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ بھی زندہ ہیں، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی زندہ ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث سے ظاہر ہے جس کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے۔ تاہم ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہو گئے ہیں تو اس نے اپنی بہتری اسی میں دیکھی کہ فوراً مکہ کی راہ لے اور یہ بھی بعض روایات میں آیا ہے کہ رستہ میں خود ان کو اپنی کرتوت پر ندامت بھی ہوئی اور انہوں نے باہم کہا کہ ہم نے اچھا نہیں کیا اور بغیر استیصال کے مسلمانوں کو چھوڑ آئے مگر پھر بھی اس رعب کی وجہ سے لوٹ نہ سکے بلکہ الٹا نبی کریم ﷺ نے ان کا تعاقب اگلے دن حمراء الاسد تک کیا اور پھر رعب کی وجہ سے ہی تھا کہ اگلے سال باوجود وعدہ کر جانے کے ابوسفیان مقابلہ کے لیے نہ نکلا۔ اور جنگ احزاب میں جب دس ہزار آدمیوں کو ساتھ لے کر آیا تب بھی راتوں رات یہ عظیم الشان لشکر جس کے سامنے مسلمانوں کی کوئی حقیقت نہ تھی بھاگ اٹھا۔ اور پھر اس کے بعد تو ایسے مرعوب ہوئے کہ نہ صرف خود ان کے حملوں کا انقطاع ہو گیا بلکہ جب آٹھویں سال ہجرت میں نبی

وَ لَقَدۡ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ اِذۡ اللہ نے یقیناً اپنا وعدہ تم سے سچا کر دکھایا جب تم اس کے

کریم ﷺ نے ان کی عہد شکنی کی وجہ سے دس ہزار صحابہ کے ساتھ چڑھائی کی تو وہ کچھ بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ غرض ایک چھوٹی سی جماعت کے سامنے سارے ملک کا عاجز آ جانا اسی رعب خداوندی کی وجہ سے تھا۔

آنحضرت ﷺ کا رعب آپ کی خصوصیات میں سے ہے:

کئی صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی جو خصوصیات دیگر انبیاء علیہم السلام پر بیان کی ہیں ان میں آپ کو رعب کا دیا جانا بھی ہے۔ چنانچہ یہ حدیث متفق علیہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ [نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ] (صحيح البخاری، كتاب التيمم، باب1: حديث: 335) میری امداد ایک مہینہ کی مسافت کے برابر رعب سے کی گئی ہے۔ اور یہ رعب کوئی فرضی بات نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی آپ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی اور ایک مدت تک مسلمانوں کی حالت اس کا کھلا کھلا نقشہ پیش کرتی ہے۔ حتیٰ کہ آج سے ایک صدی پیشتر تک یورپ کی عورتیں اپنے بچوں کو ترکوں کے نام سے ڈراتی تھیں۔ گو وہ ان سے مسیرت شہر کے فاصلہ سے بھی زیادہ دور تھے۔ اور آج مسلمانوں کی اس گئی گزری حالت میں بھی اکثر عیسائی مدبرین کی یہ حالت ہے کہ وہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح کمزور کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی قوت سے ڈرتے ہیں۔ کہیں پین اسلامزم کا ایک فرضی بت بنا کر اس سے یورپ خائف ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی سیاسی طاقت جو کچھ ہے اس سے اتنی بڑی عظیم الشان سلطنتوں کا خائف ہونا جو کروڑوں کی تعداد میں افواج رکھتی ہیں اور جن کے آہن پوشوں ان کے ہوائی جہازوں اور ان کی سترہ انچ دہانوں کی توپوں کے سامنے مسلمان بالکل نہتے ہیں ایک مضحکہ انگیز خیال ہے۔ ایسا ہی حالانکہ مسلمان اپنے دین کی اشاعت سے بالکل غافل ہیں اور قریباً ایک مردگی کی حالت کو پہنچے ہوئے ہیں مگر عیسائی مشنوں کو اگر کسی مذہب کا خوف ہے تو وہ اسلام ہے۔ یہ رعب حق ہے اور یہ اسی طرح رہے گا کیونکہ مخبر صادق کے الفاظ غلط نہیں ہو سکتے اور خدائی وعدہ جھوٹ نہیں ہو سکتا۔

اس رعب کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرما دی ﴿بِمَآ اَشۡرَكُوۡا بِاللّٰهِ﴾ اس لیے کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ مشرک بزدل اور کمزور ہوتا ہے کیونکہ جو شخص ادنیٰ سے ادنیٰ طاقت کے سامنے سر جھکا دینے کو تیار ہے حتیٰ کہ بادو باراں کی اور دوسری ارضی وسماوی طاقتیں تو ایک طرف رہیں بے جان چیزوں جیسے پتھروں اور بتوں اور مردہ انسانوں کو بھی اپنا خدا سمجھ کر ان کی عبادت کرتا اور ان سے دعائیں کرتا ہے اس کا دل کمزور ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک خدا پر ایمان رکھنے والا موحد مسلمان ایک اللہ تعالیٰ کی طاقت کو ہی اپنے اوپر سمجھتا ہے۔ باقی سارے عالم کی طاقتوں کو وہ اپنے نیچے سمجھتا ہے۔ اس لیے چونکہ حقیقی طور پر کسی چیز سے اس کا دل خائف نہیں ہوتا وہ قوی القلب ہوتا ہے اور ساری دنیا کی مخالفت کی بھی اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔

تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ اذن سے ان کو کاٹ رہے تھے،(538) یہاں تک کہ تم

538- تَحُسُّوْنَ۔ حَسَّ سے ہے حَاسَّةٌ اس قوت کا نام ہے جس کے ساتھ اعراض حسیہ کا ادراک ہوتا ہے۔ مفردات میں ہے اَحْسَسْتُ کا استعمال دوطرح پر ہوتا ہے۔ ایک قوت حاسہ کے ساتھ ایک چیز کو پالینا [دیکھو نمبر: 440]۔ اور دوسرا کسی چیز کے حاسہ کو لے لینا جس سے اس کا قتل مراد ہے۔ اس لیے حَسَسْتُهُ کے معنی قَتَلْتُهُ آتے ہیں اور حَسِيْسٌ، قَتِيْلٌ کو کہتے ہیں۔

ابتدائے جنگ میں کفار کا شکست کھا جانا اور وعدہ نصرت الٰہی کا پورا ہونا: یہاں سے جنگ اُحد کے واقعات کا ذکر پھر شروع ہوتا ہے۔ تیرھویں رکوع کی ابتدا میں کہا تھا ﴿وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ [آل عمران: 121:3] ''اور جب تو سویرے اپنے گھر والوں سے چلا مومنوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر بٹھاتا تھا'' دوسرا واقعہ وہیں فرمایا تھا ﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا﴾ [آل عمران: 122:3] ''جب تم میں سے دو گروہوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں۔'' تیسرا واقعہ تھا ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ﴾ [آل عمران: 124:3] ''جب تو مومنوں سے کہتا تھا کہ کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں تمہارا ربّ تین ہزار اتارے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے۔'' اس کے بعد اب چوتھے واقعہ کا ذکر فرماتا ہے ﴿وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ اور درمیان میں وعظ و نصیحت کو بیان کیا ہے اور مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنے کا سامان اور کامیابی کی راہیں بتائی ہیں اور یوں ملائکہ کی نصرت کے وعدے کے بعد گویا اب فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ وعدہ سچا بھی کر دکھایا اور اصل غرض کو ﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ﴾ میں بیان کیا ہے یعنی تم نے ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ لیکن باوجودیکہ صاف فرمایا کہ تین ہزار ملائکہ سے تمہاری نصرت کریں گے اور پھر صاف فرمایا کہ وہ وعدہ بھی ہم نے سچ کر دکھایا یعنی ملائکہ کو نازل بھی فرما دیا۔ مگر یہ کس طرح ہوا ﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ جب اللہ تعالیٰ کے خاص ارادہ سے تم نے انہیں قتل کرنا شروع کیا۔ یہ نہیں کہ ملائکہ نے انہیں قتل کرنا شروع کیا بلکہ تم مسلمانوں نے قتل کرنا شروع کیا۔ گویا ملائکہ صرف معاون ہیں یا کفار کے دلوں میں رعب ڈالنے والے ہیں جیسا ﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ سے ظاہر ہے۔ اور جنگ کرنے والے کافروں کو قتل کرنے والے مسلمان ہیں۔

مسلمانوں کا کافروں کو قتل کرنا اور یہاں تک قتل کرنا کہ وہ میدان جنگ سے بھاگ اٹھے تاریخی واقعات ہیں۔ کفار کے لشکر کو مسلمانوں نے یہاں تک تہہ تیغ کیا کہ ان کا صاحب لواء مارا گیا بلکہ نو آدمی جن کے ہاتھ میں یکے بعد دیگرے جھنڈا آیا سب مارے گئے۔ اور یہ بھی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اس لوگ قدر زخمی ہو گئے تھے کہ آخر سواریوں کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پیٹھوں پر اٹھا کر لے گئے اور کثرت سے زخمی ہو جانے کی وجہ سے ہی ان کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ باوجود مسلمانوں کے منتشر ہو جانے کے ان کا استیصال کر سکتے یا ان کو قید ہی کر لیتے اور یہ جو بعض عیسائی مورخوں نے لکھ دیا ہے کہ فی الحقیقت کوئی شکست کفار کو نہ ہوئی تھی بلکہ یہ ان کی ایک چال تھی۔ کوئی واقعہ جنگ کا اس کی تائید نہیں کرتا۔ جن کی تباہی کے لیے اس قدر سامان کر کے کر آئے ہوں ان کا اسی طرح میدان جنگ میں چھوڑ کر چلے جانا صاف بتاتا ہے کہ یہ چال کوئی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی غلطی سے خالد نے ایک فائدہ اٹھایا۔ اور صحیح روایات سے ثابت ہے کہ فی الواقع ان کا لشکر ہزیمت اٹھا چکا تھا اور

وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ

نے نامردی کی اور حکم میں جھگڑا کیا اور نافرمانی کی اس کے بعد کہ جو کچھ تم پسند کرتے تھے تم کو دکھا دیا۔(539) تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ تم میں

قرآن کریم نے یہ صاف دعویٰ کیا ہے۔

539- تَنَازَعْتُمْ۔ نَزَعَ کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کے جائے قرار سے کھینچ لینا اور اعراض پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے دل سے محبت یا عداوت کے نکال دینے پر ﴿وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ [الأعراف: 43:7] ''اور جو کچھ ان کے سینوں میں رنج ہوں گے ہم نکال دیں گے۔'' اور سلب یا ایک چیز کے لے لینے پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے: ﴿تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ [آل عمران: 26:3] ''جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔'' اور تنازع اور مَنَازِعَةٌ کے معنی ہیں ایک دوسرے کو کھینچنا اور مراد اس سے مخاصمت اور مجادلہ ہے یعنی ایک دوسرے سے جھگڑنا۔ (غ) گویا ہر جھگڑنے والا دوسرے کو اپنی جگہ سے کھینچتا ہے۔

<u>یہ جنگ کی پانچویں حالت کا ذکر ہے</u>۔ فَشِلْتُمْ اور تَنَازَعْتُمْ اور عَصَيْتُمْ سب میں اصل ذکر صرف تیراندازوں کے گروہ کا ہے گو بظاہر مخاطب سب نظر آتے ہیں۔ قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ جب قوم کے **<u>بعض افراد کے کسی کام کا اثر کل قوم پر</u>** پڑے تو وہ کل قوم کا ہی ذکر کرتا ہے۔ جو کچھ تیراندازوں نے کیا اس کا خمیازہ سارے مسلمانوں کو اٹھانا پڑا اس لیے سب کو ہی مخاطب کر لیا ہے۔

تیراندازوں کی پہلی حالت کو فَشِلْتُمْ سے تعبیر کیا ہے یعنی تم میں بزدلی ظاہر ہوئی۔ یہ بزدلی دشمن کے مقابلہ کے معاملہ میں نہ تھی بلکہ جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے مال غنیمت کے خیال کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی نافرمانی تھی۔ یہ درحقیقت بڑی بزدلی تھی کہ تھوڑے سے دنیوی فائدہ کے سامنے دل کمزور ثابت ہوا۔ پھر ان کی دوسری حالت کو ﴿تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔ امر سے مراد نبی کریم ﷺ کا امر ہے۔ جس میں آپ نے صاف طور پر فرمایا تھا: [لاَ تَبْرَحُوا، إِنْ رَأَيْتُمُونَا ظَهَرْنَا عَلَيْهِمْ فَلاَ تَبْرَحُوا وَإِنْ رَأَيْتُمُوهُمْ ظَهَرُوا عَلَيْنَا فَلاَ تُعِينُونَا] (صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب غَزْوَةِ أُحُدٍ: 4043) ''تم نے اپنی جگہ کو نہیں چھوڑنا اگر تم دیکھو کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں تو اپنی جگہ نہ چھوڑو اور اگر دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ گئے ہیں تو تم ہماری مدد کے لیے نہ آؤ۔'' اور تنازع یوں واقع ہوا ہے کہ جب تیراندازوں نے دیکھا کہ دشمن بھاگ گیا یہاں تک کہ ان کی عورتیں پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر بھاگیں جیسا کہ شدت کے وقت کی حالت ہوتی ہے تو تیراندازوں نے کہنا شروع کیا [اَلْغَنِيْمَةُ اَلْغَنِيْمَةُ]۔ ان کے امیر نے انہیں سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے مگر اس وقت تھوڑے سے لالچ نے حکم کی تاویل کرا دی۔ پچاس تیراندازوں میں سے چالیس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ پس یہ تنازع بھی باہم تیراندازوں کا تھا اور کوئی تنازع قطعاً ثابت نہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات تیراندازوں کے متعلق ہیں۔

يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ — سے وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے،(540) پھر تم کو ان سے ہٹا

لِيَبۡتَلِيَكُمۡ ۚ وَ لَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ — دیا تاکہ تمہیں امتحان میں ڈالے(541) اور یقیناً اس نے

تیسری حالت ان کی یہ ہے کہ وہ نافرمانی کے مرتکب ہو گئے یعنی اپنی جگہ کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ نافرمانی کرنے والے صرف چالیس آدمی تھے۔ مگر یہاں بھی سب کے متعلق ہی فرمایا عَصَيۡتُمۡ تم نے نافرمانی کی کیونکہ ان کی نافرمانی کا اثر سب پر پڑا۔

540- **مال غنیمت کے حصول کو غرض بنانا خلاف تعلیم قرآنی ہے:** ان الفاظ میں انہی تیراندازوں کے دو گروہوں کا ذکر صاف الفاظ میں ہے ﴿مِّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا﴾ وہ گروہ ہے جو مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ گیا اور حکم کی نافرمانی کی اور ﴿مِّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ﴾ میں عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے وہ ساتھی داخل ہیں جنہوں نے اپنی جگہ کو نہیں چھوڑا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مال غنیمت کو لینا گو اسلام نے جائز رکھا ہے مگر اس کو حاصل کرنے کی غرض کو مدنظر رکھنے والوں کو ﴿يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا﴾ کا خطاب دیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے سبق ہے جو اسلام پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس کی جنگیں مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے تھیں۔ ایسی غرض کو قرآن کریم صریح الفاظ میں ایک گرا ہوا خیال قرار دیتا ہے اور جن لوگوں کے دل میں کبھی ایسا خیال آیا ان کو کیسے سخت الفاظ میں سرزنش کی ہے۔

541- **صحابہ رضی اللہ عنہم کی جانفشانی اور شجاعت کا اظہار:** یہ جنگ کی چھٹی حالت ہے۔ جب تیراندازوں میں جھگڑا ہوا اور ان کا کثیر حصہ نافرمانی کا مرتکب ہوا تو پہلا نقشہ ﴿اِذۡ تَحُسُّوۡنَهُمۡ بِاِذۡنِهٖ﴾ کا یعنی مسلمانوں کے کافروں کو قتل کرنے کا بدل گیا اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کفار سے ہٹا دیا۔ یعنی پہلے کافر بھاگ رہے تھے اور مسلمان ان کو مار رہے تھے۔ اب مسلمان بھاگ رہے ہیں اور کافر ان کو مار رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہٹانا منسوب کیا ہے نہ اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے زبردستی مسلمانوں کو پکڑ کر ہٹا دیا تھا بلکہ اس لیے کہ جب ایک گروہ نے غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ بموجب قانون الٰہی ساری قوم کو بھگتنا پڑا۔ تو چونکہ یہ ایک غلطی کی سزا تھی جو اللہ تعالیٰ نے دی اس لیے اس کا فاعل اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے۔ مگر یہ سزا ایک رحمت کے رنگ میں تھی اور اس کی اصل غرض جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے یہ تھی کہ تا جن لوگوں کے اندر کوئی کمالات ہیں ان کا اظہار ہو جائے اور جن کے اندر کچھ کمزوری ہے یا جن کے اندر کچھ خباثت ہے ان کی کمزوری یا خباثت ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ جانفشانی، جوانمردی، شجاعت اور ہمت کا اظہار جو کچھ صحابہ نے اس میدان میں کیا اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ باوجود اس خبر کے کہ محمد رسول اللہ ﷺ قتل ہو گئے وہ دشمن کے مقابلہ سے رکے نہیں اور قتال میں مصروف رہے رسول اللہ ﷺ پر ابن قمہ حملہ کرنے لگتا ہے تو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ صرف رسول اللہ ﷺ کو بچانے کے لیے اپنا سر کٹوا لیتے ہیں۔ ایک شخص تلوار کا وار آنحضرت ﷺ پر کرتا ہے تو طلحہ رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ آگے کر کے کٹوا لیتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کو بچا لیتے ہیں۔ صحابہ ایک آہنی دیوار سے زیادہ مضبوط دیوار کی طرح نبی کریم ﷺ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس آہنی دیوار میں سے جب ایک شخص گرتا ہے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے اور دشمن اپنی سخت سے سخت کوششوں کے باوجود نبی کریم ﷺ تک جن کا قتل کرنا اس کا

ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ تمہیں معاف کر دیا اور اللہ مومنوں پر فضل والا ہے۔ (542)

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَ لَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ جب تم دور نکلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف التفات نہ کرتے تھے اور رسول تمہیں تمہارے پیچھے بلاتا تھا۔ (543)

اصل مقصد تھا پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ دشمن کی طرف پیٹھ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں ان کے مقابل پر پانچ یا دس آدمیوں کے بھاگ جانے پر کیا سات سو صحابہ پر بزدلی کا الزام کوئی عقلمند دے سکتا ہے البتہ خبیث طبع منافقین اور یہودیوں کی خباثت اس سے ظاہر ہو گئی۔

542- ﴿وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ﴾ تم کو معاف کر دیا۔ یعنی غلطی تو ایسی خطرناک تھی کہ معمولی حالات میں ایک قوم کے استیصال کے لیے کافی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ چونکہ مومنوں پر فضل کرتا ہے اس لیے اس نے اس غلطی کی پوری سزا تم پر وارد نہیں کی بلکہ عفو سے کام لیا اور تم کو استیصال سے بچا لیا۔ یہاں [عَفْوٌ عَنِ الْاِسْتِئْصَالِ] مراد ہے۔ (ر) اور اگر عفو گناہ مراد ہے تو یہاں تیر اندازوں کی نافرمانی پر عفو کا ذکر ہے اور دوبارہ جو [آیت: 155] میں ﴿وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ آتا ہے تو وہ بھاگنے والوں سے عفو کرنا ہے۔

ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے بڑے بھاری گناہوں کو جن کو کبیرہ گناہ کہنا چاہیے۔ انسان کی بعض دوسری خوبیوں کی وجہ سے بلا توبہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کی صفات میں دوسری جگہ آتا ہے ﴿غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ﴾ [المؤمن: 3:40] ''(بغیر توبہ) گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا۔''

543- تُصْعِدُوْنَ۔ صَعَدٌ سے ہے اور صعود کے معنی ہیں بلند مکان میں جانا۔ (غ) اور اِصْعَادٌ (جس سے یہاں تُصْعِدُوْنَ آیا ہے) زمین میں دور نکل جانا ہے خواہ اوپر کی طرف جا رہا ہو یا نیچے کی طرف۔ (غ) گو اس کا اصل صعود سے ہی ہے۔ یعنی بلند مقامات کی طرف جانے سے لیکن پھر صرف دور نکل جانے پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ گو اس میں صعود یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار نہ ہو۔ امام راغب نے اسی کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کی مثال انہوں نے تَعَالَ سے دی ہے جس کی اصل علو سے ہے؛ مگر اب اس کے معنی محض آنا ہیں اور بعض کے نزدیک اصعاد سے مراد [اِبْعَادٌ فِي الْاَرْضِ] نہیں۔ بلکہ اس سے اشارہ کیا ہے کہ جس بات کا انہوں نے قصد کیا اور جس کی طرف گئے اس میں انہوں نے علو اختیار کیا یعنی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ (غ)

تَلْوٗنَ۔ لَوَی کے اصل معنی [فَتْلِ حَبْلٌ] یعنی رسہ کا بٹنا ہے مگر [لَوَّيْتُ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں عَطَفْتُ۔ (ل) میں اس کی طرف مڑا؛ اور حدیث میں آتا ہے [لَا يَلْوِيْ اَحَدٌ عَلٰى اَحَدٍ] جس کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں اس کی طرف التفات نہیں کرتا تھا اور نہ اس کی طرف پھر کر دیکھتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت:

﴿فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ﴾ سے مراد یا تو [فِيْ جَمَاعَتِكُمُ الْاُخْرٰى] یعنی تمہاری پچھلی جماعت میں گویا ایک جماعت آگے نکل گئی

غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

پھر تم کو ایک غم کے بدلے (دوسرا) غم دے دیا تاکہ تم اس پر غمگین نہ ہو جو تم سے جاتا رہا نہ اس (مصیبت) پر جو تمہیں پہنچی، اور اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔ (544)

اور رسول اللہ ﷺ ایک گروہ میں پیچھے رہ گئے تھے اور یا اس سے مراد [فِيْ وَرَائِكُمْ] ہے یعنی تمہاری پچھلی طرف کیونکہ [جَاءَ فُلَانٌ فِيْ اٰخِرِ النَّاسِ وَ اُخَرَاهُمْ] کے معنی ہوتے ہیں [جَاءَ خَلْفَهُمْ] ان کے پیچھے آیا۔

یہ جنگ کا ساتواں مرحلہ تھا کہ جب مسلمان دشمن کی زد میں آ کر بھاگ اٹھے اور رسول اللہ ﷺ ان کو اجتماع کے لیے بلا رہے تھے اور بآواز بلند کہہ رہے تھے [اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ أَنَا رَسُولُ اللّٰهِ] (روح المعانی:جلد4، صفحہ 91) ''اے اللہ کے بندو! میری طرف آ جاؤ میں اللہ کا رسول ہوں۔'' ایسے خطرناک موقعہ پر اپنے آپ کو آگے بڑھانا اور دشمن کے حملہ کی زد میں لانا نبی کریم ﷺ کی کمال شجاعت کو دکھاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو اللہ کی نصرت پر کس قدر بھروسہ تھا کہ میدان جنگ میں دشمن کے غلبہ کے وقت آپ سب سے آگے ہوتے اور گویا دشمن کو اپنے اوپر حملہ کرنے کے لیے بلاتے ہیں۔ یہی نقشہ آپ کی قوت قلبی کا میدان حنین میں نظر آتا ہے۔ جب مسلمانوں کی جمعیت دشمن کی تیراندازی کی وجہ سے پریشان ہوگئی اور لوگ بالکل تاب مقابلہ نہ لا کر منتشر ہوئے ہوئے بھاگ رہے تھے تو اس وقت آپ دشمن کی صفوں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھ رہے تھے [أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ، أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ] (صحیح البخاری، کتاب الجهاد، باب مَنْ قَادَ دَابَّةَ غَيْرِهِ فِي الْحَرْبِ: 2864) ''میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔'' اُحد کے میدان میں منتشر فوج کو جمع کرنے کے لیے آپ نے اپنی جان کی پروا نہیں کی اور اس طرح یہ نمونہ دکھایا کہ ایک جرنیل کو میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح آگے کرنا چاہیے اور اپنے سپاہیوں کو یہ دکھانا چاہیے کہ وہ اپنی جان کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ نبی کریم ﷺ کی اس آواز کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے آپ کے گرد جمع ہونا شروع کیا اور ان کی منتشر جمعیت مجتمع ہوگئی۔

544- اَثَابَكُمْ۔ اَثَابٌ کے معنی اصل میں جزا دینا یا ایک فعل کے نتیجہ کا لوٹا کر لانا ہے [دیکھو نمبر: 131]۔ مگر بعض وقت صرف دینے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے [اَثَابَهُ اللّٰهُ ثَوَابَهُ] میں اَثَابَهُ کے معنی صرف اَعْطَاهُ ہیں۔ (ل) یعنی اس کو دیا اور ثواب چونکہ خیر اور شر دونوں میں استعمال ہوتا ہے اس لیے غلطی کی سزا پر بھی اَثَابَهُ بولا جا سکتا ہے۔

غَمًّا۔ غَمٌّ کے اصل معنی [سِتْرُ الشَّيْءِ] ہیں کسی چیز کا ڈھانک لینا اسی لیے غَمَامٌ بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سورج کی روشنی کو ڈھانک لیتا ہے اور غم کو غم اس لیے کہا جاتا کہ وہ لذت و سرور کو ڈھانک لیتا ہے۔

بِغَمٍّ۔ ب مصاحبت کے لیے ہے اور معنی یوں ہوں گے کہ تمہاری غلطی کی سزا میں ایک غم کے ساتھ دوسرا غم دیا اور یا معاوضہ کے لیے ہے اور معنی یوں ہوں گے کہ ایک غم کے بدلے دوسرا غم دیا۔ پہلا غم تو یہ تھا کہ ان کے ہاتھ سے شکست خوردہ دشمن نکل گیا اور

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً پھر غم کے بعد تم پر امن نازل کیا (یعنی) اونگھ جس نے تم

مسلمان مارے گئے اور زخمی ہوئے اور دوسرا غم یہ تھا کہ دشمن کا حملہ [اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ] کہنے پر نبی کریم ﷺ پر ہو کر آپ کو سخت زخم لگے اور قریب تھا کہ آپ کو شہید کر دیا جاتا۔ بلکہ جھوٹ طور پر آپ کے قتل کی افواہ بھی اڑائی گئی۔

﴿مَا فَاتَكُمْ﴾ فوت کسی چیز کا انسان سے اس طرح دور ہو جانا ہے کہ اس کا پانا محال ہو جائے۔ پس ﴿مَا فَاتَكُمْ﴾ سے مراد وہ فوائد ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتے رہے اور وہ فتح کے ثمرات تھے، مال غنیمت کا ہاتھ آنا، دشمن کا قید کرنا وغیرہ۔

﴿مَآ اَصَابَكُمْ﴾ مسلمانوں کی اپنی مصیبت اور ان کا زخمی ہونا اور مارا جانا۔

ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک غم کی جگہ یا ایک غم کے ساتھ دوسرا غم تم کو دے دیا تاکہ تم غم نہ کرو نہ اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور نہ اس پر جو تم کو مصیبت پہنچی۔ یہ جنگ احد کا آٹھواں مرحلہ ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت آنحضرت ﷺ سے: نبی کریم ﷺ کی آواز پر دشمن نے اپنے حملہ کا پورا زور رسول اللہ ﷺ پر ڈالا۔ اور قبل اس کے کہ صحابہ آپ کے گرد جمع ہو سکیں آپ کو سخت زخم پہنچے یہاں تک کہ آپ گر گئے۔ ادھر اس آواز نے منتشر ہوئے ہوئے مسلمانوں کو اکٹھا کر دیا۔ مسلمانوں کو پہلا غم تو یہ تھا کہ دشمن ان کے تعاقب سے بچ گیا اور الٹا ان کو مصیبت پہنچی مگر اب جو رسول اللہ ﷺ کی حالت کو دیکھا تو وہ اپنا غم بھول گئے اور اس کی جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ دوسرا غم دے دیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ بتایا کہ تا جو غنیمت تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور دشمن بچ کر چلا گیا اس پر تم کو افسوس نہ رہے اور نہ ہی جو دکھ اور مصیبتیں تم کو پہنچیں ان پر کچھ افسوس ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے جو محبت مسلمانوں کو تھی وہ ایسی شدید تھی کہ آپ کی تکلیف کو دیکھتے ہی انہیں اپنے سب غم بھول گئے۔ وہاں میدان جنگ میں تو مرد تھے جو رسول اللہ ﷺ کو ادنیٰ تکلیف سے بچانے کے لیے اپنی گردنیں کٹوانے کو تیار تھے بلکہ اسی میں راحت پاتے تھے۔ مدینہ میں عورتوں نے اپنے رشتہ داروں اور بیٹوں بھائیوں وغیرہ کی شہادت پر افسوس نہیں کیا جب ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک واقعہ ایک بی بی کا لکھا ہے کہ اسے خبر دی گئی کہ اس کا باپ اور اس کا بیٹا اور اس کا خاوند جنگ میں شہید ہو گئے تو اس نے دریافت کیا کیا رسول اللہ ﷺ زندہ ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ تو اس نے کہا [كُلُّ مُصِيْبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ] ''آپ کے بعد ہر ایک مصیبت ایک حقیر شے ہے۔'' یہ وہ محبت تھی جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ مرد اور عورتوں کو تھی۔ اور درحقیقت صحابہ کی محبت کا نقشہ ہی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے: [لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهِ وَوَالِدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ] (صحيح البخاری، كتاب الإيمان، باب حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الإِيمَانِ: 14) ''تم میں سے کوئی ایمان نہیں لاتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اس کے بیٹے اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔'' اس کامل ایمان کا نقشہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا تنہا یا نو یا سات آدمیوں کے ساتھ رہ جانا احادیث سے ثابت ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی سب لوگ

نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ

میں سے ایک گروہ کو ڈھانک لیا،(545) اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی فکر پڑ رہی تھی۔ وہ اللہ پر ناحق بدگمانی جاہلیت کی سی بدگمانی کرتے تھے۔ کہتے ہیں کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے؟ کہہ، اختیار تو سب کا سب اللہ کا ہی ہے۔(546) وہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپاتے ہیں جو

بھاگ گئے تھے بلکہ نبی کریم ﷺ ایک طرف اکیلے رہ گئے اور فوج منتشر حالت میں تھی اور اسی حالت میں نبی کریم ﷺ پر سخت حملہ ہوا یہاں تک کہ سات آدمی انصار میں سے یکے بعد دیگرے آپ کی حفاظت میں جنگ کرتے ہوئے مارے گئے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے جسم پر ستر سے زیادہ زخم آئے اور ان کی انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ اور آخر میں جب اُبی بن خلف نے نبی کریم ﷺ پر حملہ کیا تو آپ نے اپنا نیزہ اسے مارا اور ساتھ ہی یہ لفظ بھی فرمائے: [اشْتَدَّ غَضَبُ اللهِ عَلٰى مَنْ قَتَلَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِيَدِهِ فِي سَبِيلِ اللهِ] (صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب مَا أَصَابَ النَّبِيَّ ﷺ مِنَ الْجِرَاحِ يَوْمَ أُحُدٍ: 4074) ”اللہ کا سخت غضب اس شخص پر ہے جس کو رسول اللہ نے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں قتل کیا۔“ اور کسی جنگ میں آپ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا۔

545- اَمَنَةً۔ اَمْنٌ کی طرح مصدر ہے اور ترکیب میں اَنْزَلَ کا مفعول ہے۔

نُعَاسًا۔ نُعَاسٌ تھوڑی نیند کو کہتے ہیں جیسے اونگھ اور ایک قول یہ بھی ہے: [عِبَارَةٌ عَنِ السُّكُوْنِ وَالْهُدُوِّ] (غ) یعنی اس سے مراد سکون اور اطمینان ہے۔ یہاں نُعَاسًا اَمَنَةً سے بدل واقع ہوا ہے۔

یہ جنگ احد کا نواں مرحلہ ہے۔ مسلمان آنحضرت ﷺ کے گرد جمع ہو گئے اور کفار ان کے انتشار کو پھر اجتماع کے رنگ میں دیکھ کر میدان جنگ چھوڑ گئے اور مسلمان اسی میدان میں رہے اور دشمن کی طرف سے ایسے مطمئن ہوئے کہ بعض کو نیند آ گئی یا کامل سکون کی حالت وارد ہو گئی۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے گو تکلیف اٹھائی مگر شکست نہیں کھائی۔ کیونکہ میدان جنگ میں وہ موجود رہے اور ایسے اطمینان کی حالت میں تھے اور دشمن کی طرف سے ایسے بے خوف کہ بعض کو نیند بھی آ گئی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر دشمن کی طرف سے کچھ خوف وخطر ہوتا تو نیند نہ آ سکتی تھی۔ بعض احادیث میں جو یہ لفظ آتے ہیں کہ راوی کہتا ہے کہ میدان جنگ میں مجھے اس قدر نیند آئی کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑتی تھی اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ جب مجھے اونگھ آ رہی تھی تو میں نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں خواب میں سن رہا ہوں۔ (ث) ظاہر ہے کہ یہ جنگ کا خاتمہ ہے۔

546- اَهَمَّتْهُمْ۔ اَهَمَّتْ هَمٌّ سے ہے جس کے معنی غم یا حزن ہیں۔ اور جب کوئی امر تمہیں قلق وحزن میں ڈالے تو کہا جاتا ہے

مَّا لَا يُبۡدُوۡنَ لَكَ ؕ يَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ كَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا هٰهُنَا ؕ قُلۡ لَّوۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ لَبَرَزَ الَّذِيۡنَ كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمۡ ۚ وَ لِيَبۡتَلِىَ اللّٰهُ مَا فِىۡ صُدُوۡرِكُمۡ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ

تجھ پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں اگر ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے۔ کہہ، اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو جن کے لیے قتل ہونا لکھا جا چکا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے، اور تا کہ اللہ اسے ظاہر کر دے جو تمہارے سینوں میں ہے اور اسے خالص کر دے جو تمہارے دلوں میں ہے، اور اللہ سینوں کی

[اَهَمَّنِيَ الْاَمْرُ] (ل)

﴿يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ غَيْرَ الْحَقِّ یا مصدر کے حکم میں ہے ﴿غَيْرَ ظَنَّ الْحَقِّ﴾۔ اور ﴿ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ اس سے بدل ہے اور یا ﴿ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ مصدر مؤکد ہے اور [غَيْرَ الْحَقِّ يَظُنُّوْنَ] کی تاکید ہے۔

﴿ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ میں موصوف کی اضافت اس کی صفت کے مصدر کی طرف ہے اور مراد ہے [ظَنُّ الْمُخْتَصِّ بِالْجَاهِلِيَّةِ] یعنی ایسا ظن جو جاہلیت سے مخصوص ہے یا حذف مضاف پر مصدر کی اضافت فاعل کی طرف ہے اور مراد ہے [ظَنُّ اَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ] یعنی اہل جاہلیت کا سا ظن۔ اہل جاہلیت سے مراد مشرک لوگ ہیں کیونکہ جاہلیت کا زمانہ قبل اسلام کا زمانہ ہے۔

اَلْاَمْرُ سے مراد یا تو معاملہ ہے۔۔۔۔۔ یعنی اس معاملہ جنگ میں ہمارا کچھ دخل یا اختیار ہے اور یہی معنی میں نے اختیار کیے ہیں اور حکومت بھی بعض مفسرین نے مراد لی ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا وہ حکومت جس کا وعدہ محمد ﷺ دیتے ہیں ہمیں مل سکتی ہے۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ اُحد میں سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔

منافقوں کی چہ میگوئیاں:

یہ گروہ جن کو اپنی ہی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ منافقین کا گروہ تھا جو عبداللہ بن ابی کے ساتھ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی واپس ہو گیا تھا ان کو اسلام کی حفاظت سے بہت بڑھ کر اپنی فکر تھی کہ کہیں مارے نہ جائیں اس لیے وہ ساتھ شامل نہ ہوئے۔ ﴿يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ میں جس ظن کا ذکر ہے اس کی تصریح قرآن کریم نے خود دوسری جگہ فرما دی ہے جہاں منافقوں کے ایسے ہی ظنوں کا ذکر ہے: ﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا﴾ [الفتح: 12:48] ''بلکہ تم نے خیال کیا کہ رسول اور مومن اپنے گھر والوں کی طرف کبھی بھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔'' اُحد کی جنگ میں بھی منافقوں کو یہی خیال تھا کہ اتنے بڑے لشکر کے ہاتھ سے کھلے میدان میں مسلمان مارے جائیں گے۔ اب جو واقعات جنگ کی خبر ان کو پہنچی تو اور بھی باتیں بنانے لگے اور کچھ اپنے مشوروں کو اہمیت دینی شروع کی ﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ باتوں کو جاننے والا ہے۔(547)

شَیْءٍ﴾ ''ہمارا بھی اس معاملہ میں کچھ اختیار ہوتا'' یعنی اگر ہماری بات مان لی جاتی تو یہ تکلیف پیش نہ آتی۔ عبداللہ بن ابی کا مشورہ یہ تھا کہ مدینہ میں ہی رہ کر جنگ کی جائے۔ اب اس نے اپنے اس مشورہ کے درست ہونے پر زور دینا شروع کیا کہ اگر میری بات مان لی جاتی تو یہ مصیبت کیوں پیش آتی؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یوں دیا ہے کہ سب اختیار اللہ کا ہی ہے۔ کیونکہ شوریٰ اسی کا حکم ہے اور شوریٰ پر عمل کر کے ہی نبی ﷺ نے باہر نکلنے کا حکم دیا تھا۔ ایک تکلیف کے ڈر سے ایک اصول کو چھوڑنا درست نہیں۔ یہ وہ سبق ہے جو اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے اور یا مراد یہ ہے کہ جس حکومت میں سے تم کچھ حصہ چاہتے ہو وہ سب ہی اللہ تعالیٰ تمہیں دینے والا ہے۔

547- مَضَاجِع۔ مَضْجَعٌ کی جمع ہے اور ضَجْعٌ کے معنی لپٹ جانا یعنی اپنی کروٹ کو زمین کے ساتھ لگانا یا سو جانا ہیں۔ پس مَضْجَعٌ لیٹنے یا سونے کی جگہ ہے: ﴿تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ [السجدۃ: 16:32] ''ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں۔'' میں سونے کی جگہ ہی مراد ہے۔

صحابہ کی جان نثاری پر قرآن کی شہادت:

یہاں منافقوں کے دل میں جو خیال اٹھا اس کا ذکر کیا ہے اور اس کا جواب دیا ہے۔ فرمایا ان کے دل میں کچھ ہے جس کو ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں یعنی دل میں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا یعنی ہماری بات مان لی جاتی یا معاملہ جنگ میں ہم کو اختیار دے دیا جاتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے۔ ﴿مَّا قُتِلْنَا﴾ سے مراد ان کے بعض لوگوں کا قتل ہونا ہے۔ کیونکہ منافق ان لوگوں کے رشتہ دار ہی تھے جو میدان اُحد میں جنگ کر رہے تھے۔ ان کی ان بیہودہ گوئیوں کا یہ جواب دیا ہے کہ جن مسلمانوں نے جان نثاری کی ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں وہ تو خدا کی راہ میں اس طرح جان دینے کو تیار تھے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ ہوتی تو وہ کوئی اپنے گھروں میں چھپے نہ بیٹھے رہتے۔ بلکہ دشمن کے مقابلہ پر نکل کر جان نثاری کا سچا نمونہ دکھاتے ﴿لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ﴾ سے مراد یہی ہے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کرتے۔ ورنہ یوں تو منافق اپنے گھروں میں ہی رہے تھے۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ جو شہید ہوئے انہوں نے تو جان نثاری دکھائی اور خدا کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کر دیا، جنگ یہاں ہوتی یا وہاں وہ تو اسی طرح اپنے آپ کو قربان کر دیتے۔ اور اگر کہنے والا گروہ ان لوگوں میں سے ہو جو جنگ میں شامل تھے مگر ان کے دلوں میں کچھ کمزوری تھی تو مراد یہ ہوگی کہ اگر تم جنگ کے لیے نہ نکلتے تو تمہاری کمزوری کے سبب سچے مومن جنگ سے نہ رک جاتے اور قتل کفار کے لیے ضرور باہر نکل آتے اور خدا کی راہ میں جانیں دیتے، مگر جو کچھ ہوا وہ بے فائدہ نہیں ہوا۔

﴿وَ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ بغض سینوں کے اندر مخفی تھا وہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا جن دلوں میں منافقت اور کھوٹ تھا ان کا کھوٹ ظاہر ہو گیا اور جن کے دلوں میں بعض کمزوریاں تھیں ان کی تمحیص کر دی گئی یعنی ان کی کمزوریاں دور کر دی گئیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّهُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا ۚ وَ لَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۵۵﴾ ع 16 7 7

وہ لوگ جنہوں نے اس دن تم میں سے پیٹھ پھیر دی جس دن دو گروہ (جنگ میں) ملے شیطان نے ہی ان کی کسی کمائی کی وجہ سے ان کو پھسلانا چاہا، اور یقیناً اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے اللہ بخشنے والا حلم والا ہے۔ (548)

548- اِسۡتَزَلَّهُمُ۔ زَلَّ سے ہے زَلَّۃٌ اصل میں بلا قصد پاؤں کے پھسل جانے کو کہتے ہیں اور اِسۡتَزَلَّهُ کے معنی ہیں [تَحَرّٰی زَلَّتَهُ] (غ) یعنی اس کی زَلَّۃٌ کا قصد کیا۔ لفظ زَلَّۃٌ کو ان کی طرف منسوب کر کے بتا دیا کہ جو کچھ بھاگنے والوں سے ہوا وہ بلا قصد تھا ارادۃً وہ میدان جنگ کو چھوڑ کر نہیں بھاگے۔ مگر ﴿بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا﴾ میں بتا دیا کہ ان کا کچھ اپنا قصور بھی تھا۔ بعض مفسرین نے اس کو ان کی پہلی کسی غلطی پر لگایا ہے۔

جنگ اُحد میں بھاگنے والے:

یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو جنگ میں شامل تو ہوئے مگر میدان جنگ سے بھاگ گئے کیونکہ منافق ﴿الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ﴾ سے پہلے ہی واپس چلے گئے تھے۔ بھاگنے کے وجوہات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے کفار کا ہزیمت خوردہ لشکر لوٹا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تو مسلمانوں کی فوج بوجہ تعاقب کے پراگندہ حالت میں تھی اور یک مرتبہ ایک بڑی فوج کے حملہ کے سامنے وہ اپنی جمعیت کو قائم نہ رکھ سکے۔ اسی حالت میں نبی کریم ﷺ نے آواز دے کر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہا۔ مگر ایسی حالت میں سب کا جمع ہونا محال تھا۔ بعض لوگ بالکل علیحدہ ہو گئے اور ان کے لیے اصل جمعیت کے ساتھ ملنا مشکل ہو گیا۔ بعض ایسے لوگ میدان جنگ سے بھاگ گئے اور ان کے قدموں کو لغزش آ گئی۔ خواہ کچھ بھی واقعات ہوں میدان جنگ سے بھاگنا اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کے لیے پسند نہ تھا۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور انتظار کرتے تو اصل جمعیت کے ساتھ مل جاتے۔ ہر ایک کمزوری کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کی طرف ہی منسوب کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کو ذلت کہہ کر بتا دیا کہ وہ ارادۃً نہیں بھاگے تھے۔

ان بھاگنے والوں کی تعداد کس قدر تھی؟:

روایات میں عموماً قیاس سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیے بعض نے کہہ دیا ہے کہ فوج کی ایک تہائی بھاگ گئی تھی اور ایک تہائی مجروح ہو گئے تھے اور ایک تہائی نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہے۔ یہ بالبداہت غلط ہے کیونکہ سات سو کی کل جمعیت مسلمانوں کی تھی۔ اگر ان میں سے صرف دو سو آدمی نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہ گئے ہوتے تو تین ہزار کفار کی فوج ان کو میدان جنگ پر قابض چھوڑ کر مکہ واپس نہ ہو جاتی۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ چودہ یا سترہ آدمی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد صرف وہ آدمی ہیں جو کفار کے دوبارہ حملہ کی ابتدا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہ گئے تھے۔ کیونکہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَ قَالُوۡا لِاِخۡوَانِهِمۡ اِذَا ضَرَبُوۡا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ كَانُوۡا غُزًّى لَّوۡ كَانُوۡا عِنۡدَنَا مَا مَاتُوۡا وَ مَا قُتِلُوۡا ۚ لِيَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسۡرَةً فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَ اللّٰهُ يُحۡىٖ وَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کافر ہوئے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جب وہ زمین میں سفر کرتے ہیں یا لڑائی کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، اور نہ قتل کیے جاتے تا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں حسرت بنائے۔ اور اللہ زندہ کرتا اور مارتا

سب لوگ تعاقب میں مصروف تھے۔ امام رازی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہی درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: [وَالَّذِيْ تَدُلُّ عَلَيْهِ الْأَخْبَارِ فِي الْجُمْلَةِ أَنَّ نَفَرًا مِّنْهُمْ تَوَلَّوْا وَأَبْعَدُوْا، فَمِنْهُمْ مَنْ دَخَلَ الْمَدِيْنَةِ، وَمِنْهُمْ مَنْ ذَهَبَ اِلٰى سَائِرِ الْجَوَانِبِ وَأَمَّا الْاَكْثَرُوْنَ فَاِنَّهُمْ نَزَلُوْا عِنْدَ الْجَبَلِ وَاجْتَمِعُوْا هُنَاكَ] (تفسیر الرازی: جلد9، صفحہ 384) یعنی مختلف روایتیں جس بات پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک نفر بھاگ گئے تھے اور دور چلے گئے تھے اور عربی زبان میں نفر کا لفظ تین سے نو تک یا دس سے کم آدمیوں کے گروہ پر بولا جاتا ہے ان میں سے بعض مدینہ میں داخل ہوئے اور بعض دوسری اطراف میں بھاگ گئے لیکن کثیر حصہ فوج کا پہاڑ کے پاس ہی رہا اور وہیں جمع ہو گئے۔ اور یہی قول فضال کا ہے جس نے ان کو [نَفَرًا قَلِيْلًا] بھی کہا ہے۔ (غق)

بھاگنے والوں میں سے کون کون تھے:

اکثر روایات میں صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اور ان کے ساتھ دو انصار سعد اور عقبہ رضی اللہ عنہما کا نام پایا جاتا ہے کسی ایک آدھ نا قابل اعتبار روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام بھی ہے مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جنگ میں تھے۔ چنانچہ صحیح حدیث بخاری کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میدان جنگ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے بلکہ یہ بھی کہ آپ نے دشمن کے مقابلہ میں خاموش رہنا بھی گوارا نہیں کیا اور ابوسفیان کو جواب دیا کہ ہم سب تجھے ذلیل کرنے کے لیے خدا کے فضل سے موجود ہیں۔ ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھاگنے والوں میں سے تھے اور شیعہ اور خوارج نے یہ طعن آپ پر کیا ہے۔ گو یہ طعن تعجب کی جگہ ہے جب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: ﴿وَ لَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ﴾ جو کچھ بھی ان کا اس میں قصور تھا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے اس طعن کا ذکر ہوا، جو جواب آپ نے دیا وہی دہرا دینا کافی ہے۔ اس جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بدر اور بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونے کی وجوہ بھی درج ہیں۔

حضرت عثمانؓ پر طعن:

عثمان بن موہب سے روایت ہے انہوں نے کہا ایک شخص نے بیت اللہ کا حج کیا، اس نے وہاں کئی لوگوں کو بیٹھے دیکھا اور پوچھا یہ کون لوگ بیٹھے ہوئے ہیں؟ انہوں نے کہا قریش ہیں۔ اس نے کہا یہ بوڑھا ان میں کون ہے؟ انہوں نے کہا ابن عمر۔ سو وہ شخص

يُمِيۡتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۱۵۶﴾ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے۔(549)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ سے کچھ سوال کرتا ہوں کیا آپ بتلائیں گے؟ چنانچہ اس نے کہا میں تم کو اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ احد کے دن بھاگ گئے تھے؟ فرمایا ہاں۔ اس نے کہا کیا تم جانتے ہو وہ بدر کے دن غائب تھے اور اس میں شریک نہ تھے؟ فرمایا ہاں۔ کہا کیا تم جانتے ہو وہ بیعت رضوان سے پیچھے رہ گئے تھے اور اس میں شریک نہیں ہوئے؟ فرمایا ہاں اس شخص نے کہا اللہ اکبر (گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ مطاعن قائم کیے) ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا آؤ میں تم کو بتاؤں اور جو کچھ تم نے پوچھا ہے اس کو کھول دوں۔ اُحد کے دن ان کا بھاگ جانا سو میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا اور بدر کے دن ان کا غیر حاضر ہونا۔ سو بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ان کے گھر میں تھیں اور وہ بیمار تھیں۔ سو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کو تیمارداری کا حکم دیا اور) فرمایا کہ تم کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا ایک شخص کو جو اس جنگ میں شریک ہوگا اور ایک آدمی کا حصہ بھی مال غنیمت سے ملے گا۔ اور آپ کا بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونا۔ سو بات یہ ہے کہ اگر عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی عزت والا اور شان والا مکہ میں ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو مکہ والوں کی طرف بھیجتے۔ سو آپ نے عثمان کو ہی بھیجا اور بیعت رضوان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ کو جانے کے بعد ہوئی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اسے عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت قرار دیا۔ اب جا اور ان باتوں کو ساتھ لے جا یعنی یاد رکھ۔

549- لِاِخۡوَانِهِمۡ - ل تعلیل کے لیے ہے یعنی [لِاَجۡلِ اِخۡوَانِهِمۡ] اپنے بھائیوں کی خاطر۔ یا بمعنی فِیۡ یعنی ان کی بابت۔

﴿ضَرَبُوۡا فِى الۡاَرۡضِ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 88]۔ یہاں مراد زمین میں سفر تجارت یا طلب معاش کے لیے ہے۔

غُزًّی - غَازٍ کی جمع ہے جو غَزَا سے ہے اور غزوہ کے معنی ہیں دشمن کی جنگ کے لیے نکلنا۔ (غ) غَازٍ کے جو معنی مشہور ہیں کہ جو شخص کسی غیر مسلم کو قتل کر دے یا اس کے قتل کے لیے نکلے، یہ صحیح نہیں۔ بلکہ غازی وہ ہے جو دشمن کی جنگ کے لیے نکلے۔

﴿لِيَجۡعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسۡرَةً﴾ لام عاقبت ہے یعنی ان کا ایسی باتیں کرنے کا نتیجہ سوائے حسرت کے کچھ نہیں۔ اور یا یہ لام ﴿لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ کے متعلق ہے یعنی تمہارا ان جیسے نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ کافروں کے دلوں میں ایک حسرت رہے گی کہ یہ ہم سے کس طرح بڑھ گئے؟

مسلمانوں کو موت سے خائف نہ ہونا چاہیے:

اس آیت میں ﴿الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ کون ہیں؟ یا تو یہ لفظ عام ہیں اور واقعی کافر مراد ہیں، وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں۔ ان کے بھائی بند جب تجارت کے لیے یا دشمن کے ساتھ جنگ کے لیے نکلتے اور مارے جاتے تو ان کو افسوس ہوتا کہ کاش وہ باہر نہ نکلے ہوتے اور ہمارے پاس ہی رہتے، تو موت سے بچ جاتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ محض ایک حسرت ان کے دل میں رہ جاتی ہے جس کا فائدہ کچھ نہیں۔ کیونکہ ایسا کہنے سے کہ یوں کرتے تو ایسا ہوتا فائدہ کچھ نہیں۔ باقی رہی موت و حیات سو وہ اللہ

وَ لَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَوۡ مُتُّمۡ لَمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَحۡمَۃٌ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ یا مر جاؤ، تو اللہ کی مغفرت اور رحمت یقیناً اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

وَ لَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ لَاِ اِلَی اللّٰہِ

اور اگر تم مرجاؤ یا قتل کیے جاؤ تو یقیناً اللہ کی طرف ہی اکٹھے

تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے نہ گھر میں بیٹھنے والے سب موت سے بچے رہتے ہیں نہ باہر نکلنے والے سب مرجاتے۔ مسلمانوں کو منع کیا ہے کہ تم ایسے نہ ہوجاؤ۔ بلکہ زمین میں تجارت یا طلب معاش کے لیے سفر کرنے یا دشمن کی جنگ کے لیے نکلنے میں موت کا خوف کبھی تمہارے لیے روک نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کمزور دلوں کی باتیں ہیں جس کام کا کرنا ضروری ہے، خواہ اس میں موت آئے اس کو کرنا چاہیے۔ بات بات میں موت سے ڈرنے والے کمزور دل ہوتے ہوتے آخر نکمے ہوجاتے ہیں۔ آج یہی حالت کثیر حصہ مسلمانوں کی ہے کہ موت سے ڈرتے گھروں سے باہر نہیں نکلتے حالانکہ ذلت کی زندگی موت سے بدتر ہے اور ﴿وَاللّٰہُ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ﴾ میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ حقیقی احیاء واماتت سانس آنے یا نہ آنے کا نام نہیں بلکہ جو لوگ تجارتوں کے لیے، طلب معاش کے لیے، خدا کے دین کو پھیلانے کے لیے، دشمن کی جنگ کے لیے موت کو قبول کر کے نکل پڑتے ہیں ان کو کامیابی کی زندگی دی جاتی ہے اور جو موت کے خوف سے چھپ کر گھروں کے اندر بیٹھ رہتے ہیں وہ جہالت اور ذلت کی موت میں رہتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: [اِنْ لَمْ تُقْتَلُوْا تَمُوْتُوْا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَاَلْفُ ضَرْبَۃٍ بِالسَّیْفِ اَھْوَنُ مِنْ مَوْتٍ عَلٰی فِرَاشٍ] (تفسیر غرائب القرآن) یعنی اگر تم قتل نہ کیے جاؤ گے تو مرجاؤ گے اور قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تلوار کی ہزار ضرب بستر پر مرنے سے آسان تر ہے۔

اور یا ﴿الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ سے مراد منافق ہیں۔ منافقوں کو بعض جگہ ﴿الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ میں داخل کیا گیا ہے اور بعض جگہ ان کو ﴿الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ سے یاد کیا گیا ہے اور اکثر اوقات ایک علیحدہ گروہ قرار دیا گیا ہے اور اگلی ایک آیت میں ان کے متعلق ہے کہ وہ بہ نسبت ایمان کے کفر سے قریب تر ہیں اور کہیں آتا ہے ﴿اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا﴾ ایمان بھی لاتے ہیں کفر بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظاہر میں ایمان لاتے اور دل میں کافر تھے۔ لیکن چونکہ شریعت کا تعلق ظاہر سے ہے اس لیے مسلمانوں کو ان سے مسلمانوں کی طرح ہی سلوک کرنے کا حکم تھا؛ مگر غزوۂ تبوک کے بعد بحکم الٰہی نبی کریم ﷺ نے چند آدمیوں کو مسجد سے نکال دیا کیونکہ انہوں نے اپنی اصلاح آخر تک نہ کی۔ اب مسلمان جو جنگ اُحد میں مقتول ہوئے (یا جو جب تجارت وغیرہ کے لیے نکلتے تو دشمن انہیں مار ڈالتے) تو ان کی نسبت منافقین نے یہ کہنا شروع کیا کہ اگر وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتے یعنی جس طرح ہم جنگ سے واپس آ گئے تھے وہ بھی واپس آجاتے تو مارے نہ جاتے۔ اور اخوان ان کو اس لیے کہتے تھے کہ قرابت میں وہ ان کے بھائی بند ہی تھے۔

تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾ کیے جاؤ گے۔(550)

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَ لَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ

سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے۔ اور اگر تو سخت کلام، سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔(551) پس ان کو معاف کر اور ان کے لیے بخشش

550- [آیت: 157, 158] کا مضمون ملتا جلتا ہے اور جو کچھ پچھلی آیت میں فرمایا تھا اسی کی تائید ہے یعنی موت سے انسان کو خائف نہیں ہونا چاہیے۔ مگر دونوں آیتوں میں ایک باریک فرق نظر آتا ہے۔[آیت: 157] میں فرمایا اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ یا مر جاؤ اور یہاں مر جانے سے مراد بھی اللہ کی راہ میں ہی مر جانا ہے۔ کیونکہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہوا انسان قتل بھی ہو جاتا ہے اور مر بھی جاتا ہے اور گو قتل ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں اور اکثر اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے معمولی موت سے ہی مرتے ہیں۔ جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی گو بہتیرے قتل ہوئے مگر پھر بھی کثیر حصہ معمولی موت سے عالم جاودانی کی طرف انتقال کر گیا۔ تاہم خدا کی راہ میں قتل ہونا چونکہ ایک عظمت کا مقام ہے اور چونکہ منافق زیادہ تر اسی سے ڈرتے تھے اور کمزور دل کو بھی قتل کا ہی زیادہ خوف ہوتا ہے اس لیے یہاں قتل کو مقدم کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں کام کرتے ہوئے قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ تو زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ دنیا کا مال و دولت جمع کرنے میں کمی رہ جائے گی۔ سو یہ مال و دولت جس کو انسان جمع کرتا ہے کیا چیز ہے۔ اس سے بہت بڑھ کر اللہ کی مغفرت اور رحمت ہے جس کو خدا کی راہ میں کام کرنے والا پاتا ہے اس لیے ﴿مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ﴾ کی نسبت کفار کی طرف کی ہے؛ کیونکہ مال و دولت کے جمع کرنے پر گرا رہنا یہ دنیا پرست کا کام ہے جس کو آخرت پر ایمان نہ ہو۔ اور[آیت: 158] میں ترتیب لفظی کو بدل دیا ہے اور ﴿فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ﴾ کا لفظ بھی اڑا دیا ہے تو اس میں یہ بتایا ہے کہ اگر خدا کی راہ میں کام نہ کرو گے تو پھر بھی تو آخر مرو گے اور کچھ نہ کچھ قتل بھی ہو گے۔ تو آخر معاملہ تو اللہ سے ہی پڑنا ہے اور اسی کے حضور تمہیں اکٹھا کیا جانا ہے۔ یہ مال و دولت تو بہر حال ساتھ نہیں جائے گا۔

551- فَبِمَا۔ مَا تو مزید تاکید کے لیے ہے یا استفہامیہ تعجب کے لیے ہے یعنی کس قدر رحمت الٰہی ہے جو تم ان کے لیے نرم ہو۔

لِنۡتَ۔ لِیۡنٌ خشونت کی ضد ہے اور اس کا استعمال اولاً اجسام میں ہی ہے۔ پھر اخلاق پر بھی یہ لفظ بولے جاتے ہیں۔

فَظّ۔ فَظَظٌ کلام میں خشونت کو کہتے ہیں اور فَظٌّ سخت گو ہے یعنی کلام میں سختی کرنے والا۔(ل) اور [فَظٌّ كَرِيۡهُ الۡخُلُقِ] کو بھی کہتے ہیں۔(غ) یعنی بدخو کو۔

﴿غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ﴾ غِلۡظَةٌ اور خشونت کے ایک ہی معنی ہیں۔ فَظٌّ اور ﴿غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ﴾ میں فرق یہ ہے کہ فَظٌّ بدخلق ہے جو دوسروں سے بری طرح پیش آئے اور ﴿غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ﴾ وہ سخت دل ہے جس کا دل دوسرے کی مصیبت سے متاثر نہ ہو اور دوسروں کے لیے اس کے دل میں رقت، محبت اور ہمدردی پیدا نہ ہو گو وہ ان کے ساتھ سختی نہ کرے۔

اِنْفَضُّوْا۔ فَضَّ اصل میں کسی چیز کے توڑنے کو اور اس کے اجزا میں تفریق کرنے کو کہا جاتا ہے۔(غ) اور اسی سے [اِنْفَضَّ الْقَوْمُ] استعارہ کے رنگ میں لیا گیا ہے۔ اور فَضَّ کے معنی ہیں لوگوں کے حلقہ کو ان کے اجتماع کے بعد پراگندہ کر دینا۔ (ل) پس اِنْفَضُّوْا کے معنی ہوئے اس طرح پراگندہ ہو گئے۔

آنحضرت ﷺ کی لینت:

اب نبی کریم ﷺ کے خلق لینت اور عفو کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پچھلے رکوع کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا کہ جو لوگ بھاگ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا اور درمیان میں ایک نصیحت کرتے ہوئے اب نبی کریم ﷺ کے عفو کا ذکر فرمایا۔ لکھا ہے کہ جو لوگ اُحد کی جنگ میں بھاگے تھے ان کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے کسی طرح سختی نہیں کی نہ کسی کو درشت لفظ کہا بلکہ محبت بھرے کلام میں ان سے گفتگو کی۔ محبت سے صرف اتنے الفاظ فرمائے [لَقَدْ ذَهَبْتُمْ فِيْهَا عَرِيْضَةٌ] (تفسیر رازی: جلد9، صفحہ 397) تم تو بہت دور نکل گئے اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بی بی کے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق کچھ سخت لفظ کہے تو آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روک دیا اور ان کی بات کو ناپسند کیا۔ سو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے خلق لینت کے کمال کو ظاہر فرمایا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات میں ہر قسم کے اخلاق فاضلہ اعلیٰ سے اعلیٰ پایہ کے پائے جاتے تھے۔ جیسا کہ آیۃ کریمہ ﴿اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ [القلم: 4:68] ''تو یقیناً بلند اخلاق رکھتا ہے۔'' اس پر شاہد ہے۔ ان اخلاق کا ذکر قرآن کریم میں مختلف موقعوں پر آتا ہے۔ یہاں آپ کے خلق لینت کے کمال کو دکھایا گیا ہے۔

آپ ﷺ کے اخلاق اور خلق لینت کا کمال:

ہر ایک خلق کا اظہار کامل رنگ میں اس وقت ہوتا ہے جب اس کے اظہار کے مخالف موقعہ ہو۔ جنگ کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں نرمی کے اظہار کا موقعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کے اندر جس قدر شدت ہے اس کا اظہار جنگ میں پورے زور کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جب ان احکام کی تعمیل میں جو کسی فوج کو دیئے گئے ہوں فروگزاشت ہو یا ان احکام کی تعمیل نہ ہو تو پھر قواعد جنگ اس امر کے مقتضی ہوتے ہیں کہ سخت سے سخت سزا دی جائے۔ پس اول تو موقعہ اظہار لینت کا نہیں بلکہ اظہار شدت کا تھا۔ دوسرے نبی کریم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی جس کی وجہ سے اس قدر عظیم مصیبت آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو برداشت کرنی پڑی۔ اور یہ موقعہ سخت سے سخت سزا کو چاہتا تھا مگر اس موقعہ پر نافرمانی کرنے والوں کو ایک حرف بھی ملامت کا نہ کہنا ظاہر کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ میں کس قدر کمال خلق لینت کا موجود تھا کہ سخت سے سخت حالات کے ماتحت بھی، ہاں ان حالات کے ماتحت بھی جو بظاہر خلق لینت کے اظہار کے منافی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے اندر اس خلق کا اظہار ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے تعریف کے موقعہ پر بیان فرمایا ہے۔ ورنہ آپ کے خلق لینت کے تو بے شمار موقع تھے۔ دن رات خدام سے، بیبیوں سے، دوستوں سے، دشمنوں سے لینت کا برتاؤ آپ فرماتے تھے مگر یہ موقعہ اس خلق کے کمال کو دکھانے والا تھا۔

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

مانگ اور معاملات میں ان کا مشورہ لے۔ پھر جب پختہ ارادہ کرلے تو اللہ پر ہی بھروسہ کر۔ اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (552)

نبی کریم ﷺ کی نرمی اور رحمت کے متعلق اور بھی بہت سی آیات قرآنی شاہد ہیں جیسا کہ فرمایا: ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ [التوبة: 128:9] کوئی دکھ تم کو پہنچے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الحجر: 88:15] ''اور مومنوں کے لیے اپنے بازوؤں کو جھکا۔'' اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: [أَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ] (سنن النسائی، کتاب الطهارة، باب النهي عن الاستطابة بالروث: 40 **بلکہ والد سے بہت بڑھ کر شفقت اور محبت آپ کے دل میں بھری ہوئی تھی۔** نبی کریم ﷺ کے اس خلق کے اظہار میں یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کے پیرو بھی اور بالخصوص وہ لوگ جو دوسروں کے لیے پیشرو یا سردار کے طور پر ہوتے ہیں وہ اس قسم کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں تو ہی جماعت قائم رہ سکتی ہے۔ ورنہ کوئی جماعت نہیں بن سکتی۔ چنانچہ اس کی طرف ایک حدیث میں اشارہ ہے: [لَا حِلْمَ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنْ حِلْمِ إِمَامٍ وَرِفْقَةٍ، وَلَا جَهْلَ أَبْغَضُ إِلَى اللّٰهِ مِنْ جَهْلِ إِمَامٍ وَخِرْقَةٍ] (غق) یعنی کوئی حلم اور نرمی امام کے حلم اور نرمی سے بڑھ کر اللہ کو پسند نہیں اور کوئی جہل امام کی جہالت سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں۔

552- **استغفار کے معنی:** نبی کریم ﷺ کی لینت کا ذکر کر کے اب ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر آپ کو قائم کرتا ہے

اوّل پچھلا گناہ معاف کر دینا [آیت: 155] میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے معافی دی تھی مگر چونکہ رسول کے حکم کی نافرمانی ہوئی تھی اس لیے اب آپ کو عفو کرنے کا حکم ہوا۔

دوم ان کے لیے استغفار یا آئندہ اس قسم کی نافرمانی سے حفاظت چاہنا۔ یہاں استغفار گو دوسروں کے لیے ہے مگر اس کے معنی گناہ کی سزا سے حفاظت چاہنا نہیں بلکہ خود گناہ سے حفاظت چاہنا ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ تو خود ان کے گناہ کو معاف کر چکا ہے: ﴿وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ﴾ پس جس کو خدا معاف کر چکا اس کے لیے سزا سے بچانے کی دعا کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ ایک اور قطعی شہادت ہے کہ استغفار سے مراد گناہ سے حفاظت بھی ہوتی ہے۔

سوم ان کو مشورہ میں شریک کرنا گویا ان کو اس قدر بلند مرتبہ کر دیا کہ پھر وہ مجلس شوریٰ کی شمولیت کے بھی اہل قرار دیئے گئے۔

شوریٰ کا حکم تو قرآن کریم میں پہلے سے موجود تھا ﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ [الشوریٰ: 38:42] ''اور ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔'' یہاں اس کے ذکر میں دو غرضیں ہیں ایک تو یہ بتانا کہ ایک دفعہ نافرمانی سے مشورہ کی اہلیت نہیں چھن جاتی۔ آج مہذب قومیں جو پولیٹکل مجرموں کو مجلس شوریٰ سے نہیں روکتیں اسلام کی تعلیم سے ابھی آگے نہیں بلکہ پیچھے ہیں۔ اس لیے کہ یہ پولیٹکل مجرم نہ تھے جنگی مجرم تھے۔ جن کے لیے مہذب قوموں میں کورٹ مارشل ہے، ان کے لیے یہ

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور

رعایت معاف کر دینا، ان کی بلندی درجات چاہنا، پھر مجلس شوریٰ کے ان کو ممبر بنانا اسلام کے ساتھ ہی یہ تعلیم خاص ہے دنیا میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ اور دوسری غرض یہاں شوریٰ کے حکم کو دہرانے کی یہ ہے کہ جنگ اُحد میں جو مصیبت پیش آئی وہ شوریٰ کے فیصلہ پر عمل کرنے سے ہی پیش آئی کیونکہ نبی کریم ﷺ کی اپنے رائے تو یہی تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے۔ اس لیے حکم دیا کہ گو نتیجہ شوریٰ کا برا بھی نکلا اور اس موقعہ پر کثرت رائے نے غلطی بھی کھالی مگر اصول شوریٰ پھر بھی قائم رکھنے کے قابل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس نتیجہ کو دیکھ کر اصول شوریٰ سے ہی بیزاری ہو جائے۔ اس میں کسی قدر دور اندیشی کی تعلیم ہے کہ ایک چیز کے ذرا سے نقصان کو دیکھ کر فوراً اس سے بیزار نہ ہو جاؤ۔ ممکن ہے اس کے فوائد اس سے بڑھ کر ہوں۔

آنحضرت ﷺ کا شوریٰ پر عمل:

اس آیت کے ساتھ ﴿ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ کو اس قدر قوت دے دی کہ کسی مسلمان کو یہ جرأت نہ ہونی چاہیے کہ اصول شوریٰ کا انکار کرے یا اسے استخفاف کی نظر سے دیکھے۔ شوریٰ کو خود اللہ تعالیٰ نے اس قدر عزت کا مقام دیا ہے کہ اس کے نقصانات کو ناقابل التفات قرار دیا ہے۔ اور پھر خود نبی کریم ﷺ نے اس پر باقاعدہ عمل کر کے دکھایا کہ آپ کی امت کو اصولِ شوریٰ کسی حالت میں چھوڑنا نہ چاہیے۔ تمام امور مہمہ میں آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ بدر میں بعد مشورہ مدینہ سے نکلے۔ احد میں بھی، احزاب میں مشورہ کر کے خندق کھدوادی اور محصور ہوئے۔ پھر صلح کی اس تجویز پر کہ ایک تہائی مدینہ کے پھل کفار کو دے دیئے جایا کریں مشورہ کیا اور اسے چھوڑ دیا۔ حدیبیہ میں بھی مشورہ کیا بلکہ ایک ایسے معاملہ میں جو صرف آپ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر افک کا معاملہ اس میں بھی مشورہ کیا اور حدیث میں ہے: [مَا تَشَاوَرَ قَوْمٌ قَطُّ إِلَّا هُدُوا لِأَرْشَدِ أَمْرِهِمْ] (مصنف ابن أبي شيبة، جلد9، صفحہ10، حديث: 26800) کبھی کسی قوم نے مشورہ نہیں کیا مگر اپنے معاملہ میں نہایت سیدھی راہ کی طرف ہدایت کیے جاتے ہیں۔

کثرت رائے پر عمل:

شوریٰ میں نبی کریم ﷺ نے اپنی رائے کے خلاف بھی کیا ہے جیسے اُحد کے معاملہ میں بلکہ وہاں کچھ خواب بھی آپ کو آئے مگر چونکہ صریح وحی کوئی نہ تھی اس لیے مشورہ پر ہی عمل کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب کثرت رائے خلاف ہو تو امیر کو اپنی رائے ترک کر دینی چاہیے اور کثرت رائے پر عمل پیرا ہونا چاہیے اور یہ بات کہ کثرت رائے پر آپ عمل کرتے تھے۔ اسی اُحد کے میدان میں نکلنے والے واقعہ سے ظاہر ہے کیونکہ وہاں کچھ آدمیوں کی رائے آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی تھی۔ پس آپ کا ان کی اور اپنی رائے کو چھوڑ دینا محض اسی وجہ سے تھا کہ کثرت رائے آپ کے خلاف تھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تک کے بارے میں کثرت رائے پر فیصلہ کرنا ثابت ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قانون سازی بالخصوص اور تمام امور مہمہ بالعموم کثرت رائے سے طے ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں نے اس اصول شوریٰ کو بہت جلد ترک کر دیا اور یہی ان کی سلطنتوں کے تباہ ہونے کا موجب ہے۔

وَ اِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾

اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرے؟ اور اللہ ہی پر مومنوں کو توکل کرنا چاہیے۔ (553)

وَ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ ؕ وَ مَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾

اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو خیانت کرے وہ جو کچھ خیانت کی ہے قیامت کے دن لائے گا، پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا ہے پورا دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ (554)

کیا ﴿فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ﴾ سے شوریٰ کے خلاف کچھ نکلتا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ وہ عزم شوریٰ کا ہی نتیجہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مشورہ کر کے جب بات پختہ کر لو تو پھر نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دو۔ جیسا اُحد کے موقعہ پر آپ نے کیا کہ جب مشورہ کر کے حکم دے دیا پھر بعض لوگوں نے اپنی رائے سے رجوع کیا تو آپ نے اس کی پروانہ کی۔ یہ خلاف عزم ہوتا۔ پھر جب نقصان پہنچا تب بھی آپ نے یہ نہ کہا کہ میری رائے پر کیوں نہ عمل کیا گیا۔ تفاسیر میں عزم سے مراد یہی لی گئی ہے کہ جو فیصلہ بعد شوریٰ قرار پائے: [اِذَا شَاوَرْتَهُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَزَمْتَ عَلَیْهِ] (ث) [فَاِذَا وَطَنْتَ نَفْسَكَ عَلٰی شَیْءٍ بَعْدَ الشُّوْرٰی] (ض) [اِذَا عَقَدْتَ قَلْبَكَ عَلَی الْفِعْلِ وَاِمْضَائِهِ بَعْدَ الْمُشَاوَرَةِ] (ر) پس مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد، ان کے اہم معاملات کی بنیاد، ان کے قوانین کی بنیاد قرآن وحدیث کی صریح تعلیم اور نبی کریم ﷺ کے کھلے کھلے عمل کے مطابق مشورہ میں کثرت رائے پر ہونی چاہیے۔

اس صدی کے مجدد کا کثرت رائے کے اصول کو زندہ کرنا:

اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے جب اشاعت اسلام کے لیے ایک کام شروع کیا تو اس کی بنیاد بھی شوریٰ اور کثرت رائے پر رکھی اور تمام اموال سلسلہ کو ایک انجمن کے سپرد کیا جس کے متعلق یہ صفائی سے لکھ دیا کہ تمام معاملات میں جو فیصلہ انجمن کا کثرت رائے سے ہوگا اسی پر عمل کرنا ہوگا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ جب قوم بڑھ جائے تو پھر اس کی کثرت رائے کو معلوم کرنے کے لیے خاص آدمیوں کے انتخاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔

553- یَخۡذُلۡ۔ خُذۡلَانٌ کے معنی ہیں اس شخص کا چھوڑ دینا جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہو کہ وہ اپنی نصرت سے اسے مدد دے گا۔ (غ)

554- یَغُلَّ۔ غَلَّ یَغُلُّ، اِذَا خَانَ (غ) یعنی غَلَّ جس کا مضارع یَغُلُّ آتا ہے (جو یہاں ہے) اس کے معنی ہیں خیانت کی اور بعض نے اسے غنیمت کی خیانت سے خاص کیا ہے۔ مگر چونکہ الفاظ عام ہیں یعنی کسی نبی کو بھی یہ شایاں نہیں کہ وہ غلول کا ارتکاب

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ

تو کیا جو شخص اللہ کی رضا کی پیروی کرے وہ اس کی طرح ہوسکتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کمالائے؟ اور اس کا ٹھکانا

کرے۔ حالانکہ غنائم کا صرف آنحضرت ﷺ کی امت کے لیے حلال ہونا حدیث سے ثابت ہے اور یہ آپ کی ایک خصوصیت ہے۔اس لیے یہاں یَغُلَّ کے عام معنی خیانت ہی مراد ہیں۔

خیانت کی سزا کا ذکر بطور مثال ہے:

﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ﴾ یہ لفظ عام ہیں اور یہ مراد نہیں کہ جو نبی خیانت کرے بلکہ نبی کے متعلق تو فرمایا کہ اس کی تو شان ہی یہ نہیں کہ وہ خیانت کرے یعنی ایسا ہوسکتا ہی نہیں اور جب خیانت کا ذکر آیا تو یہ بھی بتا دیا کہ خیانت چھپی نہ رہ جائے گی بلکہ ایک دن آتا ہے کہ وہ کھلی کھلی ظاہر ہو جائے گی۔ اکثر مفسرین نے اس کو ظاہر پر محمول کیا ہے کہ جس قدر خیانت کی ہے برنگ سزا خود وہی خیانت کا مال اس پر وارد کیا جائے گا مگر یہ بے وجہ ہے۔ ایسے موقعہ پر مراد محض سزا ہوتی ہے جیسے: ﴿تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ میں مراد نیکی بدی کے اجر کا دیا جانا ہے۔ ابو مسلم نے اس کو سزا کے لیے تمثیل کہا ہے۔ (غق) اور یہ جو بعض احادیث میں ذکر آتا ہے کہ ایک شخص اونٹ گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا جس کی اس نے خیانت کی ہے تو وہ بھی سزا کے لیے بطور تمثیل ہے؛ اور کم از کم یہ تو ظاہر ہے کہ اس دنیا کی سزا و جزا میں اس عالم کی چیزیں بطور مثال ہی بیان کی گئی ہیں جیسے: ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ﴾[الرعد: 35:13] ''جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں کو دیا گیا ہے۔'' سے ظاہر ہے۔

عصمت انبیاءؑ پر شہادت:

اس آیت پر یہ بتانا مقصود ہے کہ جنگ میں جو مصیبت پیش آئی وہ اس وجہ سے نہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ میں کوئی نقص ہو یا آپ نے کوئی کوتاہی کی ہو۔ کیونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا تو اتنا بلند مرتبہ ہے یہ کسی بھی نبی کی شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اس لیے کہ نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس بات پر کہ یہاں مصیبت کے اسباب کی طرف اشارہ ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی وجہ سے نہیں یہ بھی دلیل ہے کہ ان آیات کے بعد جن میں رسول اللہ ﷺ کی عصمت اور آپ کی قوت قدسی کا اور آپ کے تزکیہ اور تعلیم قرآن وحکمت کا ذکر ہے فوراً بعد یہ آیت آتی ہے: ﴿اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا﴾ یعنی تم اس مصیبت کے متعلق سوال کرتے ہو کہ کہاں سے آئی؟ یہاں لفظ خیانت یا غلول اسی طرح وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جس طرح امانت کا لفظ وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں ہر ایک قسم کی کمی شامل ہے اور یہ خود اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کے آگے فرمایا ہے کہ جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اسے لائے گا۔ یعنی جس قدر اللہ تعالیٰ کی امانتوں کے ادا کرنے میں کسی نے کمی کی ہے اس سب کے متعلق قیامت کے دن جوابدہی کرنی ہوگی اور پھر فرمایا کہ ہر جان کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائے گا۔ اس میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس قدر کوتاہی کسی نے فرائض وحقوق کی ادائیگی میں کی ہے اسی قدر اس پر ذمہ داری ہوگی اور اس سے اگلی آیت نے اور بھی مضمون کو صاف کر دیا ہے کیونکہ وہاں دو گروہ کر دیئے ہیں ایک اللہ

وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۶۲﴾

دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بری پہنچنے کی جگہ ہے۔ (555)

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

وہ اللہ کے نزدیک درجے (رکھتے) ہیں، اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (556)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا

یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اُس کی آیتیں پڑھتا ہے اور

کی رضا کی پیروی کرنے والا گروہ اور دوسرا اللہ کی ناراضگی کو خریدنے والا۔ اور پھر آگے چل کر اور بھی صفائی سے کہا کہ نبی کی بعثت کی تو غرض ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو پاک کرے۔ جس میں خود کسی قسم کی خیانت یا کوتاہی پائی جائے وہ دوسروں میں امانت اور کمال کس طرح پیدا کرسکتا ہے۔ گویا یہاں ضمناً عصمت انبیاء علیہم السلام کے اصول کو قائم کیا ہے۔

بعض لوگوں نے یہاں یَّغُلَّ کو خاص مال غنیمت سے مخصوص لے کر یوں توجیہ کی ہے کہ تیراندازوں نے جب اپنی جگہ کو چھوڑا تو انہوں نے گویا ایک رنگ میں نبی ﷺ پر بدظنی کی کہ آپ ان کو مال غنیمت کا حصہ نہیں دلائیں گے تو اس لیے فرمایا کہ نبی مال غنیمت میں خیانت نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کی شان سے بہت گری ہوئی بات ہے کہ ایسا کرے۔ اور بعض وسعت کی طرف گئے ہیں یہاں تک کہ بعض کے نزدیک یہاں مراد امانت وحی کی ادائیگی میں خیانت نہ کرنا ہے۔

555- ﴿سَخَطٌ﴾۔ سَخَطٌ وہ غضب شدید ہے جو عقوبت یعنی سزا کا مقتضی ہو۔ (غ) اور اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انزال عقوبت یعنی سزا وارد کرنے کے معنی میں ہے۔

556- **تفاوت درجات:** ﴿هُمْ دَرَجٰتٌ﴾ اس کی ترکیبے [لَهُمْ دَرَجَاتٌ] یعنی ان کے لیے درجات ہیں یہ اسی قسم کا بیان ہے جیسے حدیث میں آتا ہے: [النَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ] (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب الأَرْوَاحِ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ: 6877) ''لوگ کانیں ہیں سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح۔'' اور بعض نے ذو درجات مراد لیا ہے یعنی لوگ صاحب درجات ہیں۔ بعض بڑے درجوں والے، بعض کم درجوں والے اور روح المعانی میں ہے کہ مبالغہ کے لیے ان کو نفس درجات کہا ہے۔ هُمْ کی ضمیر کو بعض نے ﴿مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ﴾ [162] کی طرف لیا ہے کیونکہ درجات کا لفظ عموماً ثواب میں استعمال ہوتا ہے مگر چونکہ لفظ درجات عام بھی آیا ہے جیسے: ﴿وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ [الأنعام: 132:6] ''اور سب کے درجے ہیں اس کے مطابق جو انہوں نے عمل کیے۔'' اس لیے اہل ثواب اور اہل عقاب دونوں کا ذکر ہے۔

دَرَجَاتٌ۔ دَرَجَةٌ کی جمع ہے اور دَرَجَةٌ اور مَنْزِلَةٌ ایک ہی ہیں لیکن درجہ اوپر چڑھنے کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور مَنْزِلَةٌ رَفِيْعَةٌ یعنی بلند مرتبہ یا بلند مقام پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (غ)

عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيۡهِمۡ وَ يُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ ۚ وَ اِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۶۴﴾

انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے ضرور کھلی گمراہی میں تھے۔ (557)

النصف

اَوَ لَمَّاۤ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۶۵﴾

اور کیا جب تمہیں ایک مصیبت پہنچی کہ اس جیسی دو چند تم پہنچا چکے ہو، تم نے کہا یہ کہاں سے ہے؟ کہہ، یہ تمہاری اپنی طرف سے ہی ہے۔ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ (558)

557- چونکہ اصل غرض اس رکوع کی یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو پاک کرتا اور ان کی منافقوں سے تمیز کرتا ہے اور انہی سامانوں میں سے جنگ اُحد ایک سامان ہے اس لیے اب ان کو اپنا ایک عظیم الشان احسان یاد دلاتا ہے کہ ان میں سے ایسے رسول کا کھڑا کر دینا جو ان کو پاک کر دے کتنا بڑا احسان ہے اور دوسرے چونکہ اوپر فرمایا تھا کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے یعنی اس میں خود کوئی نقص اور کوتاہی ہو۔ تو اب بتاتا ہے کہ اس میں نقص اور کوتاہی کس طرح ہو سکتی ہے اور کوئی ناپاک امر اس کی طرف منسوب کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اس کا منصب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو آیات اللہ کے ذریعہ سے ہر قسم کی آلائشوں سے پاک کرے۔

تعلیم اور تزکیہ کو چار دفعہ آنحضرت ﷺ کا کام بیان کرنے میں حکمت:

ہمارے نبی کریم ﷺ کی تعریف ان الفاظ میں دو دفعہ پہلے آ چکی ہے۔ ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں دوسرے اس دعا کے خانہ کعبہ کے تعلق میں پورا ہونے کے ذکر میں۔ یعنی کعبہ کا قبلہ ہونا اس لیے ضروری ہے کہ وہ رسول مزکی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مقصد تھا وہ یہاں ظاہر ہو چکا ہے۔ اب تیسری مرتبہ مومنوں کے تزکیہ کو اس کی اصل غرض ٹھہرا کر پھر اس کو بیان کیا ہے اور یہاں ﴿اِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ﴾ کے لفظ بھی بڑھا دیئے ہیں۔ یعنی معمولی حالات میں بھی تزکیہ کرنا ایک نہایت ہی مشکل کام ہے۔ مگر اس رسول کے سامنے وہ قوم رکھی جاتی ہے جو حد درجہ کی جہالت اور گمراہی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور شاید اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح تم کو یہ رسول پاک کرتا ہے تمہارا بھی کام ہے کہ دوسرے لوگوں کو پاک کرو مگر اس کو کھول کر سورہ جمعہ میں بیان فرمایا ہے جہاں چوتھی مرتبہ نبی کریم ﷺ کے یہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ اثنائے ذکر جنگ میں ایسی آیات کے لے آنے سے یہ بھی تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ لڑائیاں یا ان میں کامیابی کوئی اصل غرض اسلام کی نہیں بلکہ اصل غرض تزکیہ نفوس اور تعلم و تعلیم کتاب و حکمت ہے۔

558- [آیت: 160] میں جس امر کی طرف اشارہ کیا تھا اب اس کی تصریح فرماتا ہے۔ یعنی اس مصیبت کی وجہ ذات پاک نبوی تو نہیں

وَ مَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾

اور جو کچھ تمہیں اس دن مصیبت پہنچی جب دو گروہ (جنگ میں) ملے، تو اللہ کے اذن سے تھا اور تا کہ وہ مومنوں کو جان لے۔

وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَ قِيْلَ لَهُمْ

اور تا کہ ان لوگوں کو جان لے جنہوں نے نفاق کیا(559)

ہے۔لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہاں سے آئی؟ مگر اس کا جواب دینے سے پہلے فرمایا: ﴿قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا﴾ جس کی دو چند ویسی تم پہنچا چکے ہو۔اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم کو مصیبت پہنچی تو تم کو اس قدر گھبراہٹ ہے کہ یہ کیوں آئی؟ حالانکہ تم ویسی **دو چند دشمن کو پہنچا چکے ہو**۔اس دو چند مصیبت میں ایک تو جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے کہ وہاں کفار کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے اور دوسرے جنگ اُحد کی ابتدائی حالت کی طرف کہ اس میں بھی بیس سے زیادہ آدمی قریش کے مارے گئے اور بہت سے آدمی زخمی ہوئے۔پس جب تم ان کو دو چند مصیبت پہنچا چکے ہو تو پھر تھوڑی سی مصیبت اگر تم پر آ گئی تو اس پر اس قدر گھبراہٹ کیوں؟ دو چند مصیبت کا ایک چھوٹے سے گروہ سے ایک عظیم الشان اور طاقتور قوم کو پہنچ جانا تو صاف بتاتا ہے کہ نصرت الٰہی تمہارے ساتھ ہے اور ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ [160] کا ثبوت ملتا ہے۔ہاں اگر یہ کہو کہ جب نصرت الٰہی ہمارے ساتھ تھی تو پھر مصیبت کیوں آئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔یعنی تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی وجہ سے نصرت الٰہی رک گئی۔تم نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کی ﴿حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ﴾ [152] ''یہاں تک کہ تم نے نامردی کی اور حکم میں جھگڑا کیا اور نافرمانی کی۔''

آخری الفاظ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ میں یا تو یہ اشارہ ہے کہ یوں اس نے تمہیں سمجھا دیا کہ اللہ تعالیٰ کیسا قادر ہے کہ جب اس کی نصرت شامل حال ہو تو کمزوری بھی قوت بن جاتی ہے اور یا یہ مراد ہے کہ جب مومن اطاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نصرت کی قدرت نمائی کا نظارہ دکھاتا ہے اور جب اس سے نافرمانی وقوع میں آتی ہے تو اپنی نصرت کو روک دیتا ہے۔

559- نَافَقُوْا۔ اس کا اصل نَفَقَ ہے جس کے معنی ہیں گزر گیا اور ختم ہوا۔اس لیے خرچ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسی سے نَفَقٌ ہے جس کے معنی ہیں جاری رستہ یا وہ رستہ جو دوسری طرف نکل جاتا ہو اور زمین میں سرنگ جو دوسری طرف نکل گئی ہو۔(غ) چنانچہ قرآن کریم میں بھی آتا ہے: ﴿فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ﴾ [الأنعام: 35:6] ''تو اگر طاقت رکھتا ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ تلاش کر لے۔'' اسی لحاظ سے نفاق سے مطلب ہے: [اَلدُّخُوْلُ فِي الشَّرْعِ مِنْ بَابٍ وَالْخُرُوْجُ عَنْهُ مِنْ بَابٍ] (غ) یعنی ایک دروازہ سے شریعت میں داخل ہونا اور دوسرے دروازہ سے اس سے نکل جانا۔اور منافق حقیقی طور پر وہ شخص ہے جو ظاہر میں ایمان لاتا ہے اور اندر سے کافر رہتا ہے۔اسی سے نَافَقَ ہے یعنی اس سے نفاق کیا۔پھر حدیث میں اس معنی کو وسیع کیا ہے جہاں یہ فرمایا کہ منافق کی چار علامتیں ہیں جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ منافق خالص ہے اور جس میں بعض پائی جائیں اس میں اسی قدر نفاق ہے: [إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ] (صحيح البخاري: كتاب الإيمان، باب عَلاَمَةِ الْمُنَافِقِ، حديث:34) ''یعنی جب اس

تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ اور ان کو کہا گیا آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا مدافعت کرو۔ (560)
قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ انہوں نے کہا اگر ہم لڑائی جانیں تو ضرور تمہارا ساتھ
لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ دیں۔ (561) وہ آج کے دن ایمان کی نسبت کفر سے

کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرتا ہے اور جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب عہد کرتا ہے تو بیوفائی کرتا ہے اور جب جھگڑا کرتا ہے ناحق کی طرف جاتا ہے۔'' پھر وہ لوگ جو منہ سے بات کہتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے، ان میں بھی نفاق کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [الصف: 3:61] ''اللہ کے نزدیک یہ سخت بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں۔''

پچھلی آیت میں جنگ اُحد کی مصیبت کی وجہ بتائی تھی اس میں اس کی غرض بتائی ہے۔ پہلے فرمایا: ﴿فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ یہ مصیبت اللہ کے اذن سے آئی ہے۔ اِذْنٌ کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں، اس کی اجازت یا اس کے علم سے۔ اور یوں کہنے کی غرض یہ ہے کہ یہ مصیبت محض تمہارے لیے دکھ بن کر نہیں آئی جس کے نیچے کوئی غرض نہ ہو۔ بلکہ اس میں ایک خاص غرض بھی ہے اور وہ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں اور منافقوں کو الگ الگ کر دے۔ جاننے سے کیا مراد ہے؟ [دیکھو نمبر: 179] اور [نمبر: 524]۔

560- اِدْفَعُوْا۔ دَفْعٌ کے معنی قوت کے ساتھ ازالہ کر دینا ہیں۔ اور جب اس کا صلہ عَنْ ہو تو اس کے معنی حمایت ہوتے ہیں۔ (غ) یہاں کوئی صلہ مذکور نہیں مگر چونکہ قتال فی سبیل اللہ کے مقابل پر اس کو استعمال کیا ہے اس لیے مراد ہے: [اِدْفَعُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمْ وَ اَهْلِيكُمْ وَاَمْوَالُكُمْ] (تفسیر غرائب القرآن) یعنی اپنے آپ سے اور اپنے اہل سے اور اموال سے دشمن کو روکو یا ان کی حمایت کرو۔

قوم کو ہلاکت یا ذلت سے بچانے کا فرض:

قتال فی سبیل اللہ تو ایمان کو چاہتا ہے اس لیے پہلے ان کو یہی کہا جاتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ کے دین کی حفاظت کرنا اور اس کو نیست و نابود ہونے سے بچانا تمہارا فرض ہے اس لیے اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ لیکن اگر تمہارا اس پر ایمان نہیں تو کم از کم اپنے لوگوں کو اہل و عیال کو دشمن سے بچانا تو ہر انسان کا فرض ہے۔ پس تم اپنے اہل و عیال کو ہی بچاؤ اور ان کی حمایت میں ہی کھڑے ہو جاؤ۔ یہی آج مسلمانوں کی حالت ہے اور ان کے لیے اس میں سبق ہے۔ انہوں نے خدا کے دین کی خدمت کو چھوڑ دیا اور خدا کی راہ میں کوشش نہ کی مگر جس ذلت کی حالت کو پہنچ چکے ہیں اس کا تقاضا کم از کم یہ تو ہے کہ اپنی قوم اور اپنی ناموس کی حفاظت کے لیے اب بیدار ہو جائیں اور دیکھیں کہ بدوں ایثار اور قربانی کے وہ دنیا میں زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔

561- ﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا﴾ اگر ہم لڑائی جانیں یا لڑائی سمجھیں۔ اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر ہم یہ جانیں کہ فی الواقع جنگ ہوگی۔ گویا یہ بہانہ کیا کہ ہمارے نزدیک کوئی جنگ ہونے والی نہیں ہے اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اگر ہم سمجھیں کہ یہ کوئی جنگ ہے

يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

بہت نزدیک ہیں[562] اپنے مونہوں سے کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ (خوب) جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں۔[563]

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

جنہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا اور خود بیٹھے رہے کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ کہہ، تو اپنی جانوں سے موت کو ہٹا رکھو اگر تم سچے ہو۔[564]

جس میں سات سو آدمی تین ہزار بہادر کے مقابل پر نکلتا ہے، یہ جنگ نہیں۔ کیونکہ جنگ میں کچھ نہ کچھ توازن فریقین کا ضروری ہے۔ بلکہ یہ عمداً اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اگر آیت کے آخری الفاظ ﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ ''اپنے مونہوں سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔'' کو ان کے اسی قول کے متعلق لیا جائے۔ تو پہلے معنی درست ہوں گے۔

﴿لَاتَّبَعْنٰكُمْ﴾ تَبِعَ اور اِتَّبَعَ کے معنی پیچھے چلنا ہیں۔ یہاں پیچھے چلنے سے مراد جنگ میں ساتھ دینا ہے۔

562- ﴿هُمْ لِلْكُفْرِ﴾ لِلْكُفْرِ اور لِلْاِيْمَانِ میں ل بمعنی اِلیٰ ہے یعنی ان کا قرب کفر سے ایمان سے ان کے قرب سے بڑھ کر ہے۔ اور یا حذف مضاف ہے اور مراد ہے کہ وہ اپنے فعل سے بہ نسبت مومنوں کے کافروں کی نصرت کے قریب تر ہیں کیونکہ ان کے الگ ہو جانے سے کفار کو مدد پہنچی۔ بعض کے نزدیک اَقْرَبُ قَرْبٌ ہے جس کے معنی [طَلَبُ الْمَاءِ] ہیں۔ (ر) یعنی پانی کا طلب کرنا۔ پس اَقْرَبُ بمعنی اَطْلَبُ ہوا یعنی وہ کفر کو بہ نسبت ایمان کے زیادہ طلب کرنے والے ہیں۔

563- ﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ﴾ اس سے یا تو ان کے قول سابق کی طرف اشارہ ہے: ﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا﴾ [دیکھو نوٹ نمبر: 561]- اور یا اس سے مراد ہے کہ منہ سے ایمان لاتے ہیں مگر ان کے دل میں ایمان نہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ [الحجرات: 14:49] ''اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ﴾ بجائے محبت اسلام کے جس کا وہ منہ سے اظہار کرتے ہیں ان کے دلوں میں اسلام کا بغض ہے۔ مگر اللہ اس سے واقف ہے۔

564- قَعَدُوْا۔ قُعُوْدٌ اصل میں قیام کے مقابل پر ہے یعنی بیٹھے رہنا۔ مگر قاعد (بیٹھنے والے) سے مراد [اَلْمُتَكَاسِلُ فِي الشَّيْءِ] (غ) لیا جاتا ہے۔ یعنی کسی چیز کے متعلق کسل یا سستی کرنے والا جو اس سے پیچھے رہ جائے۔

اِدْرَءُوْا۔ دَرْأٌ کے معنی ہیں [اَلْمَيْلُ اِلٰى اَحَدِ الْجَانِبَيْنِ] یعنی ایک جانب کی طرف مائل ہو جانا اور اس کا صلہ عَنْ ہو تو

وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

اور جولوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مردے مت خیال کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں۔(565)

[دَرَأْتَ عَنْهُ] کے معنی ہیں [دَفَعْتُ عَنْ جَانِبِهِ] (غ) اس کی جانب سے دفع یا رد کیا۔ ﴿يَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ﴾ [الرعد: 22:13] ''برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔'' ﴿وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ﴾ [النور: 8:24] ''اور عورت سے یہ بات سزا کو ٹال سکتی ہے۔''

ادائیگی فرض میں موت کی پروانہ ہو:

یہ بھی منافقین کا ذکر چلتا ہے جیسا کہ ﴿وَقَعَدُوا﴾ سے ظاہر ہے یعنی یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جو جنگ سے پیچھے رہے یعنی جنگ میں شامل نہ ہوئے۔ وہ اپنے بھائیوں کے متعلق (کیونکہ ان لوگوں کے قریبی سب مومن تھے) کہتے کہ اگر وہ بھی ہماری فرمانبرداری کرتے یعنی دل سے ایمان نہ لاتے اور ہمارے ساتھ نفاق میں شامل رہتے یا جنگ میں نہ نکلتے تو قتل نہ ہوتے۔ مگر چونکہ ان کی اصل غرض تو موت پر افسوس کرنا تھا کہ ہمارے بھائی بند مر گئے اس لیے خصوصیت اعتراض کو چھوڑ کر ایک عام جواب دے دیا ہے۔ قتال تو خود مسلمانوں کی زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ پس جب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تو خواہ اس کے کرنے میں جان رہے یا جائے وہ کام کرنا ہوگا۔ یہ کوئی اصول زندگی نہیں کہ اگر ایک کام کے کرنے میں جس کی ضرورت انسانی زندگی کے بقا کے لیے ہے موت کا خطرہ ہو تو انسان وہ کام نہ کرے۔ اس طرح پر موت سے بچنا گویا انسانی زندگی کی اصل غرض ہوگئی۔ اس لیے جواب میں فرمایا کہ اگر تم موت سے بچنے کو ہی انسان کی زندگی کی اصل غرض قرار دینے میں سچے ہو تو ضرور اس کے حصول کا سامان بھی تمہارے پاس ہوگا۔ پس اپنی جانوں سے موت کو دور رکھ کر بتاؤ کہ تم نے اس مقصد کو حاصل کر لیا ہے۔ ورنہ انسانی زندگی کے مقصد کو یوں کھویا اور شرف انسانیت کو بٹہ لگایا اور موت تو پھر بھی آخر کار آلے گی۔ اسی کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا﴾ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے یعنی اپنی زندگی کا فرض ادا کرتے ہوئے مارے گئے انہوں نے اصل مقصد زندگی کو تو پا لیا۔ پس وہ مردے نہیں۔

565- **شہداء کی زندگی:** ان الفاظ کا مطلب [نمبر: 193] میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ مگر وہاں فرمایا تھا: ﴿بَلْ أَحْيَاءٌ﴾ [البقرۃ: 154:2] ''بلکہ وہ زندہ ہیں۔'' یہاں فرمایا: ﴿بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ جس میں صاف بتا دیا کہ یہ ان کی زندگی حضور رب میں ہے جسمانی زندگی نہیں جو اسی زمین پر ہے یا ﴿عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ میں مراد ان کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا ظاہر کرنا ہے اور یہ کئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء کو خاص مراتب قرب کے عطا ہوتے ہیں۔ اور یہاں آخر پر فرمایا ﴿يُرْزَقُونَ﴾ ان کو رزق بھی ملتا ہے۔ یہ رزق وہی رزق ہے جو جنت میں ملتا ہے۔ ﴿كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا﴾ [البقرۃ: 25:2] ''جب کبھی ان کو ان میں سے کوئی پھل دیا جائے گا۔'' گویا ان سے اگر جسمانی رزق منقطع ہوا تو کیا حرج ہے۔ ان کو وہ رزق ملتا ہے جو ان

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اس سے خوش رہتے ہیں جو اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے دیا اور اُن کی وجہ سے (بھی) خوش ہوتے ہیں جو اُن کے پیچھے سے انہیں نہیں ملے کہ اُن کو کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (566)

وقف لازم

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

17 ع 16 8

اللہ کی نعمت اور فضل سے خوش ہوتے ہیں اور کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ (567)

کو حیات جاودانی کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

566- يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ اِسْتَبْشَرَ سے مراد ہے کہ جو کچھ کشائش کی اس کو خوش خبری دی گئی تھی اس کو پالیا۔ (غ) اور بشارۃ سے جو سرور حاصل ہو، اس پر بھی اِسْتَبْشَرَ بولا جاتا ہے۔ اس لیے بَشَرَہٗ کے بعد فَاسْتَبْشَرَ بطور فعل لازم لایا جاتا ہے یعنی اس نے اسے خوشخبری دی پس وہ خوش ہوگیا۔ گویا صرف خوش ہوجانے پر بھی بولا جاتا ہے۔

﴿مِّنْ خَلْفِهِمْ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کے پیچھے زندہ باقی رہے ہیں۔

اس آیت اور اس کے بعد کی آیت میں مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ زندگی کے مقصد کو حاصل کرنے میں جو لوگ اپنی جانیں دیتے ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں یہ دونوں گروہ خوش قسمت ہیں۔ گروہ اول یعنی شہداء کا گروہ تو ان خوشیوں اور راحتوں کو پالیتا ہے جو نیکوں کو زندگی بعد الموت میں ملنے والی ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں ان کے لیے یہ بشارت ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے اور نہ ان کو اعداء کا یا شیطان کا خوف رہے گا اور نہ ان کو یہ حزن یا غم ہوگا کہ کیوں انہوں نے خدا کی راہ میں قربانیاں کیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ اہل دنیا کو علم دیتا ہے کہ شہداء اس کی نعماء سے متمتع ہو رہے ہیں اسی طرح وہ شہداء کو علم دے دیتا ہے کہ جو ان کے پیچھے رہے ہیں وہ کامیاب ہوگئے ہیں۔

567- **خوف وحزن سے مراد:** اس آیت میں پچھلی آیت کے آخری حصہ کے مضمون کو دہرایا ہے اور یہ مزید تاکید اور تصریح کے لیے ہے۔ وہاں فرمایا تھا کہ ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف انسان کو کسی امر مکروہ کے پہنچنے کا ہوتا ہے یا مصائب پیش آنے کا۔ تو اس کے مقابل میں فرمایا کہ نہ صرف انہیں امر مکروہ نہیں پہنچے گا بلکہ وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل سے مالا مال ہوں گے۔ اور حزن یا غم اس بات پر ہوتا ہے کہ جب اس کے ہاتھ سے کوئی اچھا موقع نکل جائے یا اس کی کسی کام پر لگائی ہوئی طاقت یا لگایا ہوا مال برباد ہوجائے جس کا آئندہ کے لیے کوئی اچھا اثر پیدا نہ ہو، تو اس کے مقابل پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ یوں خوف وحزن کی تشریح خود فرمادی۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پہلی آیت میں تو صرف خوف وحزن

اَلَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الۡقَرۡحُ ۛؕ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا مِنۡهُمۡ وَ اتَّقَوۡا اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۚ﴿۱۷۲﴾

وہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی اس کے بعد کہ انہوں نے زخم کھایا۔ جنہوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقویٰ کیا ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ (568)

اَلَّذِيۡنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَكُمۡ فَاخۡشَوۡهُمۡ فَزَادَهُمۡ اِيۡمَانًا ۖ وَّ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَ نِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ ﴿۱۷۳﴾

وہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے (مقابلے کے) لیے (لشکر) جمع کیے ہیں پس ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے ان کا ایمان بڑھایا اور انہوں نے کہا اللہ ہمیں کافی ہے اور کیا ہی اچھا کارساز ہے۔ (569)

سے ان کے بچ جانے کی بشارت ہے اور اس میں نعمت اور فضل کے ملنے اور ان کے کاموں پر اجر کے ملنے کی بشارت ہے گویا وہاں دفع مضار کی بشارت ہے تو یہاں حصول منافع کی اور یا ﴿اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ﴾ روحانی طور پر نجات کی خوشخبری ہے اور اللہ کی نعمت اور فضل میں دنیوی فلاح اور دنیوی نعمتوں کی بشارت ہے۔

568- اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ غزوہ حمراء الاسد کے نام سے موسوم ہے۔ اُحد کے واقعہ سے اگلے ہی دن نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو یہ منادی کرائی کہ ہم دشمن کے تعاقب میں نکلنے والے ہیں۔ چنانچہ جس قدر آدمی ساتھ چل سکتے تھے وہ ساتھ ہو لیے۔ ادھر ابوسفیان روحاء کے مقام تک پہنچا تو مشرکین ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ نہ تم نے محمد (ﷺ) کو قتل کیا نہ تمہارے ہاتھ کوئی قیدی آئے۔ اس لیے انہوں نے مشورہ کیا کہ واپس لوٹ کر پھر مسلمانوں کو تباہ کریں۔ مگر ابھی اسی سوچ میں ہی تھے کہ ان کو خبر پہنچی کہ مسلمان ان کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ اس پر وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ وہاں سے فوراً کوچ کیا اور مکہ کو چلے گئے اور نبی کریم ﷺ یہ معلوم کر کے کہ وہ بہت دور نکل گئے ہیں حمراء الاسد سے جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے واپس آ گئے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کس قدر باہمت قوم تھی کہ اس قدر تکلیف دشمن کے ہاتھ سے اٹھا کر پھر بھی اس کا تعاقب کرتے ہیں۔

یہاں ﴿اَلَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ﴾ فرمایا جو اللہ اور **رسول کی فرمانبرداری** اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ جس واقعہ کا ذکر ہے اس میں حکم صرف نبی کریم ﷺ کا تھا۔ یعنی دشمن کے تعاقب کے متعلق۔ لیکن چونکہ قرآن کریم کی رو سے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے اس لیے بجائے صرف اَلرَّسُوۡلُ کہنے کے ﴿لِلّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ﴾ کہا ہے۔

569- ﴿جَمَعُوۡا لَكُمۡ﴾ مفعول محذوف ہے۔ یعنی [جَمَعُوا الْجُمُوْعَ] لشکر اکٹھے کیے ہیں۔

﴿حَسۡبُنَا اللّٰهُ﴾ حسب۔ کفایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ﴿حَسۡبُنَا اللّٰهُ﴾ یعنی اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور ﴿حَسۡبُهُمۡ

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے انہیں کوئی دکھ نہ پہنچا اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (570)

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

یہ شیطان صرف اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے۔ سو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو اگر تم مومن ہو۔ (571)

جَهَنَّمُ ﴾ جہنم ان کے لیے کافی ہے۔

جب ابوسفیان احد کے میدان سے چلا تو اس نے با آواز بلند کہا کہ اے محمد (ﷺ) ہمارے اور تمہارے درمیان اگلے سال بدر صغریٰ پر جنگ ہوگی۔ سو جب اگلا سال آیا تو ابوسفیان اپنی قوم کے ساتھ نکلا جب مرالظہران کے مقام پر پہنچا تو اس کا دل مرعوب ہو گیا اور اس نے واپسی کی ٹھان لی۔ اتنے میں نعیم ابن مسعود اشجعی سے ملا تو ابوسفیان نے اس سے کہا کہ میں نے محمد ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ بدر صغریٰ پر اگلے سال ہماری تمہاری جنگ ہوگی مگر کچھ خشک سالی ہے اور ہم واپس ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اس طرح یہ خوف ہے کہ مسلمانوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور وہ خیال کریں گے کہ ان لوگوں میں ہمارے مقابلہ کی طاقت نہیں اس لیے تم مدینہ جاؤ اور مسلمانوں کو ڈراؤ تا کہ وہ جنگ کے لیے نہ نکلیں اور تمہیں دس اونٹ دوں گا۔ چنانچہ نعیم آیا اور اس نے مسلمانوں کو تیاری کرتے پایا تو اس نے کہا یہ بات ٹھیک نہیں۔ پچھلے سال انہوں نے تم کو کس قدر نقصان پہنچایا اور اب وہ بہت بڑی تیاری کے ساتھ آ رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں نے اس کی پروانہ کی اور کہا ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ چنانچہ مسلمان بدر صغریٰ پر پہنچ گئے جہاں بنی کنانہ کا ایک تجارتی میلہ لگا کرتا تھا اس میں مسلمانوں نے تجارت کر کے بہت فائدہ اٹھایا اور چونکہ وہاں قریش نہیں آئے اس لیے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ ادھر ابوسفیان واپس مکہ میں پہنچ گیا اور اہل مکہ نے اس مہم کا نام **جیش السویق** رکھا یعنی صرف ستو پینے کی مہم تھی۔ مسلمانوں میں یہ غزوہ بدر صغریٰ کے نام سے موسوم ہے۔

570- اس آیت میں غزوہ بدر صغریٰ سے لوٹنے کا ذکر ہے۔ اللہ کی نعمت اور فضل میں ان تجارتی منافع کی طرف اشارہ ہے جو ان کو وہاں حاصل ہوئے اور ﴿لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ﴾ میں یہ بتایا ہے کہ کسی قسم کی بھی تکلیف ان کو نہ پہنچی کیونکہ کوئی جنگ نہ ہوئی او راللہ کی رضا کی پیروی یہ تھی کہ باوجود بھاری لشکر کا خوف دلائے جانے کے انہوں نے کچھ پروانہیں کی بلکہ اللہ کی رضا کو اپنے جان و مال پر مقدم کیا۔

571- ﴿ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ﴾ اس سے مراد وہی نعیم یا وفد عبدقیس ہے اور ذٰلِكُمْ کے لفظ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے حقیقی شیطان

وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

اور وہ لوگ تجھے غمگین نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں یقیناً وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے، اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ (572)

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر خریدا وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ

اور جو کفر کرتے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم جو انہیں مہلت دیتے ہیں یہ ان کے لیے اچھا ہے۔ ہم انہیں مہلت دیتے

ہی مراد لیا ہے۔

﴿يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ﴾ اس کے دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں [يُخَوِّفُكُمْ بِاَوْلِيَاءِهٖ] (گویا مفعول اول محذوف ہے) تم کو اپنے دوستوں یا رفیقوں سے ڈراتا ہے یعنی مسلمانوں کو کفار سے ڈراتا ہے کہ ان کا لشکر بہت بڑا ہے جیسا دوسری جگہ ہے ﴿وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ﴾ [الزمر: 36:39] ''اور تجھے اس سے ڈراتے ہیں جو اس کے سوائے ہیں۔'' اور یا اولیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفار کی جمعیت کے خوف سے جنگ میں نہ نکلتے تھے یعنی منافقین اور مراد یہ ہے کہ شیطان اپنے دوستوں، منافقوں وغیرہ کو ڈرا سکتا ہے مومن اس سے نہیں ڈرتے۔

572- ﴿الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ﴾ کفر میں شدت رغبت کا ذکر منافقین کے زیادہ موزوں حال ہے اور اگلی آیت میں الفاظ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ﴾ ''ایمان کے بدلے کفر خریدا'' بھی منافقوں پر زیادہ چسپاں ہیں۔ مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ ان کے منصوبوں سے انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا اور ﴿لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا﴾ میں مراد اولیاء اللہ ہیں۔

اللہ کا یہ ارادہ کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو ان کے اپنے افعال کا نتیجہ ہے کہ کفر کی طرف ان کی رغبت بہت زیادہ ہے۔ پھر انہوں نے اس کے خلاف منصوبہ بازیاں اور شرارتیں کر کے اسلام کو تباہ کرنا چاہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ان پر نافذ ہو گیا کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔

لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

ہیں آخر وہ گناہ میں بڑھ جاتے ہیں، اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔(573)

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ

اللہ ایسا نہیں کہ وہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر تم ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر

573- نُمْلِيْ۔ مَلَا سے مشتق ہے طویل مدت کو [مَلَاوَۃٌ مِنَ الدَّھْرِ] یا [مَلِیٌّ مِنَ الدَّھْرِ] کہا جاتا ہے۔(غ) جیسے ﴿وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴾ [مریم: 46:19] ''اور تو ایک مدت مجھ سے الگ ہو جا۔'' اس سے اِمْلَاءٌ کے معنی اِمْھَالٌ یعنی مہلت دینا ہیں۔

﴿لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا﴾ لام کا استعمال بمعنی انجام کار بہت ہوا ہے۔ یہ لام عاقبت کہلاتا ہے جیسے قرآن شریف میں آتا ہے: ﴿فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا﴾ [القصص: 8:28] ''پس فرعون کے لوگوں نے اسے اٹھا لیا تا کہ وہ ان کے لیے دشمن اور (موجب) غم ہو۔'' دیکھو مغنی۔ حالانکہ آل فرعون کے اس کو اٹھانے میں یہ غرض نہ تھی کہ وہ ان کا دشمن بنے بلکہ وہ اسے بیٹا بنانا چاہتے تھے یا اس سے کچھ نفع چاہتے تھے۔ ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ [القصص: 9:28] ''شاید وہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔'' اسی طرح ﴿جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ [ابراھیم: 30:14] ''اللہ کے شریک بناتے ہیں تا کہ اس کے رستہ سے گمراہ کریں۔'' حالانکہ ان کی غرض اس اتخاذ سے قرب الٰہی حاصل کرنا تھا جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر: 3:39] ''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے نزدیک کر دیں۔'' پس ﴿لِّيُضِلُّوْا﴾ سے مراد ہے وہ انجام کار ان کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ پس جب دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ﴾ [فاطر: 37:35] ''کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہ دی تھی کہ اس میں نصیحت حاصل کر لیتا جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا تھا۔'' جس سے معلوم ہوا کہ عمر اللہ تعالیٰ اس لیے دیتا ہے کہ تا انسان نصیحت حاصل کرے۔ پس ﴿لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا﴾ میں لام عاقبت کا ہی ہو سکتا ہے یعنی ہمارے مہلت دینے کا نتیجہ یہ ہے۔ بعض نے اس کو شبہ بالتعلیل کہا ہے مگر مآل ایک ہے۔

جنگ اُحد میں کفار کو قرار واقعی سزا نہ ملنے پر وہ سمجھتے تھے کہ بس اب ہم کامیاب ہو گئے۔ فرماتا ہے کہ یہ تو ایک مہلت ہے سو اگر وہ مہلت کو اپنی بھلائی کے لیے استعمال کرتے تو یہ ان کے لیے مفید تھا، مگر وہ تو اس کو اور بھی شرارتوں اور منصوبہ بازیوں میں صرف کرتے ہیں اس لیے اس مہلت کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ ان کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ان پر گرفت کا موقعہ آ جائے۔ اور یہ گرفت کا موقعہ کیا ہے؟ ﴿عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾۔ ذلیل کر دینے والا دکھ یا ذلت کا دکھ۔ سو آخر کار اس قوم کو ذلیل کر کے محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے مغلوب اور مفتوح کی حیثیت میں لایا گیا۔

الطَّيِّبِ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى
الۡغَيۡبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ
مَنۡ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ اِنۡ
تُؤۡمِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَلَكُمۡ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

دے۔[574] اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہیں غیب پر اطلاع دے لیکن اللہ اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہیں بڑا اجر ملے گا۔[575]

574- یَمِیْزَ۔ مِیْزٌ اور یَمِیْزٌ کے معنی ہیں [اَلْفَصْلُ بَیْنَ الْمُتَشَابِهَاتِ] (غ) ملتی جلتی چیزوں کو الگ الگ کر دینا۔

اَلطَّیِّبُ۔ طَیِّبٌ طَابَ سے ہے [دیکھو نمبر: 82] اور انسانوں میں سے طیب وہ ہے جو جہل اور فسق اور برے اعمال کی نجاست سے پاک ہو اور علم اور ایمان اور اچھے اعمال کے زیور سے آراستہ ہو۔ (غ) جیسے: ﴿تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ﴾ [النحل: 32:16] ''جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درآنحالیکہ) وہ پاک ہیں۔'' یا ﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ﴾ [الزمر: 73:39] ''تم پر سلام ہو، تم پاک ہو۔'' یا ﴿هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ [آل عمران: 38:3] ''اپنی جناب سے مجھے پاکیزہ اولاد عطا فرما۔'' اور اس کے مقابل پر خبیث ہے یعنی جس میں باطل اعتقاد، جھوٹ، برے اعمال ہوں۔ [دیکھو نمبر: 343]

مصائب کی غرض:

اس آیت میں بتایا ہے کہ ایک پاک گروہ کو مصائب کے ہاون میں کیوں ڈالا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ منہ کی باتوں سے خوش نہیں ہوسکتا۔ ان میں کچے اور پکے منافق اور مومن یکساں ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں گروہوں کو الگ الگ کرنے کے لیے مومنوں کی کمال وفاداری دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ مصائب لاتا ہے اور اس طرح پر ایک ملے جلے گروہ میں سے خبیث و طیب کو الگ الگ کر دیتا ہے۔

﴿مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ﴾ میں مخاطب منافق ہیں۔ کیونکہ انہی کا یہ اعتراض تھا کہ مصائب کیوں آتی ہیں اور کسی تکلیف کے آنے پر وہ بہت گھبرا اٹھتے تھے۔

575- یَجْتَبِیْ۔ جَبَیْتُ الْمَاءَ کے معنی ہیں میں نے حوض میں پانی جمع کیا اور اس لیے حوض کو [جَابِیَةٌ] کہا جاتا ہے جس کی جمع [جَوَابٌ] آتی ہے جیسے ﴿جِفَانٍ كَالْجَوَابِ﴾ [سبأ: 13:34] ''(بڑے بڑے) لگن جیسے تالاب۔'' اور [اِجْتِبَاءٌ] کے معنی ہیں: [اَلْجَمْعُ عَلٰى طَرِيْقِ الْاِصْطِفَاءِ] (غ) یعنی اصطفاء کے طریق پر جمع کر دینا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے متعلق [اِجْتِبَاءٌ] کے معنی یوں کیے ہیں کہ وہ بندوں کو الٰہی فیض کے ساتھ بغیر بندہ کی کسی کوشش کے خاص کر لیتا ہے جس سے طرح طرح کی نعمتیں حاصل ہوں۔ اور یہ نبیوں کے لیے ہے اور بعض ان لوگوں کے لیے جو صدیقوں اور شہیدوں میں سے ان کا قرب حاصل کر لیتے ہیں۔ (غ)

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع 18 9 9

اور وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے یہ خیال نہ کریں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے۔ قیامت کے دن وہی ان کے گلے کا ہار بنایا جائے گا جس میں وہ بخل کرتے ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ کی ہی ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔ (576)

کیوں ہر شخص کو وحی نہیں ہوتی:

جب یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ مصائب اس لیے بھیجتا ہے کہ تا مومن اپنے کمال کو حاصل کریں۔ تو پھر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اگر کمال تک ہی پہنچانا مقصود ہے تو اللہ تعالیٰ ہم کو خود ہی کیوں غیب پر یعنی اپنی رضا کی راہوں پر اطلاع نہیں دے دیتا تا کہ ہم ان راہوں پر چلیں اور کمال کو حاصل کر لیں۔ گویا ہر ایک کو خود وحی کیوں نہیں ہو جاتی؟ تا کہ وہ اپنے کمال کو حاصل کر لے۔ تو اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ اللہ کی شان قدوسیت کا تقاضا نہیں کہ تم جیسے ناپاک لوگوں کا اس سے تعلق ہو۔ پہلے تمہارا پاک ہونا ضروری ہے اور تمہارے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ راہ رکھی ہے کہ اپنے ایک رسول پر فیضان الٰہی بغیر اس کی کسی سعی کے جاری کر کے اس کے ذریعہ سے دوسروں کو پاک کرتا ہے یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا کہ کہتے ہیں: ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ [الأنعام: 124:6] ”ہم تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہم کو وہ کچھ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا جاتا ہے۔“ وہاں بھی جواب یہی دیا ہے: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام: 124:6] ”اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت کو کہاں رکھے۔“ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ﴿يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [179] کے بعد فوراً فرمایا: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ﴾ یعنی اسی طریق سے تم کمال کو حاصل کر سکتے ہو۔ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو منافقوں کے نام نہیں بتاتا مگر رسولوں کو بتا دیتا ہے۔

576- يَبْخَلُوْنَ۔ بُخْلٌ۔ جود یعنی سخاوت کی ضد ہے اور بخل کے معنی ہیں مال کا وہاں سے روکنا جہاں سے روکنا مناسب نہیں۔ (غ)

يُطَوَّقُوْنَ۔ طَوْقٌ وہ چیز ہے جو گردن میں ڈالی جائے خواہ بلحاظ پیدائش ہو جیسے کبوتر کا طوق یا خود کیا جائے جیسے ہار۔ يُطَوَّقُوْنَ کے معنی ہیں ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ (غ) اور یہ تشبیہ کے طور پر ہے جیسا کہ خود حدیث میں ہے: [يَأْتِيْ أَحَدَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعٌ أَقْرَعُ لَهُ زَبِيْبَتَانِ فَيُتَطَوَّقُ بِهِ فَيَقُوْلُ أَنَا الزَّكَاةُ الَّتِيْ مَنَعْتَنِيْ] یہاں بھی طوق بننے سے مراد اس سے تشبیہ ہے۔ (غ) اور اصل یہ ہے کہ تمام اعمال کا قرآن کریم نے گلے میں ڈالا جانا ہی بیان فرمایا ہے: ﴿وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ [بنی إسرائیل: 13:17] ”اور ہر انسان کے عملوں کو ہم نے اس کی گردن میں ڈالا۔“ پس جس

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾

یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات کو سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم لکھ رکھیں گے جو کچھ انہوں نے کہا ہے اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا بھی اور ہم کہیں گے جلنے کا عذاب چکھو۔ (577)

وقف لازم

طرح تمام اعمال انسان کے گلے کا ہار بن جاتے ہیں اسی طرح بخل بھی گلے کا ہار بن جائے گا۔ ایسے مقامات پر یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ مال جس کے متعلق اس نے بخل کیا تھا اکٹھا کر کے اس کے گلے میں ہار ڈال دیا جائے گا۔ بلکہ منشا یہ ہے کہ اس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑے گا۔

مِیْرَاثٌ۔ وَرِثَ سے ہے۔ وَرَاثَۃٌ اور اِرْثٌ کے معنی ہیں ایک شخص کی طرف کسی دوسرے سے مال کا منتقل ہونا بغیر کسی معاہدہ کے یا ایسے امر کے جو قائم مقام معاہدہ ہو۔ (غ) اس لیے جو مال میت سے منتقل ہوتا ہے اس کو اس نام سے پکارا جاتا ہے اور مال منتقل شدہ کو میراث کہا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے اِرْثٌ بمعنی اصل بھی آتا ہے جیسے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [فَاِنَّكُمْ عَلٰى اِرْثِ اَبِيْكُمْ] جہاں مراد ہے کہ تم اسی اصل پر ہو جس پر تمہارا باپ تھا۔ (غ) اسی طرح جو چیز کسی کو بغیر محنت و مشقت کے حاصل ہو جائے اس پر بھی وارث ہونے کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بھی وارث کہا ہے اس لیے کہ سب کی سب اشیاء اللہ تعالیٰ کی طرف ہی پہنچنے والی ہیں۔ (غ) اسی لحاظ سے یہاں میراث کا لفظ فرمایا اور اسی کے مطابق دوسری جگہ ہے: ﴿وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ﴾ [الحجر: 23:15] ''اور ہم ہی وارث ہیں۔''

577- ذُوْقُوْا۔ ذَوْقٌ کے معنی منہ کے ساتھ طَعْمٌ کا پانا ہے اور اصل میں لفظ ذوق تھوڑے کے متعلق استعمال ہوتا ہے کثیر کے لیے نہیں۔ (غ) مگر قرآن کریم میں عذاب کے لیے لفظ ذوق ہی استعمال ہوا ہے بعض موقعہ پر تو یہ معنی لفظ کی صراحت سے نظر آتے ہیں جیسے: ﴿وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ﴾ [السجدۃ: 21:32] ''اور ضرور ہم انہیں نزدیک کا عذاب بڑے عذاب سے پہلے چکھائیں گے۔'' کیونکہ عذاب ادنیٰ یا اس دنیا کا عذاب بمقابلہ آخرت کے ایک بہت تھوڑی چیز ہے اور بعض مقامات پر ذوق کا لفظ اختیار کر کے یہ اشارہ کیا ہے کہ جو کچھ عذاب آخرت ہے کچھ مزا اس کا انسان یہاں بھی چکھ لیتا ہے۔

الْحَرِيْقِ۔ اَحْرَقَ کے معنی جلایا اور حَرِيْقٌ کے معنی آگ ہیں۔ (غ) ﴿عَذَابُ الْحَرِيْقِ﴾ کے معنی جلانے والا عذاب یا وہ عذاب جس میں جلن ہے۔

یہودیوں کا اسلامی چندوں پر استہزاء:

منافقوں کے جن کا ذکر ہو رہا تھا بڑے حامی اور جنگ اُحد کے بعد مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن جو منافقوں کی

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۱۸۲﴾

یہ اس کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا، اور کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ (578)

طرح اندرونی دشمن تھے کیونکہ بظاہر مسلمانوں سے معاہدہ بھی کر رکھا تھا یہودی تھے، انہی کا یہاں ذکر ہے۔ جیسا کہ قتل انبیاء علیہم السلام کے لفظ میں صاف بتا دیا۔ ایک طرف اسلام میں زکوٰۃ کا قائم کرنا، دوسری طرف صدقات کی ترغیب، پھر جنگوں کے لیے مالی قربانیوں کی ضرورت۔ علاوہ ان سب کے مسلمان اس وقت حالت غربت میں تھے۔ ادھر یہود ہمیشہ سے بوجہ اپنی سود خواری کے ایک مالدار قوم رہی ہے اس لیے یہ لوگ ایسی باتوں پر بھی استہزا کرتے رہتے تھے کہ اللہ تو فقیر ہے کیونکہ اس کے مخلص پرستار تنگی کی حالت میں ہیں اور ہم امیر ہیں۔ اور پھر چندوں اور مالی قربانیوں کے مطالبہ پر استہزا کیا کرتے تھے کہ کیا خدا فقیر ہے جو اسے چندوں کی ضرورت پڑ گئی؟ حالانکہ اس بات سے خوب واقف تھے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ مومنین کو مالی و جانی ہر قسم کی امداد میں شامل ہونا پڑتا ہے مگر ﴿نَحۡنُ اَغۡنِيَآءُ﴾ کہنے والوں کو کچھ ﴿عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ﴾ اس دنیا میں بھی پہنچا دیا جب ان کا غنا حالت فقر سے بدل گیا اور ان کو اپنے املاک وغیرہ چھوڑ کر ملک بدر ہونا پڑا، اور جن کو وہ فقیر کہتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بے حساب رزق دیا۔ واقعی اس نظارہ کو دیکھ کر کیسی جلن ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہوگی۔ یہ آنے والے ﴿عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ﴾ کا مزہ اسی دنیا میں چکھا دیا۔

578- ﴿لَيۡسَ بِظَلَّامٍ﴾۔ ظَلَّامٌ مبالغہ کا صیغہ ہے بہت ظلم کرنے والا۔ مگر نفی مبالغہ سے یہ مطلب نہیں کہ تھوڑا ظلم کر لیتا ہے کیونکہ قرآن کریم خود فرماتا ہے: ﴿وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا﴾ [النسآء: 49:4] ”ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا“ اور پھر فرماتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ﴾ [النسآء: 40:4] اللہ تعالیٰ ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔ مبالغہ کی نفی کی وجہ صاف ظاہر ہے ان کے جس عذاب کا ذکر ہے وہ ایک سخت جلانے والا عذاب ہے اس عذاب کے اگر وہ حق دار نہ ہوتے تو اس کا پہنچانے والا بڑا ظالم ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے فرمایا کہ اتنا بڑا عذاب جو ان کو دیا تو کیا اللہ کوئی بڑا ظالم ہے؟ ہرگز نہیں اور یہ جو کہا گیا ہے کہ نفی کثرت سے اصل کی نفی نہیں ہوتی۔ یہ ہر موقع پر صحیح نہیں اور یہاں بالخصوص روح المعانی میں اس کی ایک لطیف وجہ یہ دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس قدر صفات ہیں وہ مبالغہ کے رنگ کی ہیں۔ کیونکہ ہر ایک صفت اس میں اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ پس اگر ظلم بھی اس کی صفات میں ہوتا تو وہ ظلام یعنی بڑا ہی ظالم ہوتا اور جب اس میں ایک بات علیٰ وجہ الکمال نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ مطلق نہیں۔ پس جب وہ ظلام نہیں تو اس کی صفت میں ظلم مطلق نہیں۔

عَبِيۡدُ۔ عَبۡدٌ ایک بلحاظ تسخیر کے ہے اور اس رنگ میں کل انسان اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں بلکہ دیگر اشیاء بھی۔ اور ایک عبد بلحاظ اختیار بنتا ہے یعنی اللہ کی عبادت کر کے۔ عَبِيۡدٌ عَبۡدٌ کی جمع پہلے معنی میں ہے اس لیے عبد بمعنی غلام کی جمع بھی عبید آتی ہے کیونکہ وہ بھی تسخیر ہے اور دوسرے معنی میں اس کی جمع عِبَادٌ ہے اسی لیے عِبَادٌ کا لفظ اچھے موقع پر بولا گیا ہے جیسے: ﴿عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ﴾ [الفرقان: 63:25] ”رحمٰن کے بندے۔“ ﴿عِبَادِهِ الَّذِيۡنَ اصۡطَفٰى﴾ [النمل: 59:27] ”اس کے بندوں پر جنہیں اس نے چنا۔“ ﴿اَسۡرِ

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہماری طرف تاکیدی حکم بھیجا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس وہ قربانی (نہ) لائے جسے آگ کھاتی ہو۔ کہہ، مجھ سے پہلے رسول تمہارے پاس کھلی دلائل کے ساتھ اور اس کے ساتھ جو تم کہتے ہو آئے، تو ان کو تم نے کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو۔ (579)

بِعِبَادِیْ﴾ [طٰہٰ: 77:20] ''میرے بندوں کو راتوں رات لے جا۔'' ﴿مِنْ عِبَادِنَا﴾ [الکھف: 65:18] ''ہمارے بندوں میں سے۔'' پس عبید کا لفظ زیادہ وسیع ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ نیک پر ظلم کرتا ہے نہ بد پر۔

579- قُرْبَانٍ اصل میں وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے قرب الٰہی حاصل کیا جائے۔ (غ) مگر تعارف میں نَسِیْکَۃٌ یعنی ذبیحہ سے مخصوص ہو گیا ہے جیسے یہاں اور ﴿اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا﴾ [المآئدۃ: 27:5] ''جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی۔''

سوختنی قربانی:

اس آیت میں یہودیوں کے ایک اعتراض کا ذکر ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ حکم ہے کہ کسی رسول کو نہ مانیں مگر اس کو جو ایسی قربانی لائے جسے آگ کھاتی ہو۔ توریت میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ البتہ توریت میں قربانیوں کے متعلق بہت سے احکام ہیں اور ایک قسم کی قربانی ان کے ہاں سوختنی قربانی کہلاتی تھی جو ساری کی ساری آگ میں جلا دی جاتی تھی۔ مگر ایسی قربانی کو انبیاء کہیں سے ساتھ نہ لاتے تھے۔ بلکہ وہی قربانیاں جو لوگ گزارتے تھے ان میں سے بعض قسم کی قربانیوں کو سالم آگ میں جلانے کا حکم تھا اور بعض قسم کی قربانیوں کا کچھ حصہ آگ میں جلایا جاتا تھا اور باقی کاہن کھاتے تھے دیکھو [احبار: 1:6-9, 14:6-16, 26] وغیرہ۔ پس شریعت موسوی میں قربانی کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور آگ کھاتی تھی۔

شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان:

پس ﴿بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ﴾ میں صرف شریعت موسوی یا اس کی سوختنی قربانیوں کا ذکر ہے نہ کچھ اور۔ سورۃ بقرہ میں یہ مفصل ذکر ہو چکا ہے کہ یہودیوں کو جب قرآن شریف پر ایمان لانے کے لیے بلایا جاتا تھا تو وہ یہ جواب دیتے تھے کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہماری طرف اتارا گیا۔ اور دوسری کسی قوم کو شریعت کا دیا جانا نہیں مانتے۔ یہی اعتراض ان کا یہاں بھی ہے صرف اس جگہ شریعت موسوی کا ایک امتیازی نشان بتا دیا ہے اور وہ امتیازی نشان یہ ہے کہ ان کے ہاں قربانیوں کو آگ کھاتی تھی مگر اسلام میں قربانیوں کا کوئی حصہ جلایا نہیں جاتا۔ گویا اسلام کی قربانی نے شریعت موسوی کی قربانی کو منسوخ کر دیا۔ اعتراض کا جواب یوں دیا ہے کہ تمہارے پاس تو ایسے رسول بھی آتے رہے جو شریعت موسوی پر عامل ہونے کی وجہ سے قربانیوں کو جلانے

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔ (580)

کا حکم دیتے تھے۔ پھر باوجود یکہ وہ بینات یعنی کھلے دلائل یا معجزات بھی لائے مگر تم نے ان کو قتل کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء کی مخالفت تمہارے خمیر میں داخل ہوگئی ہے۔ یہاں بَيِّنَاتٌ یعنی دلائل و معجزات کا ﴿بِالَّذِیْ قُلْتُمْ﴾ سے الگ ذکر کر کے یہ بتا دیا ہے کہ ان کا مطالبہ ایسی قربانی کا جسے آگ کھائے معجزہ کے رنگ میں نہ تھا بلکہ معمولی شریعت کا امر تھا اگر معجزات میں یہ امر داخل ہوتا تو ﴿بِالَّذِیْ قُلْتُمْ﴾ کو بَيِّنَاتٌ سے الگ نہ کیا جاتا۔

آگ کا آسمان سے اترنا:

اور یہ جو مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسی قربانی ہوتی تھی جسے ایک سفید آگ آسمان سے اتر کر کھا جاتی تھی۔ سو آسمان سے آگ اترنے کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ ہاں بائبل میں ایک موقعہ پر آگ کے آسمان سے اترنے کا ذکر ہے مگر وہ ایک خاص موقعہ ہے اور ہر اسرائیلی نبی کی صداقت کا یہ نشان بائبل سے ثابت نہیں ہوتا۔ صرف 2 تواریخ ساتویں باب کے شروع میں ہے:

''اور جب سلیمان دعا مانگ چکا تھا تو آسمان سے آگ اتری اور سوختنی قربانی کو اور ذبیحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا۔''

مگر سلیمان کو بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا نہ ان کے قتل کے درپے ہوئے اور یہاں آتا ہے: ﴿فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ﴾ پس اس کی طرف اشارہ نہیں۔

580- زُبُرٌ۔ زَبُوْرٌ کی جمع ہے اور زبور کے معنی ہیں لکھی ہوئی کتاب۔ کیونکہ زَبَرَ کے معنی ہیں كَتَبَ یعنی لکھا۔ بعض نے پتھر میں نقش کرنا بھی اس کے معنی لکھے ہیں۔ (ل) اور زبور ہر ایک کتاب کو کہتے ہیں۔ (ل) اور زُبُرٌ۔ زُبْرَةٌ کی جمع ہے جو اسی مادہ سے الگ لفظ ہے اور جس کے معنی لوہے کا بڑا ٹکڑا ہیں۔ جیسے: ﴿اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ﴾ [الکھف: 96:18] ''میرے پاس لوہے کے (بڑے بڑے) ٹکڑے لے آؤ۔'' اور پھر استعارۃً اس کے معنی ٹکڑے کرنا بھی آتے ہیں۔ جیسے: ﴿فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا﴾ [المؤمنون: 53:23] ''پھر انہوں نے اپنے دین کو آپس میں قطع کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔'' جہاں زُبْرَةٌ کی جمع بجائے زُبَرٌ کے زُبُرٌ آ گئی ہے۔ [زَبَرْتُ الْكِتَابَ] کے معنی [كَتَبْتُهُ كِتَابَةً عَظِيْمَةً] بھی ہیں۔ (غ) یعنی میں نے اس کو بڑا بھاری لکھنا لکھا۔ اور زبور کے معنی ہیں [كُلُّ كِتَابٍ غَلِيْظِ الْكِتَابَةِ] ہر ایک کتاب موٹی کتابت والی۔

اَلْمُنِيْرُ۔ نُوْرٌ روشنی کو کہتے ہیں مگر یہ دو قسم ہے ایک وہ جو معاون بصارت ہے یعنی ظاہری روشنی اور دوسرا وہ جو معاون بصیرت ہے یعنی باطنی روشنی جیسے نور عقل یا نور قرآن۔ اور قرآن کریم کو نور مجسم کہا ہے: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ [المآئدۃ:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ

ہر ایک شخص موت چکھنے والا ہے اور تم کو صرف قیامت کے دن تمہارے پورے اجر دیئے جائیں گے۔ (581) پس جو آگ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا

15:5] ''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کرنے والی کتاب آ چکی ہے۔'' اور منیر کے معنی ذو نور ہیں یعنی روشنی دینے والی۔

زبور اور کتاب:

یہاں انبیاء علیہم السلام کو تین چیزیں دینے کا ذکر ہے۔ بینات، زبور، کتاب منیر۔ بینات سے مراد دلائل نبوت یا معجزات ہیں۔ زبور کے معنی اوپر کتاب بیان ہو چکے۔ بینات پر زبر کا عطف ہونے سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ معجزات الگ امور ہیں اور زبور و کتاب منیر الگ۔ یہ تو ثابت ہو چکا کہ زبور سے مراد کتاب ہی ہے نہ کچھ اور۔ اور قرآن کریم میں صحف یا کتب انبیاء پر یہ لفظ بولا گیا ہے جیسے: ﴿اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ﴾ [الشعرآء: 196:26] ''وہ پہلوں کے صحیفوں میں (موجود) ہے۔'' اور ﴿اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِی الزُّبُرِ﴾ [القمر: 43:54] ''یا تمہارے لیے صحیفوں میں بریت (لکھی ہوئی) ہے۔'' ان دونوں آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زُبُرْ سے مراد انبیا کے صحیفے ہی ہیں نہ کچھ اور پھر دو دفعہ یہ لفظ کیوں لایا گیا۔ یعنی زبر کے بعد پھر کتاب منیر کے لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ زبر سے مراد چھوٹے صحیفے اور کتاب منیر سے مراد توریت، انجیل و زبور ہیں۔ گویا بعض انبیاء کو چھوٹے صحیفے دیئے اور بعض کو ایسی عظیم الشان کتابیں جیسے توریت و انجیل و زبور۔ اور قتادہ سے مروی ہے کہ ﴿الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ﴾ سے مراد زُبُرْ ہی ہیں اور بعض وقت ایک شے کا دوسرے اعتبار سے ذکر کر کے اسے دوبارہ لایا جاتا ہے اور ﴿الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ﴾ کو واحد اس لیے لائے ہیں کہ جملہ کتب سماوی ایک لحاظ سے ایک ہی کتاب ہیں اور زجاج کا قول ہے کہ ہر ایک کتاب ذی حکمت کو زبور کہہ دیا ہے اور جس میں احکام شرعی ہوں اس کو کتاب کہہ دیا ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبور کے معنی میں غلظت یا شدت پائی جاتی ہے اور اس شدت کا تعلق اعدا سے ہوتا ہے اور اس کے مقابل کتاب منیر میں نور کی طرف توجہ دلائی ہے گویا وہ پیروؤں کو ایک نور عطا کرتی ہے۔ پس زبور اسی کتاب کو بلحاظ اس کی شدت کے کہا ہے اور کتاب منیر اسی کو نور اور روشنی کے لحاظ سے کہا ہے۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب کو جو بالخصوص زبور کے نام سے پکارا ہے، تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب میں زیادہ حصہ شدت کا ہے۔

581- اس عبارت کا اس مضمون سے تعلق یوں ہے کہ پچھلی آیات میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو انبیاء علیہم السلام کی معاندانہ مخالفت کرتے ہیں اور ہر مخالفت کا بدلہ فوراً تو ملتا نہیں اس لیے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس لیے فرمایا کہ بے شک ہر عمل کا کھلا کھلا بدلہ تو اس زندگی میں نہیں ملتا مگر ہر شخص پر موت آنے والی ہے اور کھلے کھلے اور کامل اجور کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعث بعد الموت یا قیامت کا دن مقرر کیا ہے لیکن ﴿تُوَفَّوْنَ﴾ پورا پورا دینا کہہ کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ کچھ نہ کچھ یہاں بھی انسان کو

فَقَدۡ فَازَ ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۱۸۵﴾

وہ ضرور مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔ (582)

لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ۟ وَ لَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ مِنَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡۤا اَذًی کَثِیۡرًا ؕ وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۸۶﴾

ضرور تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں آزمائے جاؤ گے اور ضرور تم اُن لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور اُن سے جو مشرک ہوئے بہت سی دکھ دینے والی باتیں سنو گے۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ (583)

مل جاتا ہے۔ اس میں معاندین اسلام کو دہرا زجر ہے ایک یہ کہ اپنی بداعمالیوں کی پوری سزا تو تم قیامت کے دن پاؤ گے اور دوسرے یہ کہ اس سزا کا کچھ حصہ اس دنیا میں بھی مل رہے گا۔

582- زُحۡزِحَ۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ زَحَحٌ ہے اور زَحَّ (مصدر زَحۡزَحَۃٌ) کے معنی ہیں اس کے موضع سے اس کو ہٹا دیا اور الگ کر دیا اور اس سے دور کر دیا۔ (غ۔ل) اور بعض کے نزدیک زَاحَ یَزِیۡحُ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں تاخر یعنی پیچھے رہ گیا۔ (ل)

فَازَ۔ فَوۡزٌ کے معنی ہیں، بھلائی کا کامیابی سے پالینا مع سلامتی کے حصول کے اور مَفَازَۃٌ اس سے مصدر ہے۔ (غ)

غُرُوۡرٌ۔ غَرَرٌ سے مصدر ہے اور [غَرَرْتُ فُلَانًا] کے معنی ہیں اس کو حالت غفلت میں پایا اور جو کچھ ارادہ کیا تھا اس سے حاصل کیا۔ (غ) اور غُرُوۡرٌ۔ غَارٌّ کی جمع بھی ہے جس کے معنی دھوکہ دینے والا ہیں۔

دنیا کی زندگی دھوکا ہونے سے مراد:

اس آیت میں بتایا ہے کہ انسانی زندگی کے مقصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ فَوۡزٌ مراد کو پالینا یا انسانی زندگی کے مقصد کو حاصل کر لینا یہ ہے کہ ایک شخص آگ سے دور کیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے۔ لیکن بعض لوگ اس دنیا کی زندگی کو ہی غرض و غایت سمجھ لیتے ہیں۔ یہاں ﴿الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ﴾ سے مراد صرف دنیا میں رہنا نہیں۔ کیونکہ دنیا میں نیک و بد سب رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کو پیدا کر کے دنیا میں رکھا ہے۔ بلکہ جیسا کہ مقابلہ سے ظاہر ہے کہ مراد یہ ہے کہ حیوانی زندگی کو غرض و غایت انسانی زندگی کی نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ حیوانی زندگی تو لازماً منقطع ہونے والی ہے۔ اس لیے جس نے اس کو غرض و غایت بنایا اس نے بڑا دھوکا کھایا۔ کیونکہ جب یہ منقطع ہوگی تو ایسا شخص گویا خالی ہاتھ رہ گیا۔ قرآن کریم میں جہاں دنیا کی زندگی کی مذمت ہے انہی معنوں میں ہے۔

583- ﴿عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ عزم کے لیے [دیکھو نمبر: 290]۔ ﴿عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ سے مراد [مَعۡزُوۡمَاتُ الۡاُمُوۡرِ] ہیں۔ یعنی ایسے امور جن پر

وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكۡتُمُوۡنَهٗ فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ وَ

اور جب اللہ نے ان سے اقرار لیا جنہیں کتاب دی گئی ہے کہ ضرور تم اس کو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے رہو گے اور اسے نہیں چھپاؤ گے پھر انہوں نے اس کو اپنی

عزم کر لینا چاہیے کیونکہ ان میں کمال خوبی اور شرف اور عزت ہے۔ ہٹ اور ضد کا نام عزم نہیں۔ یا مراد ایسے امور ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے پختہ فیصلہ کر کے ان کو واجب کر دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مالی اور جانی نقصان اور ایذا کی پیشگوئی:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے دو سخت قسم کی ابتلاؤں کا ذکر کیا ہے جو ابھی پیش آنے والے تھے ایک مالی اور ایک جانی ابتلا۔ دوسرا اہل کتاب اور مشرکین سے ایذا کی باتیں سننا۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی اس لیے ان مالی اور جانی ابتلاؤں کا اس میں ذکر نہیں ہوسکتا جو اس جنگ سے پہلے مسلمانوں کو اٹھانے پڑے۔ ہجرت میں یا اس سے پہلے یا اس کے بعد جنگوں میں اور نہ ہی ان ایذا کی باتوں کا ذکر ہوسکتا ہے جو مکہ میں مشرکین سے اور مدینہ میں یہود سے سننی پڑیں کیونکہ ان کے بعد کی یہ آیت ہے اور اس میں آئندہ کا ذکر ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قدر مالی اور جانی ابتلا مسلمانوں کو جنگ اُحد میں یا اس سے پیشتر اٹھانے پڑے اور جس قدر ایذا کی باتیں اس وقت تک سننی پڑیں، نبی کریم ﷺ کے بقیہ حصہ زندگی میں اس قدر ابتلا نہیں اٹھانے پڑے نہ اس قدر ایذا کی باتیں سننی پڑیں۔ بلکہ بعد میں روز بروز اسلام کی قوت بڑھتی گئی یہاں تک کہ سارے ملک عرب پر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا۔ پس یہ مالی اور جانی ابتلا اور یہ ایذا کی باتیں کسی آئندہ زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اُحد کی جنگ کے ذکر کے بعد ان کا ذکر اس لیے کیا کہ جنگ میں بھی مسلمانوں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تو گویا فرمایا کہ اگر یہ مالی اور جانی نقصان تم کو پہنچا ہے تو ابھی اور بھی مالی اور جانی نقصان پہنچنے والے ہیں اور یوں ان الفاظ میں یقیناً اہل اسلام کے ان مالی اور جانی نقصانوں کی طرف اشارہ ہے جو ہمارے اس زمانہ میں ان کو اٹھانے پڑے ہیں اور اسی لیے ان کے ساتھ ایذا کی باتوں کو جمع کیا ہے کہ یہ دونوں باتیں اسی زمانہ میں اکٹھی ہوئی ہیں۔ مالی اور جانی نقصان ظاہر ہیں ملکوں کے ملک چھن گئے، دولت اور املاک ہاتھوں سے نکل گئے، اپنے گھروں سے نکالے گئے، شہید کیے گئے، مرد اور بچے اور عورتیں ہزارہا کی تعداد میں تہ تیغ ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائیوں اور مشرکوں کی طرف سے وہ کچھ ایذا کی باتیں اسلام کے مقدس پیشوا اور بزرگان دین کی نسبت سننی پڑیں کہ الامان۔ اس زمانے میں جو گندے اعتراض اسلام کے خلاف ہوئے ہیں اور جس قدر دشنام دہی کے رسائل تیار ہوئے ہیں ان کا اگر انبار لگایا جائے تو ایک پہاڑ بن جاتا ہے اور چونکہ اس سورت میں اصل عیسائیوں کا ذکر ہے اور احد کی جنگ کا ذکر بھی درمیان میں بطور ایک مثال کے آ گیا تھا اس لیے سمجھایا کہ اسلام پر ایسے مصیبت کے زمانے پہلے بھی آئے ہیں کہ دشمنوں نے سمجھا کہ ہم نے اسے کچل دیا ہے۔ مگر وہ مغلوب کبھی نہیں ہوا ہمیشہ غالب ہی ہوا ہے۔ اس لیے اب بھی جب چاروں طرف سے مسلمان مصائب کا شکار بنے ہوئے ہیں، یہ آیت قرآنی ہمیں تسلی دیتی ہے کہ اسلام اب بھی مغلوب نہ ہوگا۔

اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت لے لی۔ سو کیا ہی برا ہے جو وہ لیتے ہیں۔ (584)

ان مصائب کا علاج:

ان مصائب کا علاج صبر اور تقویٰ بتایا ہے۔ سو صبر دو قسم ہے ایک مصائب میں ہمت نہ ہارنا۔ دوسرا اللہ تعالیٰ کی طاعت پر عمل کے لیے اور اس کے منہیات سے بچنے کے لیے مضبوط کھڑا ہو جانا۔ اور تَتَّقُوْا کو بعد میں رکھ کر بتایا کہ یہاں تقویٰ سے مراد اپنا بچاؤ کرنا ہے ان تدابیر سے جو اس وقت عمل میں لائی جا سکتی ہیں اور حقوق کے نگہداشت بھی مراد ہو سکتی ہے۔

584- **اہل کتاب کا اپنی کتاب کو چھپانا:** جب اہل کتاب کے مسلمانوں کو مالی اور جانی نقصان پہنچانے کا ذکر کیا اور ان کی سب وشتم سے پیشگوئی کے طور پر آگاہ کیا تا کہ مسلمان یہ جان لیں کہ ان کا خدا ان کے مصائب سے غافل نہیں تو ساتھ ہی اہل کتاب کے معاہدات کی طرف توجہ دلائی کہ ان کی کتابوں میں صریح پیشگوئیاں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی موجود تھیں اور ان کو حکم تھا کہ ان کو ظاہر کریں اور چھپا کر نہ رکھیں۔ مگر انہوں نے محض دنیا کی دولت اور دنیا کی عزت کی خاطر جو ثمن قلیل ہے، ان معاہدات کو ان کتب کو پس پشت پھینک دیا۔ مگر جیسا کہ قرآن شریف کا قاعدہ ہے صرف اہل کتاب کو الزام دینا مقصود نہیں، ساتھ ہی مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ تم پر بھی وہ وقت آئے گا کہ خدا کی کتاب قرآن کریم کو کھول کر لوگوں کے لیے بیان نہ کرو گے بلکہ اس کو چھپاؤ گے اور تم بھی اس کے عوض دنیا کی زندگی کے عارضی فائدے چاہو گے۔ چنانچہ جب مسلمانوں میں مال و دولت اور آسائش اور حکومت آئی تو انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا اور دنیا کے پیچھے پڑ گئے۔

مسلمانوں کی بیماری قرآن کو بیان نہ کرنا ہے:

یہاں دو باتیں الگ الگ بیان کی ہیں؛ ایک کھول کر بیان نہ کرنا دوسرے اس کا چھپانا۔ کتاب کا کھول کر بیان کرنا یہ تھا کہ جو احکام اس میں قابل عمل تھے ان کو عمل کے لیے پیش کیا جاتا۔ بجائے اس کے تفسیر کرنے بیٹھے تو یا تو قصوں میں پڑ گئے جن کا نام و نشان تک قرآن میں نہیں ہے یا دماغ سے عجیب عجیب نکتے اختراع کرنے شروع کیے یا اپنے معتقدات کی تائید میں الفاظ قرآنی کو توڑ مروڑ کر لگا لیا اور پھر ان قصوں نے اور عدم تبیین نے توجہ کو آہستہ آہستہ قرآن شریف کی طرف سے ہی ہٹا دیا یہاں تک کہ اس کو بالکل چھپا ہی دیا گیا۔ یہ گویا دوسرا مرتبہ تھا اور یہی آج مسلمانوں کی حالت ہے کہ قرآن شریف ان کے اندر بظاہر بڑی عزت کے مقام پر ہے مگر فی الحقیقت وہ بالکل مخفی ہو رہا ہے۔ عدم بیان کے بعد کتمان کا مرتبہ دوسرا تھا اور پہلے سے بڑھ کر تھا اس لیے ﴿لَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ کو ﴿لَتُبَيِّنُنَّهٗ﴾ کے بعد رکھا ہے حالانکہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کتمان پہلا مرتبہ اور عدم تبیین دوسرا مرتبہ ہے۔ آج اگر غور کیا جائے تو اس قدر مصائب کا آماجگاہ ہونے کے باوجود بھی مسلمان قرآن کے کتمان کے مجرم ہیں۔ ہر طرف توجہ ہوتی ہے مگر قرآن کریم کی طرف نہیں ہوتی۔ سجادہ نشین، علماء اور سیاسی لیڈر عموماً قرآن کی طرف سے لاپروا ہیں۔ بہتیری راہیں مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں مگر قرآن کو تجویز نہیں کرتے۔ پس اہل کتاب کے اس ذکر

لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اَتَوۡا وَّ يُحِبُّوۡنَ اَنۡ يُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ يَفۡعَلُوۡا فَلَا تَحۡسَبَنَّهُمۡ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الۡعَذَابِ ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۸۸﴾

ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں جو انہوں نے کیا اور پسند کرتے ہیں کہ اس کے لیے ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیا۔ یہ ہرگز بھی خیال نہ کرو کہ وہ عذاب سے نجات پا گئے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (585)

وَ لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع 19 9 10

اور آسمانوں اور زمین کا مِلک اللہ کا ہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (586)

اِنَّ فِىۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن

میں مسلمانوں کے اصل مرض کو بھی بتا دیا ہے۔

﴿لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ﴾ کتاب کا کھول کر بیان کرنا لِلنَّاسِ یعنی سب لوگوں کے فائدہ کے لیے ہو۔ اس میں اگر ایک طرف مسلمانوں کی حالت کی اصلاح آ جاتی ہے کہ ان کو اس کتاب پر چلایا جائے تو دوسری طرف غیر مسلموں کے سامنے حق کو پیش کرنا بھی اسی میں داخل ہے مسلمان دونوں سے غافل ہیں مگر بالخصوص یہ دوسرا امر تو ایسا بھلایا ہے کہ اس زمانہ کے مجدد کو تیس سال گزر گئے کہ اس نے مسلمانوں کو جگانا شروع کیا کہ اسلام کی اصلی کامیابی اسی میں ہے مگر کتنے ہیں جنہوں نے توجہ کی۔ جہاں اس قدر اسلام کی کامیابی کی راہوں پر کم وبیش عمل کر کے دیکھ لیا جاتا ہے اس بات کی طرف تجربہ کے لیے بھی لوگ نہیں آتے۔ حالانکہ تاریخ بتاتی ہے کہ یہی بات پہلے اسلام کی اصل کامیابی کا موجب ہوئی۔

585- اصل نقشہ تو اسلام کے دشمنوں کا کھینچا ہے۔ جیسا روایات سے ثابت ہے۔ اہل کتاب ہوں یا منافق۔ اور اس زمانہ میں وہی لوگ جنہوں نے شوکت اسلامی کے مٹانے میں کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی خود مسلمانوں کے منہ سے اپنی تعریف سننے کے خواہاں ہیں۔ مگر سبق مسلمانوں کے لیے تھا۔ آج مسلمانوں کی قوم کو یہ بیماری کھا گئی ہے کام کرنے والے بہت قلیل ہیں اور تھوڑا سا کرتے ہیں تو اس پر اتراتے ہیں اور پھر اکثر کی حالت یہ ہے کہ کرتے کراتے کچھ نہیں۔ اپنی تعریف کے گیت لوگوں سے سننا چاہتے ہیں۔ سجادہ نشین، علماء، لیڈر الا ماشاء اللہ سب اس بلا میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ عذاب الٰہی سے نڈر ہیں مگر وہ پہنچ کر رہے گا۔

586- معاندین اسلام کو بتایا ہے کہ حق کی مخالفت کر کے وہ اپنے آپ کو کامیاب نہ سمجھیں۔

الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾ | کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشان ہیں۔ (587)

الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا | جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں فکر کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے رب تو نے اسے بے فائدہ (588) پیدا نہیں

587- اس رکوع میں اصل ذکر مومنوں کی کامیابی کا ہے اور اسی پر سورت کا خاتمہ ہے اور ان تمہیدی آیات میں کچھ صفات ان مومنوں کی بیان کی ہیں دو قسم کے نشانوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک وہ جو خلق سماوات والارض سے تعلق رکھتے ہیں یعنی مخلوق الٰہی کے ساتھ خواہ وہ آسمانوں پر ہو اور خواہ زمین میں۔ اس میں بھی نظر انسانی کو بہت وسیع کیا ہے۔ ایک ملک تک محدود رکھنا تو ایک طرف رہا ساری زمین تک بھی محدود نہیں کیا بلکہ مومن کی نظر کو اس قدر بلند کیا ہے کہ وہ آسمانوں کی پیدائش پر بھی غور کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ترقی کرتا کرتا آسمانوں کی مخلوق کے حالات کو بھی معلوم کر سکتا ہے۔ دوسری قسم کے نشان جن کا یہاں ذکر کیا ہے وہ ہیں جو لیل و نہار کے اختلاف سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لیل و نہار کے اختلاف سے مراد زمانہ ہے۔ پس صرف مخلوق الٰہی میں ہی جیسے کہ وہ نظر آتی ہے نشان نہیں بلکہ زمانہ میں بھی نشانات ہیں اور قوموں اور امتوں پر جو اختلافات آتے رہتے ہیں وہ سب لیل و نہار کے اختلافات میں شامل ہیں۔

یہ گیارہ آیات یعنی آخر سورت تک نبی کریم ﷺ تہجد کو اٹھتے ہوئے پڑھا کرتے تھے جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ثابت ہے۔

588- ﴿عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ﴾۔ جُنُوۡبٌ۔ جَنۡبٌ کی جمع ہے جس کے اصل معنی پہلو یا کروٹ ہیں۔ (غ)

یَتَفَکَّرُوۡنَ۔ فِکۡرٌ اس کی اصل ہے اور فِکۡرَۃٌ کے معنی ہیں وہ قوت جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے۔ (غ) اور تفکر اس قوت کے جولان کا نام ہے جو عقل کی نظر کے مطابق ہو اور یہ صرف انسان کے لیے ہے نہ حیوان کے لیے۔ (غ)

یہاں مومنوں کی دو بڑی صفات بیان فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کا ذکر ہر حال میں کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ مخلوق میں فکر کرتے ہیں۔ اللہ کا ذکر صرف زبان سے نہیں ہوتا [دیکھو نمبر: 191]۔ بلکہ زبان اور قلب اور جوارح سب سے ہے اور ذکر قلب سے مراد یہ ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت عظمت الٰہی ہو اور عملی حالت میں ذکر الٰہی ہی وہ چیز ہے جس کو انسان اپنے تمام حالات میں آٹھوں پہر چلتا پھرتا ہو یا بیٹھا یا سوتا مدنظر رکھ سکتا ہے۔ ان الفاظ سے صرف ذکر لسان اور اس سے نماز مراد لے کر یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ اس میں گویا یہ ہدایت ہے کہ انسان کھڑا ہو کر نماز ادا کرے۔ اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ کر اس

بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ کیا تو پاک ہے۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ (589)

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ ہمارے رب! جس کو تو آگ میں داخل کرے یقیناً اسے تو نے رسوا کیا، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

کی طاقت نہ رکھتا ہو تو لیٹ کر۔

قرآن کریم نے عبادت اور حصول علم کو اکٹھا کیا ہے:

دوسری صفت مومنوں کی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین کی خلق میں فکر کرتے ہیں اور ان کے فکر کا نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ وہ پکار اٹھتے ہیں ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ یعنی ہر ایک چیز ایک حقیقت رکھتی ہے اور ایک غرض کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اس حصہ میں علوم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ جس قدر علوم دنیا میں پیدا ہوتے ہیں وہ حقیقت اشیاء میں فکر کرنے سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا رہا کہ جب ایک قوم خدا کے ذکر کی طرف متوجہ ہوئی تو علوم سے غافل ہوگئی اور جب علوم کی طرف جھکی تو خدا سے غافل ہوگئی۔ چنانچہ عیسائیت کی تاریخ میں اس کا بہترین نظارہ نظر آتا ہے۔ جب ابتدا میں ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف میلان ہوا تو ایسی خطرناک رہبانیت اختیار کی کہ علوم میں ترقی کو کفر قرار دیا اور مدت تک جو کوئی ان میں علوم طبعی یا حساب وغیرہ کی طرف توجہ کرتا اسے ملحد و بے دین قرار دیا جاتا اور علوم کو شیطانی خیالات سمجھا جاتا۔ لیکن آج اس قوم کی یہ حالت ہے کہ یہاں تک علوم میں توغل ہے کہ خدا کا نام تک لینا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اس سورت میں بالخصوص عیسائیت سے خطاب تھا اس لیے اس کے خاتمہ پر جو صفات مومنوں کی بیان فرمائی ہیں ان میں ان دونوں باتوں کی طرف ایک ہی آیت میں توجہ دلائی ہے کہ ایک طرف ذکر الٰہی سے غافل نہ ہو اور دوسری طرف مخلوق میں تفکر سے کام لو۔ اور حقیقت اشیاء پر غور کر کے علوم کو حاصل کرو۔

589- **اشیاء میں فکر سے خدا کی طرف توجہ دلائی:** آیت کے یہ آخری الفاظ ﴿سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ گویا مخلوق الٰہی میں فکر کا نتیجہ ہیں۔ سُبْحٰنَكَ میں جیسا کہ [نمبر: 47] میں دکھایا جا چکا ہے مقصود اس امر کا ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سب عیوب اور نقصوں سے پاک ہے۔ یہاں یہ لفظ اس لیے لایا گیا کہ جب یہ فرمایا کہ کوئی چیز بھی باطل پیدا نہیں کی گئی اور سب کے اندر کچھ حقیقت اور غرض ہے تو اس دوسرے پہلو سے بچانا بھی ضروری تھا کہ انہی اشیاء کو اور اس مخلوقات کو ہی کامل سمجھ کر دوسری غلطی میں انسان پڑ جائے تو اس لیے فرمایا کہ تمام عیوب سے پاک اور تمام نقصوں سے مبرا ایک ذات الٰہی ہے اور یہ اشیاء سب مخلوقیت کی مہر اپنے اوپر رکھتی ہیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ ہی سب نقصوں سے پاک اور مبرا ہے تو واجب ہے کہ ہر انسان اسی کی طرف رجوع کرے اور اس کا محتاج اپنے آپ کو بنائے اور سب سے پہلے آگ سے بچنے کی دعا سکھائی۔ کیونکہ آگ ہی قیامت کا بدترین عذاب ہے۔ اور آگ یا جلن ہی اس دنیا میں انسان کے سارے امن و اطمینان کو برباد کر دیتی ہے۔ دنیا کی

رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ كَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ ۚ ﴿۱۹۳﴾

ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ہے جو ایمان کے لیے بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ پس ہم ایمان لائے۔ ہمارے رب! سو تو ہماری کمزوریوں کی حفاظت فرما اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہم کو راستبازوں کے ساتھ وفات دے۔ (590)

کامیابی بھی یہی ہے کہ انسان آگ سے بچے اور آخرت کی بھی یہی ہے کہ دوزخ سے نجات پائے۔

590- مُنَادِیۡ۔ نِدَاءٌ سے ہے اور نداء آواز کے بلند کرنے اور اس کے ظہور کو کہتے ہیں اور بعض وقت صوت مجرد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے خواہ اس سے کچھ معنی مفہوم ہوں یا نہ جیسے: ﴿اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ [البقرة: 171:2] ''جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا۔'' اور بعض وقت مرکب پر جس سے معنی مفہوم ہوں ﴿وَ اِذۡ نَادٰى رَبُّكَ مُوۡسٰٓى﴾ [الشعرآء: 10:26] ''اور جب تیرے رب نے موسیٰ کو پکارا۔'' ﴿وَ اِذَا نَادَيۡتُمۡ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾ [المآئدة: 58:5] ''اور جب تم نماز کے لیے بلاتے ہو۔'' اور نَادیٰ کا صلہ اِلیٰ بھی آتا ہے اور لِ بھی اور لِلۡاِيۡمَانِ کے معنی [لِاَجۡلِ الۡاِيۡمَانِ] ہیں اور ﴿اَنۡ اٰمِنُوۡا﴾ اس کی تفسیر ہے اور منادی یہاں رسول اللہ ﷺ کو ہی کہا ہے۔ کیونکہ آپ نے دنیا کو بہت ہی بلند آواز سے پکارا۔ یہاں تک کہ اس بلند آواز کی یادگار اذان میں موجود ہے جس میں اصول دین کی طرف بلایا ہے اور بعض کے نزدیک قرآن شریف مراد ہے اور امام راغب کہتے ہیں کہ منادیٰ میں اشارہ ہے عقل کی طرف اور کتاب کی طرف جو اتاری گئی اور رسول کی طرف جو بھیجا گیا اور تمام نشانات کی طرف جو اللہ تعالیٰ پر ایمان کی طرف دلالت کرنے والے ہیں اور اس کو منادی اس لحاظ سے کہا کہ اس کا ظہور ندا کی طرح ہے۔

اَنۡ مفسرہ ہے اور اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے پہلے بھی جملہ ہو جس میں قول کے معنی پائے جائیں اور بعد میں بھی جملہ ہو۔ اس صورت میں یہ پہلے جملہ کی تفسیر کرتا ہے۔

الۡاَبۡرَارِ۔ بَارٌّ کی جمع (بِرٌّ سے) ہے [دیکھو نمبر: 67] اور بَارٌّ سے ابلغ بَرٌّ ہے جس کی جمع بَرَرَةٌ ہے ﴿بِاَيۡدِىۡ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ؕ﴾ [عبس: 80:15-16] ''لکھنے والوں کے ہاتھوں میں، (جو) معزز نیک (ہیں)۔'' (غ)

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ آگ سے بچاؤ کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ پس آپ پر ایمان لانا پہلی ضرورت ہے اور جب انسان ایمان لاتا ہے تو پھر وہ یہ دعا بھی کرتا ہے کہ اس کے قصوروں کی حفاظت ہوتی رہے اور اس کی برائیاں اور کمزوریاں دور کی جائیں۔ غۡفِرۡ ذُنُوۡبَ کے لیے [دیکھو نمبر: 258]۔ سَيِّئَاتٌ کا لفظ چونکہ تکالیف جسمانی پر بھی بولا گیا ہے اس لیے غفر ذنوب کے ساتھ سَيِّئَاتٌ کے دور کیا جانے کی دعا میں تکالیف جسمانی کے دور کیا جانے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ زیادہ وضاحت کے لیے [دیکھو نمبر: 593] جہاں دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔

رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

ہمارے رب! اور ہمیں وہ عطا فرما جس کا وعدہ تو نے ہمیں اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کرنا۔ بے شک تو وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔ (591)

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ

اُن کے رب نے ان کی دعا قبول کی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ (592) سو جنہوں

591- **دین اور دنیا میں کامیابی کی دعا:** اس سے پہلی آیت میں غفر ذنوب کی دعا تھی اس میں یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے پورے ہوں جن کا تعلق تصدیق رسل سے ہے یا جو رسولوں کی زبان پر کیے گئے تھے اور اس دعا کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ﴿اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا﴾ اور دوسرے میں ﴿لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ یہ مقابلہ صاف دکھاتا ہے کہ پہلے وعدے دنیا کے متعلق ہیں اور دوسرے قیامت کے۔ گویا ﴿لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ کہہ کر یہ بتا دیا ہے کہ پہلے حصہ دعا کا مطلب بھی یہی ہے کہ دنیا میں ذلیل اور رسوا نہ ہوں بلکہ نصرت الٰہی کے ساتھ منصور و مظفر ہوں۔ اور سورۃ البقرۃ میں ایسی ہی دعا پر خاتمہ کر کے صاف الفاظ میں ﴿فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ﴾ [البقرۃ: 286:2] ''پس ہمیں کافر قوم پر مدد دے۔'' کہہ دیا ہے۔

وعدہ کے ساتھ دعا کی ضرورت:

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک امر کا وعدہ ہو تو پھر اس کے لیے دعا کی کیا حاجت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے جو نصرت وغیرہ کے متعلق ہوں ان کا تعلق اعمال سے ہوتا ہے نہ خاص انسانوں سے۔ پس اگر اعمال صالحہ اس حد کو نہ پہنچیں یا کوئی بدعملیاں درمیان میں روک ہو جائیں تو ان وعدوں کا ایفا بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے مومن کی دعا ان اسباب کے پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہے جن پر اس نصرت کا آنا لازم ہے اور ان اسباب کو پیدا ہونے سے روکتی ہے جو اس کے لیے رکاوٹ کا موجب ہو سکتے ہیں۔

592- ﴿بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ﴾ سے یا تو یہ مراد ہے کہ تم سب ایک ہی اصل سے ہو۔ مرد سے عورت اور عورت سے مرد پیدا ہوتا ہے اور یا یہ مراد ہے کہ تم مرد اور عورتیں سب ایک ہی سیرت اور ایک ہی خلق پر ہو۔ جیسے حدیث میں آتا ہے: [سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَیْتِ] (المستدرك على الصحيحين للحاكم، جلد3، صفحہ691، حدیث:6539) سلمان ہم اہل بیت میں سے ہے یعنی ہمارے خلق اور سیرت پر ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے: [مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا] (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا: 294) ''جو ہم سے کھوٹ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔'' یا اتحاد اور اتصال

اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، میں ضرور ان کی تکلیفوں کو ان سے دور کردوں گا اور میں ضرور ان کو باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے بدلہ ہے۔ اور اللہ ہی کے پاس اچھا بدلہ ہے۔ (593)

اسلامی کا ذکر کیا ہے کہ تم سب ایک ہی ہو یعنی تمہارے تعلقات یگانگت کے ہیں۔

دعا کے ساتھ عمل کی ضرورت:

سورہ بقرہ کا خاتمہ بھی ایک دعا پر کیا تھا اور یہاں بھی دعا پر خاتمہ ہے مگر یہاں ساتھ قبولیت دعا کی بھی بشارت دے دی ہے یعنی یہ تمہاری دعا جو ہم نے خود تمہیں سکھائی ہے ضائع نہیں جائے گی بلکہ اللہ تعالیٰ قبول کر چکا ہے اور وہ قبولیت کا جواب جو مومنوں کی اس دعا پر دیا گیا یہ ہے کہ میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کروں گا یعنی ان کے عمل کو بارآور کیا جائے گا اور ان کا مقصود و مطلوب ان کو دیا جائے گا۔ یہ قبولیت دعا ہے کہ کام کرو گے تو اجر پاؤ گے۔ صرف دعا کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ عمل نہیں۔ مسلمانوں نے دعا کے مسئلہ کو کس قدر غلط سمجھ رکھا ہے۔ بعض تو قبولیت دعا کے ہی منکر ہو گئے۔ بعض افراط کی طرف چلے گئے یعنی دعا کی طرف جھکے تو اسباب سے کام لینے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر یہ قرآن کریم کی تعلیم نہ تھی۔

593- ﴿سَيِّاٰتِهِمۡ﴾۔ سَيِّاٰتِ۔ سَيِّئَةٌ کی جمع ہے اور گو سَيِّئَةٌ قبیح فعل کو بھی کہتے ہیں جو نیکی کے مقابل پر ہے مگر حَسَنَةٌ اور سَيِّئَةٌ دونوں کا استعمال ایک اور معنی میں بھی ہوتا ہے یعنی وہ چیز جس کو طبیعت پسند یا ناپسند کرتی ہے جیسے فرمایا: ﴿اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ وَ اِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا﴾ [آل عمران: 120:3] ''اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچے ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی برائی پہنچے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔'' ایسا ہی ﴿ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّىۡ﴾ [ھود: 10:11] ''سب تکلیفیں مجھ سے جاتی رہیں۔'' میں بھی سَيِّاٰتِ سے تکالیف جسمانی مراد ہیں۔ [دیکھو نمبر: 105]

وہ عمل جن پر کامیابی ملتی ہے:

پہلے حصہ آیت میں فرمایا تھا کہ عمل کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا۔ اب اس عمل کی کچھ تفصیل فرمائی ہے پہلا کام جو ان لوگوں نے کیا وہ ہجرت ہے۔ چونکہ وطن سے نکالے جانے کا ذکر بعد میں آتا ہے۔ اس لیے یہاں مراد صرف [تَرَكَ مَا نَهَى اللّٰهُ

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ — جو کافر ہیں ان کا ملکوں میں تصرف تجھے دھوکے میں نہ ڈالے۔ (594)

عَنْهُ] ہے اس کے بعد ہے کہ اپنے گھروں سے نکالے گئے اور رضائے الٰہی کو انہوں نے اس قدر مقدم کیا کہ وطن کی پروا بھی نہیں کی۔ پھر گھروں سے نکال دینے کے بعد بھی خدا کی راہ میں ان کو ایذا پہنچائی گئی۔ ﴿اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ﴾ میں وہ ایذائیں مراد ہیں جو بعد ہجرت کے ان کو برداشت کرنی پڑیں اور ان ایذاؤں کی انتہا یہ ہوئی کہ ان کے اوپر چڑھائی کی گئی تا کہ تلوار کے ساتھ ان کو نابود کیا جائے۔ اس لیے ان کو بھی بالمقابل جنگ کرنی پڑی جس کا ذکر لفظ ﴿قٰتَلُوْا﴾ میں کیا ہے۔ پھر ان جنگوں کے اندر ان میں سے لوگ مارے بھی جاتے ہیں اس لیے ﴿وَقُتِلُوْا﴾ پر ختم کیا۔ گو سارے نہ مارے جائیں مگر ایک قوم نے جب اپنے سر خدا کی راہ میں دے دیئے تو جتنے بھی ان میں سے کٹیں سبھی کو کہا جائے گا کہ انہوں نے اپنے سر کٹوا دیئے۔ یہ وہ عمل ہیں جن پر خدا کی طرف سے اجر ملتا ہے۔

مومنوں سے وعدہ:

یہ تو ان کے عمل ہوئے۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اعمال پر کیا وعدہ ہے، اول یہ کہ میں ان کی تکلیفوں کو ضرور ان سے دور کر دوں گا۔ یہاں سَيِّئَاتٌ سے مراد وہی تکلیفیں معلوم ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا۔ گو لفظ ایسا اختیار کیا ہے جس میں بدیوں اور گناہوں کو دور کر کے ایک پاکیزہ بہشتی زندگی عطا کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اور دوسرا وعدہ قبولیت دعا پر یہ ہے کہ ان کو جنات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور یہ وعدہ گو اخروی زندگی کے متعلق ہے مگر ہر ایک وعدہ کا کچھ نہ کچھ رنگ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس دنیا میں بھی دکھا دیا ہے۔ اس لیے جس طرح سَيِّئَاتٌ کے دور کیا جانے میں دونوں طرف اشارہ ہے قرین قیاس ہے کہ جنت آخرت کے وعدہ میں اشارہ کامیابی اور فتح مندی کی طرف بھی ہے۔ اور الفاظ قرآنی اس دنیوی وعدہ پر یوں صفائی سے صادق بھی آتے ہیں کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں صاف طور پر دجلہ (جس کی جگہ حدیث میں لفظ نیل ہے) اور فرات جیحون اور سیحون کو [اَنْهَارُ الْجَنَّةِ] قرار دیا ہے۔ پس اخروی جنت کے وعدہ کے ساتھ اس دنیا میں بھی فتوحات کا وعدہ مخفی ہے۔ دو دفعہ لفظ ثواب کے لانے میں دونوں وعدوں کی طرف اشارہ ہے۔

گناہوں سے پاک کرنے والی چیزیں:

یہ بھی قابل غور امر ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے کس قدر امور کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ مسیحی تو ایک صلیب مسیح کو لیے پھرتے ہیں کہ اس سے ساری دنیا گناہوں سے پاک ہوگئی۔ مگر یہاں ایک ایک مسلمان صلیب سے بڑھ کر مصیبت اٹھاتا ہے، منہیات کو ترک کرتا ہے، وطن کو چھوڑتا ہے، ایذا دیا جاتا ہے، تلوار سے اس کی جان لینے کی کوشش کی جاتی ہے اور حق یہی ہے کہ ایک کی صلیب سے دوسرا نہیں بچتا بلکہ ہر شخص کو بجائے خود صلیب سے بڑھ کر مصائب اٹھانی ضروری ہیں۔

594- تَقَلُّبٌ۔ قَلْبٌ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا ایک طرف سے دوسری طرف پھیرنا اور تَقَلُّبٌ کے معنی تصرف ہیں۔ (غ) اور [تَقَلُّبَ فِي الْاُمُوْرِ وَالْبِلَادِ] کے معنی دیئے ہیں [تَصَرَّفَ فِيْهَا] یعنی ان میں تصرف حاصل کیا۔ (ل)

مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ ثُمَّ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾	تھوڑا سا سامان ہے، پھر اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔
لٰكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ ﴿۱۹۸﴾ الثلثة	لیکن جنہوں نے اپنے رب کا تقویٰ کیا ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں انہی میں رہیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے، اور جو اللہ کے پاس ہے وہ راستبازوں کے لیے بہت اچھا ہے۔ (595)

عیسائیوں کے تصرف کی پیشگوئی:

یہاں ﴿الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ سے مراد مفسرین نے عموماً مشرکین مکہ کو لیا ہے اور پھر ملکوں میں ان کے تقلب سے مراد ان کی تجارتوں وغیرہ کا ہونا لیا ہے۔ عمومیت الفاظ میں کفار قریش بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہاں ذکر اہل کتاب کا ہو رہا ہے۔ پچھلے رکوع کی آخری آیات میں انہی کا ذکر تھا: ﴿وَ اِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ﴾ [187] اب آگے بھی انہی کا ذکر آتا ہے: ﴿وَ اِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ﴾ [199] بلکہ سیاق عبارت صاف بتاتا ہے کہ یہاں کفار سے مراد اہل کتاب ہی ہیں کیونکہ پہلے ان کافروں کا ذکر کر کے پھر یہ کہہ کر کہ متقیوں کے لیے یہ اجر ہے یوں شروع کیا ہے: ﴿وَ اِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ﴾ جہاں واؤ عاطفہ بتاتی ہے کہ انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کو ابھی ﴿وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ کہا تھا۔ یہودیوں کا تصرف تو نہ اس زمانہ میں تھا نہ بعد میں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ذلت و محکومیت کی پیشگوئی ان کے لیے ہو چکی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس سے مراد عیسائیوں کا تصرف ہے اور یہ آئندہ کے لیے ایک پیشگوئی ہے کہ کسی زمانہ میں تمام ممالک میں ان لوگوں کا تصرف ہو جائے گا اور یہ اس کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ هُمۡ مِّنۡ كُلِّ حَدَبٍ يَّنۡسِلُوۡنَ﴾ [الأنبيآء: 96:21] وہ ہر ایک بلند مقام سے نکل پڑیں گے یعنی تمام بلندیاں خواہ بلحاظ مکان ہوں یا بلحاظ مرتبہ ان کے تصرف میں آجائیں گی اور جب ان کے تصرفات عالم کا نقشہ کھینچا تو ساتھ ہی ایک تسلی بھی دے دی کہ اے مخاطب ان کا ملکوں پر قابض اور متصرف ہو جانا تم کو یہ دھوکہ نہ دے کہ اس عظیم الشان تصرف کے سامنے اب اسلام نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ یہ چند روزہ سامان ہے۔

595- نُزُلٌ [مَا يُعَدُّ لِلنَّازِلِ مِنَ الزَّادِ] (غ) یعنی وہ زاد یا سامان جو نئے مہمان کے لیے تیار کیا جائے۔

یہاں جنات اور نہروں کو متقیوں کے لیے نُزُل کہنے کی وجہ سے جو مہمان کے لیے پہلا پیشکش ہوتا ہے یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اگر جنات یعنی خود بہشت ہی نُزُل یعنی مہمانی کا پہلا پیشکش ہیں تو پھر اصل نعماء جو ملنی چاہئیں کچھ اور ہیں۔ اس لیے بعض نے ان اصل نعماء کو ﴿مَا عِنۡدَ اللّٰهِ﴾ کا مقام یا عندیت یا رؤیت الٰہی قرار دیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنات کے وعدہ میں دو وعدے مضمر

وَ اِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ خٰشِعِيۡنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشۡتَرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

اور اہل کتاب میں سے وہ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو تمہاری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ان کی طرف اتارا گیا۔ اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہیں لیتے۔ انہی کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے۔ بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (596)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلے میں بڑھ کر

ہیں ایک اس دنیا میں فتوحات کا وعدہ اور ایک آخرت کی جنت کا وعدہ، اس لیے ﴿نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ﴾ میں اول الذکر کی طرف اشارہ کیا ہے ﴿وَ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ﴾ میں مؤخر الذکر کی طرف۔

596- **عیسائیوں کے اسلام لانے کی پیشگوئی:** اس آیت میں اہل کتاب میں سے بعض کے ایمان لانے کا ذکر ہے۔ مفسرین نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں کی طرف جو یہود میں سے تھے یا چالیس اہل نجران کی طرف اور بتیس اہل حبش اور آٹھ اہل روم کی طرف جو عیسوی دین پر تھے اشارہ سمجھا ہے اور سب سے زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ نجاشی کی طرف اشارہ ہے جس کا غائبانہ جنازہ بھی نبی کریم ﷺ نے پڑھا مگر میرے نزدیک جس طرح ﴿لَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ﴾ میں عیسائیوں کے آئندہ زمانے میں اسلام کے خلاف بدزبانی کی اور کافروں کے [تَقَلُّبَ فِي الْبِلَادِ] میں عیسائیوں کے دنیا میں تصرف کی پیشگوئی ہے اسی طرح اب یہ بشارت سنا دی ہے کہ ہمیشہ حالت یکساں نہ رہے گی بلکہ اہل کتاب کا ایک حصہ آخر قرآن کریم پر ایمان لائے گا اور اس کی صداقت کو تسلیم کر لے گا۔ ایسے اشارات قرآن کریم میں بہت ہیں جن میں نصاریٰ کے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کی توقع دلائی گئی ہے۔ چنانچہ یہ جو فرمایا: ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الۡيَهُوۡدَ وَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَهُمۡ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰى﴾ [المآئدۃ: 82:5] ''تو یقیناً ان کے لیے جو ایمان لائے دشمنی میں سب لوگوں سے زیادہ سخت یہودیوں کو پائے گا اور ان کو جو مشرک ہیں اور ان کے لیے جو ایمان لائے دوستی میں سب سے قریب تو ان لوگوں کو پائے گا جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔'' اس میں بھی یہی اشارہ ہے کہ یہودیوں میں سے بہت کم لوگ ایمان لائیں گے مگر عیسائیوں میں سے بہت اسلام لائیں گے۔ پس ان سابقین کے ساتھ ہم اس آیت میں ان تمام لوگوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں جو وقتاً فوقتاً نصرانیت کے عقیدہ باطل کو ترک کر کے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کرتے رہے ہیں اور بالخصوص ان لوگوں کو جو ایک معقول تعداد میں اس زمانہ میں اسلام میں شامل ہو رہے ہیں اور جو آئندہ شامل ہوں گے۔

ع 20 11 11 صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ صبر دکھاؤ اور محافظت کرو۔[597] اور اللہ کا تقویٰ اختیار

597- صَابِرُوۡا۔ صَبْرٌ سے مفاعلہ ہے راغب نے اس کے معنی کیے ہیں کہ اپنی خواہشات سے مجاہدہ کرو کیونکہ مُصَابَرَۃٌ میں مقابلہ پایا جاتا ہے اور لسان العرب میں اِصْبِرُوْا کے معنی کیے ہیں [اُثْبُتُوْا عَلٰی دِیْنِکُمْ] اپنے دین پر مضبوط رہو اور صَابِرُوْا کے معنی کیے ہیں [صَابِرُوْا اَعْدَآءَکُمْ فِی الْجِهَادِ] یعنی اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد میں ان سے بڑھ کر صبر دکھاؤ۔ بہرحال صبر میں تینوں قسم کا صبر شامل ہے۔ جس کا ذکر حدیث میں ہے یعنی [صَبَرَ فِی الْمُصِیْبَةِ، صَبَرَ عَلَی الطَّاعَةِ، صَبَرَ عَنِ الْمَعْصِیَةِ] اور مُصَابَرَۃٌ سے مراد مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھانا ہے خواہ حرص و ہوا کے مقابلہ میں ہو یا دشمن کے مقابلہ میں۔

رَابِطُوْا۔ رَبْطٌ سے ہے اور [رَبْطُ الْفَرْسِ] کے معنی ہیں گھوڑے کو حفاظت کے لیے مکان پر باندھنا۔ اور رباط اس مکان کو کہتے ہیں جس میں محافظین کا قیام ہو۔ مفردات میں ہے مُرَابَطَةٌ جس سے رَابِطُوْا ہے دو طرح پر ہے۔ ایک حدود پر گھوڑوں کا باندھنا یعنی دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہنا اور دوسری مُرَابَطَةٌ انسان کے نفس کے متعلق ہے گویا نفس کو حدود پر کھڑا کیا گیا ہے تاکہ وہ انسان کی حفاظت کرے۔ اور نبی کریم ﷺ سے اس کے معنی میں [اِنْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدِ الصَّلٰوةِ] بھی مروی ہیں یعنی ''ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار۔'' لسان العرب میں بھی دونوں معنی رِبَاطٌ یا مُرَابَطَةٌ کے ہیں۔ یعنی ایک دشمن کی حد پر قائم رہنا اور دوسرا ایک امر کی محافظت کرنا۔

بدی اور دشمن دونوں کے مقابلہ میں ایک ہی وقت میں تیاری کی ضرورت:

یہاں فلاح کے لیے تین باتیں بتائی ہیں۔ صَبْرٌ۔ مُصَابَرَۃٌ۔ رِبَاطٌ ان تینوں الفاظ میں اگر ایک طرف نیکی پر قائم ہونے اور باہم اچھا معاملہ کرنے کی ہدایت ہے تو دوسری طرف بدی کے مقابلہ اور دشمن کے مقابل میں تیار رہنے کی ہدایت ہے۔ صبر تو یہ ہے کہ نیکی پر قائم ہو جائے اور معصیت سے رک جائے یا جو مشکلات اور مصائب قضا و قدر سے یا دشمن کی طرف سے پیش آئیں ان کو برداشت کرے اور ان کے نیچے ہمت کو نہ ہارے۔ مصابرۃ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنا یا اپنی خواہشات کے ساتھ جہاد کرنا۔ یا اپنوں اور قریبیوں اور ہمسایوں سے جو دکھ پیش آئیں ان کو برداشت کرنا یا مصائب اور تکلیفوں کی برداشت میں اپنے دشمن سے فوقیت لے جانا ہے۔ گویا دشمن کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر مصائب کو برداشت کرنے کے عادی بنو اور رباط سے مراد لزوم اور ثبات ہے۔ یعنی نیکیوں کے کرنے پر یا بدی سے رکنے یا مصائب و مکارہ کے اٹھانے میں دوام اور مضبوطی اختیار کی جائے۔ اور دشمن کے مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہے اور ایک لحہ بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہو۔ دشمن سے مراد ملکی دشمن ہی نہیں۔ جو لوگ دین پر حملہ کرتے ہیں ان کے مقابلہ میں دلائل اور جواب سے اسی طرح تیار رہنا چاہیے۔ مگر افسوس کہ مسلمان اس قدر غفلت کی نیند سو رہے ہیں کہ ملک اور حکومت تو ہاتھ سے نکلتے تھے اب ان کے مذہب پر بھی حملہ ہو رہا ہے، کتابوں پر کتابیں نکل رہی ہیں اور وہ تاریک کوٹھڑیوں کے اندر آنکھیں بند کیے ہوئے یہی سمجھ رہے ہیں کہ کچھ بھی نہیں

لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۝٢٠٠ کروتا کہ تم کامیاب ہو۔ (597)

ہو رہا۔ تیاری کیسی۔ یہاں تو ایسی غفلت اور نیند میں پڑے ہیں کہ موت قبول کرنے کو راضی ہیں مگر بیدار ہونا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ جس قدر ہوشیار اور چوکس رہنے کی تعلیم اس قوم کو دی گئی تھی اسی قدر زیادہ غفلت میں یہ مبتلا ہو گئے، مگر وہ یاد رکھیں کہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اصول قرآنی کو محکم نہ پکڑیں۔

597۔ سورت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے: ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ﴾ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ کامیاب ہو جاؤ۔ جیسا کہ میں نے اس سورت کی تمہید میں کہا تھا کہ یہ سورۃ اور سورۃ بقرہ دونوں ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں اس لیے جن الفاظ سے سورۃ بقرہ کی ابتدا کی تھی انہی پر آل عمران کا خاتمہ کیا ہے کیونکہ وہاں بھی ﴿هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ﴾ کہہ کر اور یہ بتا کر کہ متقی کون ہیں فرمایا تھا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ یہی کامیاب ہوں گے۔ اب اسی کو آخر میں بیان کیا ہے۔ فلاح، نجات، کامیابی سب تقویٰ میں ہے۔ چونکہ صبر اور مصابرہ اور رباط میں صرف مصائب اور دشمن کا مقابلہ بھی مراد تھا اس لیے یہ بتانے کو کہ مسلمان کے لیے صرف مقابلہ کر لینا ہی کافی نہیں۔ آخر پر تقوی اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ بغیر تقویٰ اختیار کیے اگر دشمن پر غالب بھی آ گئے تو اصل غرض زندگی کی پھر بھی حاصل نہ ہوئی۔ وہ اصل غرض تقویٰ اللہ کی ہے جس کی طرف بار بار قرآن شریف میں توجہ دلائی ہے اور حدیثوں میں بھی ہے۔ یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کسی کو عامل مقرر کرتے وقت بھی تقویٰ اللہ کی نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ معاذ رضی اللہ عنہ کو جب آپ نے یمن پر حاکم کر کے بھیجا تو اس کو بدیں الفاظ نصیحت کی [اتَّقِ اللّٰهَ حَيۡثُمَا كُنۡتَ وَأَتۡبِعِ السَّيِّئَةَ الۡحَسَنَةَ تَمۡحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ] (مسند أحمد: جلد35، صفحہ 284) (ت) اللہ کا تقویٰ کرو جہاں کہیں تم ہو اور بدی کا پیچھا نیکی کے ساتھ کرو وہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے خلق سے پیش آؤ۔

سورۃ النساء

نام:

اس سورت کا نام اَلنِّسَآءِ ہے کیونکہ اس میں عورتوں کے حقوق اور معاشرت اور خانہ داری کے متعلق امور کا ذکر ہے جو امور خانہ داری سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس قدر تفصیل کے ساتھ اس سورت میں ان کا ذکر ہے دوسری کسی سورت میں نہیں۔ خود قرآن شریف نے جس قدر ان امور کو ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور جس قدر عورتوں کے حقوق پر زور دیا ہے دوسری کسی کتاب میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اس سورۃ میں 24 رکوع اور 176 آیات ہیں۔

خلاصہ مضمون:

اس سورت کا خلاصہ مضمون تین بڑے بڑے عنوانوں کے نیچے آتا ہے، یعنی یتیموں اور عورتوں کے حقوق اور ان سے تعلقات۔ منافقین۔ یہودی۔ ان تینوں مضامین کے باہمی ربط کی کنجی پچھلی سورت کے مضمون کے آخری حصہ سے ملتی ہے جہاں جنگ اُحد کا ذکر تھا۔ جنگ اُحد سے جو بڑے بڑے امور پیدا ہوئے وہ یہ تھے کہ

اوّل بہت سے مسلمان مارے گئے تھے اور اس طرح پر بہت سے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں رہ گئیں اس لیے یتامی اور عورتوں کے حقوق پر بحث کی ضرورت پیش آئی۔

دوم جنگ اُحد میں منافق الگ ہو گئے اور وہاں بھی کچھ ذکر ان کا آیا تھا۔ یہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔

سوم اس جنگ نے یہودیوں کی چھپی ہوئی خباثتوں اور ان کی عداوت قلبی کو ظاہر کر دیا۔ اسی لیے سورۃ آل عمران کے آخر پر بھی ان کا کچھ ذکر آیا تھا۔

اس سورت میں ان کی فتنہ پردازیوں کا کسی قدر کھول کر ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ پہلے بھی راستبازوں سے اسی طرح شرارتیں کرتے رہے۔ اسی اثنا میں حضرت مسیح کے ساتھ جو انہوں نے کیا اس کا ذکر کیا ہے اور پھر بالآخر ان کے مقابل پر عیسائیوں کے غلو کا ذکر کیا ہے۔

زیادہ تفصیل کے لیے رکوع وار خلاصہ مضمون دیا جاتا ہے۔

① پہلے رکوع میں یتامیٰ کے حقوق اور ولیوں کی ذمہ داریوں کا ذکر ہے اور اسی اثنا میں عورتوں کے حقوق کی طرف بھی کچھ توجہ دلائی ہے کیونکہ ان کے کمزور اور ضعیف ہونے کی وجہ سے ان کے حقوق بھی یتامیٰ کی طرح پاؤں تلے روندے جاتے تھے۔

② دوسرے رکوع میں حقوق وراثت پر مفصل ہدایات دیں اور اولاد، والدین، میاں بی بی، بھائی بند سب کے لیے حصے مقرر کیے۔

③ تیسرے رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے۔

④ چوتھے رکوع میں ان عورتوں کا ذکر فرمایا جن کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔

⑤ پانچویں رکوع میں کچھ عام نصائح بیان فرما کر اور یہ بتا کر کہ ایک دوسرے کے اموال کو ناحق نہ کھا جاؤ جیسا کہ عرب میں عورتوں اور بچوں کے مال کو کھا جاتے تھے۔ فرمایا کہ عورتوں کے اپنے مال پر وہی حقوق ہیں جو مردوں کے اپنے مال پر ہیں۔

⑥ چھٹے رکوع میں میاں بی بی کے اختلاف کی صورت کا ذکر کر کے احسان کی تعلیم دی، بخل سے روکا، اتفاق کی طرف توجہ دلائی اور رسول ﷺ کی نافرمانی سے ڈرایا۔

⑦ ساتویں رکوع میں اصل غرض کی طرف توجہ دلائی یعنی تزکیہ نفس اور چونکہ نماز تزکیہ نفس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس لیے نماز اور وضو اور تیمم کے متعلق کچھ امور بیان فرمائے۔ یہودی جن ناپاکیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سرچشمہ قدوسیت یعنی ذات الٰہی سے دور پھینکے گئے' ان سے ڈرایا اور شرک کے خطرناک نتائج سے بچنے کے لیے ہدایت فرمائی۔

⑧ آٹھویں رکوع میں بتایا کہ یہودی کس طرح خدا کے احکام سے انحراف کر کے شیطان کے پیچھے لگ گئے اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے معاملات کو نااہلوں کے سپرد مت کرو اور اللہ اور رسول اور اولوالامر کی اطاعت کرو۔ ہاں اولوالامر سے اختلاف ہو تو پھر اللہ اور رسول کے حکم پر عمل کرو۔

⑨ نویں رکوع میں یہ بتایا کہ وہ لوگ جو رسول کے فیصلہ کی طرف نہیں آتے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں کرتے منافق ہیں اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے اعلیٰ سے اعلیٰ انعام پاتے ہیں اور ان کو نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں اور صالحین کی معیت عطا ہوتی ہے۔

⑩ دسویں رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ حفاظت کے لیے جنگ کی ضرورت ہے مگر منافق اپنے آرام اور آسائش کو مدنظر رکھ کر جنگ میں شامل نہیں ہوتے۔ حالانکہ بہت سے کمزور مرد اور عورتیں اور بچے کفار کے ہاتھ سے دکھ اٹھا رہے ہیں۔

⑪ گیارہویں رکوع میں بیان فرمایا کہ منافق مصائب سے بچنے کے لیے جنگ سے دل چراتے ہیں اور پھر رسول اللہ ﷺ کے خلاف مشورے کرتے ہیں اور مسلمانوں میں گھبراہٹ پھیلانا چاہتے ہیں اور فرمایا کہ نبی تو اکیلا بھی جنگ کے لیے مکلف ہے اور اللہ تعالیٰ آخر اس جنگ کو روک دے گا۔

⑫ بارھویں رکوع میں بتایا کہ منافقوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔

⑬ تیرھویں رکوع میں مومن کو قتل کرنے کی سزا بیان فرمائی اور مومنوں کو ہدایت کی کہ ہر ایک شخص کو اپنا دشمن نہ سمجھ لیا کریں۔ ہاں خدا کی راہ میں جہاد کی ضرورت بے شک ہے اور مجاہد کا مرتبہ بیٹھ رہنے والے سے بہت بڑھ کر ہے۔

⑭ چودھویں رکوع میں ان کمزور لوگوں کا ذکر کیا جو ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے تھے۔

⑮ پندرھویں رکوع میں بتایا کہ گو جنگ درپیش آ گئی ہے مگر نماز (جو اصل غرض ہے) اسے کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہیے اور حالت جنگ میں بھی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنی چاہیے۔

⑯⑰ سولہویں اور سترھویں رکوع میں منافقوں کے خفیہ مشوروں کا ذکر کیا۔

⑱ اٹھارھویں رکوع میں شرک کے ہر ایک پہلو سے بچنے کی تاکید فرمائی۔

⑲ انیسویں رکوع میں پھر یتامی اور عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔

⑳ بیسویں میں بتایا کہ اپنا ہو یا غیر ہر ایک کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو اور بتایا کہ جو ایمان لا کر پھر کافر ہو جاتے ہیں یعنی منافق وہ سرسبز نہیں ہوں گے۔

㉑ اکیسویں رکوع میں منافقوں کی سزا کا ذکر کیا۔

㉒ بائیسویں میں یہودیوں کی غلطیوں اور شرارتوں کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ کس طرح پر انہوں نے ایک پاک دامن عورت مریم پر بہتان باندھے اور اس کے بیٹے مسیح رسول اللہ کو صلیب کی سزا دلا کر ملعون ثابت کرنا چاہا۔ مگر خدا نے اس برگزیدہ انسان کو صلیب کی موت سے بچایا اور اپنے قرب کے مراتب عطا فرمائے۔ پھر ان کی دوسری شرارتوں کا ذکر کیا۔

㉓ تئیسویں رکوع میں نبی کریم ﷺ کی صداقت کی طرف توجہ دلائی اور اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے نبیوں سے ایک ہی طرح کلام کرتا رہا ہے اور جس طرح اس نے پہلوں سے کلام کر کے ان کو اپنی رضا کی راہوں پر خبردار کیا، اسی طرح اب اس نے اپنی رضا کی راہیں محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے کھول دی ہیں۔ اور اہل کتاب کو بتایا کہ اگر ایک طرف یہودی مسیح کو دکھ دینے کی وجہ سے قابل الزام ٹھہرے تو دوسری طرف عیسائیوں نے بھی غلو کر کے ایک انسان کو خدا بنا لیا۔

㉔ چوبیسویں رکوع میں بتایا کہ مسیح خدا کا ایک بندہ ہے اور اسی میں اس کی شان ہے اور آخر سورت کا خاتمہ پھر وراثت کے ایک مسئلہ پر کیا جس میں یہ بتانا مقصود تھا کہ اب نبوت کی وراثت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسماعیل کو پہنچی ہے۔

تعلق:

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں اصل غرض اس بات کا بتانا تھا کہ مسلمان کس طرح پر ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے ہیں۔ اس کے بعد اندرونی معاملات قومی پر ہدایت ضروری تھیں اور چونکہ قوم کی زندگی کی بنیاد میاں بی بی کے تعلقات پر ہے اس لیے ترتیب قرآنی میں پہلی دونوں سورتوں کے بعد اسی بات کی ضرورت تھی جس کا ذکر اس سورۃ میں یعنی النساء میں پایا جاتا ہے۔ معاشرت کے صحیح اصول کو جو پایہ قوم کی زندگی میں حاصل ہے علاوہ اس کے کہ خود واقعات عالم اس کی شہادت دیتے ہیں؛ کیونکہ قوم کے وسیع نظام میں گھر بمنزلہ ایک اکائی کے ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی طرف توجہ دلائی ہے جب فرمایا: [خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ] (جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب فضل أزواج النبي ﷺ: 3895؛ سنن ابن

ماجه، كتاب النكاح، باب حسن معاشرة النساء: 1977) گویا بتادیا کہ اخلاق انسانی جو انسان کے مختلف تعلقات میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ان کا معیار گھر کے تعلقات یعنی بی بی سے سلوک ہے اور ان کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔

ایک اور رنگ میں اس سورت کا ربط پہلی سورت سے اس سے ظاہر ہے کہ پچھلی سورت کے آخری حصہ میں جنگ احد کے واقعات کا ذکر تھا اور اس سورت میں انہی امور کا ذکر ہے جو جنگ احد میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ خلاصہ مضمون سورت ہذا کی ابتدا میں دکھایا گیا ہے۔ پس طبعی ترتیب یہی تھی کہ سورت النساء سورت آل عمران کے بعد رکھی جاتی۔

زمانہ نزول:

جیسا کہ اوپر کے نوٹوں سے ظاہر ہے اس سورت کا نزول جنگ احد کے بعد کا ہے اور بیشتر حصہ کا نزول چوتھے سال ہجرت میں ہوا۔ لیکن خاص خاص آیات کا نزول پیچھے کا بھی معلوم ہوتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت موجود ہے کہ سورۃ النساء اس وقت نازل ہوئی جب آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تھیں۔ پس اس کے مدنی ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ ایک آیت کے متعلق البتہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مکی ہے یعنی ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهۡلِهَا﴾ [النساء: 58:4] ''اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو۔'' اس آیت کا شان نزول واقعہ مفتاح کعبہ ہے یعنی فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عثمان رضی اللہ عنہ کو خانہ کعبہ کی کنجی دینا جس کے قبضہ میں پہلے سے یہ کنجی چلی آتی تھی۔ لیکن اس لحاظ سے بھی یعنی اگر اس آیت کو فتح مکہ کے وقت کا نازل شدہ مانا جائے، یہ آیت مکی نہیں کہلائے گی۔ کیونکہ اصطلاح میں جو کچھ ہجرت کے بعد نازل ہوا وہ سب مدنی ہے۔ خواہ وہ مکہ میں ہی نازل ہوا ہے۔ اصل تقسیم قبل ہجرت اور بعد ہجرت کی ہے کیونکہ ان دونوں زمانوں کی نازل شدہ وحی میں ایک بین فرق معلوم ہوتا ہے۔ قبل ہجرت زیادہ تر اصولی تعلیم ہے یعنی توحید، رسالت، معاد وغیرہ پر بحث اور بعد ہجرت تفصیلات شریعت پر زیادہ زور ہے۔ کیونکہ تفصیلات شریعت کی ضرورت بعد ہجرت پیش آئی جب مسلمان ایک قوم کے رنگ میں الگ ہو کر رہنے لگے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عموماً لمبی سورتوں کا نزول ایک لمبے زمانہ پر ممتد رہا ہے اور یہ بات مدنی سورتوں کے متعلق بالخصوص صحیح ہے' کیونکہ تفصیلات شریعت وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہیں اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ جس طرح مثلاً سورۃ بقرہ میں جو پہلے سال ہجرت کی سورت ہے بعض آیات بہت پچھلے زمانہ کی ہیں۔ جیسے آیت ربا۔ اسی طرح اس سورت میں بھی بعض آیات بہت پچھلے زمانہ کی ہوں اور سورۃ احزاب کی بعض آیات کو جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں کا ذکر ہے۔ اس سورت کی آیت تعدد ازدواج کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت تعدد ازدواج پچھلے زمانہ کی ہے۔ یعنی غالباً فتح مکہ کے قریب کے زمانہ کی ہے۔ اس پر مفصل بحث دوسری جگہ آئے گی۔

سُوۡرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ (92) (4) اٰيَاتُهَا 176 رُكُوۡعَاتُهَا 24

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ اللہ کے نام سے جو بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا ہے

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا(598) اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا

598- نَفْسٌ۔ اس کے کئی معنی ہیں۔ روح جیسے: ﴿اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾[الأنعام: 93:6] ''اپنی جانوں کو نکالو۔'' اور نفس ناطقہ یا وہ چیز جو انسان کو حیوانات سے متمیز کرتی ہے [مَا يَكُوْنُ بِهِ التَّمْيِيْزُ] (ل) اس کی مثال دی ہے: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾[الزمر: 42:39] ''اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے ان کی موت کے وقت۔'' اور بعض نے روح اور نفس میں یہ فرق کیا ہے کہ روح وہ ہے جس سے زندگی ہے اور نفس وہ ہے جس سے عقل ہے اور زجاج کا قول ہے کہ ہر انسان کے دو نفس ہیں یعنی حیات اور تمیز اور نیند میں یہی مؤخر الذکر نفس قبض کیا جاتا ہے۔ (ل) اور نفس سے مراد سارا انسان بھی لیا جاتا ہے جیسے: ﴿اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى﴾[الزمر: 56:39] ''(ایسا نہ ہو) کہ کوئی شخص کہے ہائے افسوس۔'' اور کسی چیز کا نفس اس کی ذات ہے اور کسی چیز کے عین اور اس کے جوہر اور اس کی کنہہ کو بھی نفس کہتے ہیں۔ (ل)

﴿نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ سے کیا مراد ہے؟

عموماً یہاں اس سے حضرت آدم ابوالبشر کو مراد لیا گیا ہے۔ مگر دوسری جگہ جہاں یہی لفظ استعمال ہوتے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَا﴾[الأعراف: 189:7] ''جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس سے آرام حاصل کرے۔'' شخص کا ذکر نہیں بلکہ جنس کا ذکر سمجھا گیا ہے۔ (ث) اور امام رازی نے قفال سے اسی کی مثل قول نقل کیا ہے: [هٰذِهِ الْقِصَّةُ عَلٰى تَمْثِيْلِ ضَرْبِ الْمَثَلِ] یعنی ہر انسان کو خطاب ہے کہ اسے ایک ہی انسان سے یعنی اس کے والد سے پیدا کیا اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہاں خطاب اہل عرب سے ہے اور مراد صرف ان کا مورث اعلیٰ ہے۔ پس وہی دو معنی یہاں بھی لیے جا سکتے ہیں اور یوں ﴿نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام بھی ہو سکتے ہیں۔ کسی ایک قوم کا مورث اعلیٰ بھی ہو سکتا ہے اور مثل کے طور پر ہر شخص بھی مراد ہو سکتا ہے۔

یہاں چونکہ حقوق انسانی کی طرف بالخصوص توجہ دلانی تھی اور اس میں بالخصوص کمزوروں یعنی یتامیٰ اور عورتوں کے حقوق کی طرف، اس لیے فرمایا کہ اس نے تم کو ایک نفس یا ایک ہی جی سے پیدا کیا۔ گویا تم سب ایک ہی کنبہ کے لوگ ہو۔ پس تم سب کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں۔ سب انسانوں کو ایک ہی جی سے پیدا کیا یہ بڑی بھاری صداقت ہے اور **اس میں نسل انسانی کے اتحاد کی بنیاد ہے**۔ یورپ نے موجودہ دہریت کی رو کے نیچے یہ بھی خیال کر لیا ہے کہ ایک ماں باپ سے سب انسان پیدا

وَ بَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَ

پیدا کیا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں[599] اور اللہ کے (حقوق کی) جس کے ذریعہ

نہیں ہوئے۔ کیونکہ خط وخال، نقوش، قدوقامت، رنگ کے فرق بہت زیادہ ہیں۔ ایک یورپ کا آدمی خواہ کتنی مدت بھی افریقہ میں رہے اور گو کتنی بھی سیاہی اس کی رنگت پر آجائے مگر وہ پورا حبشی کبھی نہیں بن سکتا اور نہ ایک حبشی یورپ میں رہ کر یورپین کی سفیدی اور خط وخال حاصل کرسکتا ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہ لوگ جو بندر اور انسان کو متحد الاصل مان سکتے ہیں ایک یورپین انسان اور حبشی انسان کو متحد الاصل نہیں مان سکتے۔ اور اس طرح پر نسل انسانی میں ایک تفریق قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ سب نسل انسانی کے حقوق متساوی نہ سمجھے جائیں۔ جب تک نسل انسانی کا اتحاد قائم نہ ہو اس وقت تک تفریقات قومی مٹ نہیں سکتیں اور چونکہ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ سب نسل انسانی ایک ہوجائے اور سب تفریقات قومی مٹ جائیں۔ اس لیے اس حقیقت کی طرف بھی اس نے توجہ دلائی ہے۔

آدم سے پہلی نسل کا وجود:

ہاں قرآن کریم نے بائبل کی طرح یہ نہیں کہا کہ نسل انسانی چھ ہزار سال سے ہے اور نہ ہی اس بات کو منوایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جن کا ذکر دوسری جگہ قرآن شریف میں آیا ہے سب سے پہلے بشر تھے۔ بلکہ بعض روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی آدم ہوئے ہیں اور ابتدا نسل انسانی کی کب سے ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ چنانچہ امامیہ کی روایات میں ایک روایت ہے: [أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ قَبْلَ أَبِيْنَا آدَمَ ثَلَاثِيْنَ آدَمُ بَيْنَ كُلِّ آدَمُ وَآدَمُ أَلْفُ سَنَةٍ وَأَنَّ الدُّنْيَا بَقِيَتْ خَرَابًا بَعْدَهُمْ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ ثُمَّ عُمِّرَتْ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ ثُمَّ خُلِقَ أَبُوْنَا آدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ] (ر) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ آدم سے پہلے تیس آدم پیدا کیے ہر ایک آدم اور آدم کے درمیان ایک ہزار سال گزرے اور ان کے بعد دنیا پچاس ہزار سال ویران رہی پھر پچاس ہزار سال تک آباد ہوئی پھر ہمارے جد امجد آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اور محمد بن علی الباقر سے روایت کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: [قَدْ إِنْقَضٰى قَبْلَ آدَمَ الَّذِيْ هُوَ أَبُوْنَا أَلْفَ أَلْفَ آدَمٍ أَوْ أَكْثَرُ] (ر) اس آدم کے پہلے جو ہمارے باپ ہیں دس لاکھ آدم یا اس سے بھی زیادہ پیدا ہوئے۔ اور شیخ اکبر نے فتوحات میں لکھا ہے کہ ہمارے آدم سے چالیس ہزار سال پہلے ایک اور آدم تھے۔ اور کتاب خصائص میں امام صادق سے روایت ہے: [إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى إِثْنَيْ عَشَرَ أَلْفَ عَالَمٍ كُلُّ عَالَمٍ مِنْهُم أَكْبَرُ مِنْ سَبْعِ سَمٰوَاتٍ وَسَبْعِ أَرْضِيْنَ] (د) یعنی اللہ تعالیٰ کے بارہ ہزار عالم ہیں ان میں سے ہر ایک عالم سات آسمانوں اور سات زمینوں سے بڑا ہے۔

599- **حوا کا آدم سے پیدا ہونا:** الفاظ ﴿خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا﴾ میں یہ اشارہ سمجھا گیا ہے کہ آدم سے اس کے جوڑے یعنی حوا کو پیدا کیا اور یہ اس طرح ہوا کہ آدم کی ایک پسلی نکال کر اس سے حوا بنائی گئی۔ مگر قرآن کریم نے ایسے ہی الفاظ دوسری جگہ استعمال کیے ہیں: ﴿وَ مِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَ جَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّ رَحۡمَةً﴾ [الروم: 21:30]

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے ہی نفس سے تمہارے لیے بیبیاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے تسکین قلب حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحم بنایا اور دوسری جگہ ہے: ﴿وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا﴾ [النحل: 72:16] ''اور اللہ نے تمہارے لیے تم سے ہی عورتیں بنائیں۔'' اب یہاں تمام انسانوں کو یہ کہا ہے کہ تمہاری بیبیاں تمہارے نفسوں سے پیدا کیں۔ حالانکہ یہ مراد نہیں کہ تمہاری پسلیوں سے پیدا کیں۔ پس مرد سے عورت کے پیدا کرنے کا منشا بھی خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے یعنی یہ کہ تم ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرتے ہو اور تم میں محبت و رحمت باہم اس قدر ہے کہ گویا مرد اور عورت دونوں ایک ہی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ایک جگہ ﴿مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ﴾ اور دوسری جگہ مِنۡهَا کا استعمال بالکل درست ہے کیونکہ مرد اور عورت کا اس قدر گہرا تعلق ہے کہ گویا عورت مرد سے ہی بنی ہے یا ﴿خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا﴾ سے مراد یہ ہے کہ جس ایک جی سے اے مردو تم کو پیدا کیا اسی سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا۔ پس تم مرد اور عورت کے درمیان کوئی اس قسم کا تفرقہ نہ کرو کہ ایک کو تو گویا حقوق انسانیت حاصل ہیں اور دوسرے کو نہیں۔ انسان ہونے میں عورتیں تمہارے ساتھ یکساں حقوق رکھتی ہیں کہ جہاں سے مرد پیدا ہوا وہیں سے عورت پیدا ہوئی۔ ہر رنگ میں یہ الفاظ عورت کو ایک نہایت ہی عزت کا مقام دیتے ہیں۔

عورت کا پسلی سے پیدا ہونا:

اور یہ جو خیال ہے کہ حدیث سے حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ پسلی سے پیدا کرنے کا ذکر بے شک بائبل میں پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے:

> ''آدم پر ایک بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا۔''
>
> [پیدائش: 2:21-22]

مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور جس حدیث سے یہ نکالا جاتا ہے وہ دو طرح پر بخاری میں کتاب النکاح میں آئی ہے۔ ایک جگہ ہے: [الْمَرْأَةُ كَالضِّلَعِ] (صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب الْمُدَارَاةِ مَعَ النِّسَاءِ: 5184) عورت پسلی کی طرح ہے اور دوسری جگہ ہے: [وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّهُنَّ خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ] (صحيح البخاری، باب الوصاة بالنسآء: 5186) عورتوں کے حق میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ ان دونوں حدیثوں میں حضرت حوا کے حضرت آدم سے پیدا ہونے کا ذکر مطلق نہیں بلکہ عام طور پر تمام عورتوں کا ذکر ہے۔ اصل میں حدیث کی ایک روایت دوسری کی خود تشریح کرتی ہے۔ [خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ] سے کیا مراد ہے؟ [الْمَرْأَةُ كَالضِّلَعِ] نے اس کو صاف کر دیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ عورتیں پسلی سے تو پیدا نہیں ہوتیں پس مراد وہی ہے جو دوسری حدیث میں بیان کر دی کہ وہ پسلی کی طرح ہیں یعنی ان میں اعوجاج ہے۔ ایسی مثالیں خود قرآن شریف میں ہے: ﴿خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ﴾ [الأنبيآء: 37:21] مطلب یہ ہے کہ اس میں جلد بازی پائی جاتی ہے۔ ﴿اَللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ ضَعۡفٍ﴾ [الروم: 54:30] ''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری (کی حالت) سے بنایا۔'' یعنی تم میں ضعف پایا جاتا ہے۔

الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔ (600)

انسان اول کی پیدائش کس طرح ہوئی؟ کوئی فلسفہ اس کو کھول نہیں سکتا۔ قرآن کریم کی غرض بھی چونکہ یہ نہ تھی کہ انسان کی ابتدائے پیدائش کا ذکر کرے بلکہ اس کی غرض صرف یہ بتانا ہے کہ انسان کیا کمالات حاصل کر سکتا ہے اس لیے زمین و آسمان کس طرح پیدا ہوئے؟ مادہ کس طرح پیدا ہوا؟ روحیں کس طرح پیدا ہوئیں؟ حیوان کس طرح پیدا ہوئے؟ درخت کس طرح پیدا ہوئے؟ انسان کس طرح پیدا ہوئے؟ ان سوالوں کو یہ پاک کتاب نہیں چھیڑتی اور نہ ''کس طرح'' کا جواب کبھی انسان اپنے ان قویٰ کے ساتھ دے سکتا ہے بلکہ دے سکنا تو ایک طرف رہا سمجھ بھی نہیں سکتا۔ خواہ ہم مسئلہ ارتقا کو لے لیں اور خواہ عام طور پر جو مسلمانوں میں خیال پایا جاتا ہے اس کو لے لیں اور خواہ جو بعض دوسرے مذاہب پیش کرتے ہیں اس کو لے لیں۔ انسان اول کی پیدائش کسی عجیب رنگ میں ہی ہوئی جو دنیا کے موجودہ قوانین قدرت سے الگ کوئی قانون ہے۔ خود قرآن کریم نے ﴿ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ ﴾ میں بدءٌ اور عودٌ کے دو قانونوں کا ذکر کیا ہے۔ پس انسان اول کی پیدائش کے لیے کوئی الگ حالات تھے۔ پہلی عورت بھی انہی حالات کے ماتحت پیدا ہوئی ہوگی۔

سوال یہ ہو سکتا ہے کہ عورت میں کیا ٹیڑھا پن پایا جاتا ہے۔ ٹیڑھا پن سے مراد یہاں ایک طرف کا میلان ہے۔ آیا یہ ایک طرف میلان عورت میں مرد سے بڑھ کر ہے؟ واقعات مجبور کرتے ہیں کہ اس کا جواب ہم اثبات میں دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو قسم کی صفات دنیا میں کام کر رہی ہیں ایک نرمی کی صفت اور دوسری صفت خشونت۔ نرمی کی صفت میں اثر پذیری زیادہ ہے اور صفت خشونت میں اثر ڈالنا زیادہ ہے۔ اب قدرت نے مرد و عورت کے ملاپ کے لیے اور ایک کو دوسرے کا زوج بنانے کے لیے یہ تقسیم کی ہے کہ نرمی کی صفت کو عورت میں زیادہ رکھا ہے اور صفت خشونت کو مرد میں زیادہ رکھا ہے۔ اسی لیے مرد و عورت کا تعلق ایک دوسرے کی تسکین قلبی کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک میں جو کمال ہے وہ دوسرے کے نقص کو پورا کر دیتا ہے۔ صفت خشونت کا تقاضا یہ ہے کہ اس صفت کا مالک ہر قسم کی مخالفتوں وغیرہ کا مقابلہ خوب کر سکتا ہے۔ مگر اس کا نقص یہ ہے کہ اس میں محبت اور ہمدردی کی کمی ہوتی ہے۔ نرمی کی صفت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں محبت اور ہمدردی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ صفت چاہتی ہے کہ اس کا مالک جلد اثر قبول کرے اس لیے اس میں نقص یہ ہے کہ وہ جلدی ایک طرف کا میلان اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وہ اعوجاج ہے جس کا ذکر حدیث میں ہے اور یہ عورت کے اس نقص کی طرف توجہ دلاتا ہے جو اس میں صفت محبت و رحم کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہونا ضروری تھا۔ اسی لیے مرد کو منع کیا ہے کہ وہ اس کی اقامت کے درپے ہو جائے۔ چنانچہ [خُلِقْنَ مِنْ ضِلَعٍ] کے بعد آتا ہے: [فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ] حالانکہ اگر یہ کوئی ٹیڑھا پن اپنے معمولی معنی میں ہوتا تو اس کی اصلاح تو مرد کا فرض تھا۔ یہ عورت کا ایک طبعی تقاضا ہے۔ اس لیے وہ اس کے خلاف نہیں کر سکتی اور جو اس سے اس کے خلاف کرانا چاہے گا وہ اس طبیعت کو توڑے بغیر ایسا نہیں کرا سکتا۔

600- تَسَآءَلُوْنَ۔ اس کا اصل تَتَسَاءَلُوْنَ ہے جو باب مفاعلۃ سے ہے یعنی ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ اللہ کے ذریعہ سے

وَ اٰتُوا الۡیَتٰمٰۤی اَمۡوَالَہُمۡ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِیۡثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَہُمۡ

اور یتیموں کو ان کے مال دو اور اچھی چیز کو ردی سے نہ بدلو اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ

ایک دوسرے سے سوال کرنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ کا واسطہ دے کر سوال کیا جاتا ہے اور یہ صرف عرب ہی نہ کرتے تھے کہ ان کو مخاطب سمجھا جائے بلکہ کل دنیا میں اللہ کا واسطہ دے کر سوال کیا جاتا ہے۔

الۡاَرۡحَامَ ۔ رَحِمٌ کی جمع ہے یعنی عورت کا رحم اور استعارۃً قرابت پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ قریبی ایک ہی رحم سے نکلے ہوتے ہیں۔ اسی مادہ سے لفظ رَحۡمَۃٌ۔ رَحۡمٰنٌ وغیرہ ہیں اسی بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحم کا لفظ میرے نام رحمان سے مشتق ہے۔[أَنَا الرَّحْمٰنُ وَأَنْتَ الرَّحِيْمُ شَقَقْتُ اسْمَكَ مِنَ اسْمِيْ] وَالۡاَرۡحَامَ یہاں اللہ پر عطف ہے یعنی[اِتَّقُوا اللّٰہَ وَ الۡاَرۡحَامَ] اور[اِتَّقُوا الۡاَرۡحَامَ]سے مراد ہے ارحام کے حقوق کی نگہداشت کرو جیسا کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی نگہداشت کرو۔[دیکھو نمبر: 10]

رَقِیۡبًا ۔ رَقَبَۃٌ گردن کو کہتے ہیں اور رَقَبْتُہٗ کے معنی ہیں حَفِظْتُہٗ میں نے اس کی حفاظت کی۔ اسی سے رقیب بمعنی حافظ یا نگہبان ہے اور اَلرَّقِیۡبُ اسمائے الٰہی میں سے ایک ہے۔

حقوق العباد صلہ رحمی میں داخل ہیں:

پہلے حصہ آیت میں جو حکم ﴿اتَّقُوْا رَبَّكُمُ﴾ میں دیا گیا تھا اسی کی تفصیل یہاں کی ہے اور ایک طرف اگر حقوق اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے تو دوسری طرف حقوق العباد کی طرف صلہ رحمی کا حکم دیتے ہوئے توجہ دلائی ہے اور حقوق العباد کو صلہ رحمی میں اس لیے داخل کیا ہے کہ ساری نسل انسانی کو ایک ماں باپ کی اولاد قرار دے کر گویا سب کو ایک ہی خاندان کے افراد قرار دیا۔ اس لیے کہ اسلام کی صلہ رحمی کا حکم بھی درحقیقت کل نسل انسانی پر حاوی ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے خود اس صلہ رحمی کا یہی وسیع مفہوم لیا ہے جہاں اہل مصر کو حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے تعلق کی وجہ سے اپنے ننہال قرار دیا ہے اور صحیح مسلم میں ہے کہ جب مصر کے لوگ نہایت تنگی کی حالت میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے لوگوں کو صدقہ کی تحریص دلاتے ہوئے یہ آیت پڑھی: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾[النسآء: 1:4] ''اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو، جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔'' جس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ نے خود ساری نسل انسانی کو ایک ہی کنبہ قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ نیکی کو صلہ رحمی میں داخل کیا ہے اور دوسرے صلہ رحمی سے ہی حقوق العباد کی بنیاد پڑتی ہے۔ کیونکہ انسان کے تعلقات زیادہ تر قریبیوں سے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے حقوق العباد کا بڑا حصہ صلہ رحمی میں آجاتا ہے۔ اور ایک انسان جب قریبیوں سے حسن سلوک کرتا ہے جن سے اسے دن رات واسطہ پڑتا ہے تو وہ دوسروں سے حسن سلوک کا بھی عادی ہو جاتا ہے۔

صلہ رحمی کی تاکید:

یہاں اللہ تعالیٰ نے اتَّقُوا اللّٰہَ والۡاَرۡحَامَ کہہ کر اور رحموں کے حقوق کی نگہداشت کو اپنے حقوق کی نگہداشت کے ساتھ بیان کر کے

اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ کھاؤ یہ بڑا گناہ ہے۔(601)

حقوق رحم کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ صرف عبادت کوئی چیز نہیں جب تک کہ ہر طرح کے حقوق جو انسان کے ذمہ ہیں ادا نہ ہوں۔ احادیث میں صلہ رحمی کی بڑی تاکید آئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رحم کا نام میرے ہی نام سے مشتق ہے:[فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ، وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتُهُ] (صحيح البخاری، كتاب الأدب، باب مَنْ وَصَلَ وَصَلَهُ اللهُ: 5989) ''جو شخص صلہ رحمی کرتا ہے میں بھی اس کے ساتھ ملتا ہوں اور جو شخص قطع رحمی کرتا ہے میں بھی اس سے قطع کرتا ہوں۔'' اور ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:[الصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِينِ صَدَقَةٌ وَهِيَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ] (جامع الترمذی، كتاب الزكاة، باب ما جاء في الصدقة على ذي القرابة: 658) یعنی ''مسکین پر صدقہ صدقہ ہے اور قریبی پر صدقہ دوہری نیکی ہے، وہ صدقہ بھی اور صلہ رحمی بھی۔'' لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اپنے قریبیوں کے سوائے دوسروں کو کچھ دے نہیں۔ اصل سوال استحقاق کا ہے جب دو یکساں محتاج ہوں تو قریبی کا حق بے شک زیادہ ہے۔ اسی لیے قرآن شریف نے جہاں احسان وغیرہ کا حکم دیا ہے وہاں ذوی القربیٰ کو مساکین پر مقدم کیا ہے۔

601- اَلْيَتَامٰى اصطلاح شریعت میں یتیم صرف اس کو کہا جاتا ہے جو حد بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔ حدیث میں ہے:[لَا يُتْمَ بَعْدَ الْحُلُمِ] (مصنف عبدالرزاق: جلد6، صفحہ416، حدیث: 11450) یعنی بلوغت کے بعد یتیمی نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک 18 سال کی عمر بلوغت کی حد ہے۔

﴿الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ﴾ خبیث کے معنی ردی بھی ہیں اور باطل یا حرام بھی اور طیب کے معنی ستھرا بھی ہیں اور پاکیزہ یا حلال بھی۔ پس اس کے دو طرح پر معنی ہو سکتے ہیں حلال مال جو تم خود کما سکتے ہو اس کے بدلے میں یتیموں کا مال نہ لو جو تم پر حرام ہے۔ یا اپنی ردی چیزوں کے ساتھ ان کے مال کی عمدہ چیزوں کو نہ بدل دو اور ﴿اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ﴾ میں اِلٰی بمعنی مَعَ ہے یعنی ان کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔

حُوْبًا۔ حُوْبٌ کے معنی اِثْمٌ یعنی گناہ ہیں۔ اس کا اصول حَوَبَ سے ہے جس کے معنی زجر یا روک دینا ہیں۔

یتامیٰ کی خبر گیری کی تاکید:

چونکہ عورتوں کے حقوق کی طرح یتامیٰ کے حقوق بھی پامال ہوتے تھے اور یہ دونوں گروہ کمزور تھے جن کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لیے ابتدا یتامیٰ کے حقوق سے کی ہے۔ یتامیٰ کی خبر گیری کے لیے اسلام میں اس قدر تاکید پائی جاتی ہے کہ مکی وحی میں جب زیادہ زور صرف توحید باری پر تھا یتامیٰ اور مساکین کی خبر گیری پر بھی اسی طرح زور دیا جاتا تھا۔ گویا بتا دیا کہ ایک خدا کو وہی مانتا ہے جو اس کی بے کس مخلوق پر شفقت کرتا ہے۔

ان آیات میں جن یتامیٰ کا ذکر ہے وہ **صاحب جائداد یتامیٰ ہیں**۔ جس طرح آج کل دنیا میں ہو رہا ہے کہ اپنے بھائی کو کمزور دیکھا تو اس کا مال دبا لیا۔ کسی قوم کو کمزور دیکھا تو اس کا ملک دبا لیا۔ یہی حالت ملک عرب میں تھی کہ ان لوگوں کی جائدادوں کو

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ

اور اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو (ایسی) عورتوں سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند ہوں۔ (602)

جو ابھی بلوغ کو نہ پہنچے ہوتے کھا جاتے تھے۔ یہاں ان یتامیٰ کے بارے میں تین حکم دیئے ہیں۔ اول یہ کہ یتیموں کو ان کے مال دو یعنی ان کی ضروریات کے مطابق ان پر خرچ کرتے رہو ایسا نہ ہو کہ ولی بن کر تم ایسے ان کے مالوں پر متصرف ہو جاؤ کہ ان پر ان کے مال خرچ نہ کرو اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ان کے مالوں کو نہ لگاؤ۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ ان کے مالوں کو جو تمہارے لیے حرام ہیں اپنی حلال کمائی کو چھوڑ کر نہ کھا جاؤ یا اپنی ردی چیزیں ان کی اچھی چیزوں کی جگہ نہ رکھ دو اور تیسرا حکم یہ ہے کہ اپنے مالوں میں ملا کر ان کے مال نہ کھا جاؤ۔ یعنی بظاہر شراکت کا رنگ ہو مگر اصل غرض ان کے مال کو کھانے کی ہو۔

602- طَابَ کے معنی ہیں ایک چیز کا عمدہ اور پاکیزہ ہونا۔ (ل) پس ﴿مَا طَابَ لَكُمْ﴾ سے مراد ہے جس کی طرف بوجہ اس کی عمدگی اور اچھا ہونے کے نفس مائل ہو۔ [دیکھو نمبر: 82] اور اگلی آیت میں اسی سے طِبْنَ خوشی سے دینے کے معنی میں آیا ہے۔

یتامیٰ کے ذکر میں عورتوں سے نکاح کا ذکر کا کیا تعلق ہے؟

اس کی چار توجیہیں کی گئی ہیں:

1. اول وہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بخاری میں مروی ہے یعنی یہ کہ یتامیٰ سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں جو اپنے ولی کی حفاظت میں ہوں اور ولی ان کے مال اور خوبصورتی کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ان سے نکاح کرلیں مگر تھوڑے مہر پر اور پھر چونکہ ان کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہیں اس لیے ان سے اچھا معاملہ نہیں کرتے تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر ایسی یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں تم کو اس بات کا خوف ہو کہ ان کے معاملہ میں انصاف نہیں کرسکو گے تو ان کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں نکاح کرلو۔
2. دوسری توجیہ یہ ہے کہ اس میں چار سے زیادہ نکاحوں سے روکا ہے۔ کیونکہ عرب میں لوگ دس دس عورتوں تک نکاح کر لیتے پھر جب اپنا مال کفایت نہ کرتا تو یتامیٰ کا مال اس طرح اڑا دیتے۔
3. تیسری توجیہ یہ ہے کہ یتیموں کے بارہ میں اگر تم کو ناانصافی کا خوف ہے تو عورتوں کے بارہ میں بھی ناانصافی سے بچو اور چار سے زیادہ بیبیاں نکاح میں نہ لاؤ۔ اگر ان میں بھی عدل نہ کرسکو تو ایک ہی بی بی ہو۔
4. چوتھی توجیہ یہ ہے کہ وہ یتامیٰ کی ولایت کو ناانصافی کے خوف کی وجہ سے مشکل سمجھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اس سے خوف کرتے ہو تو اسی طرح عورتوں کے بارہ میں زنا سے بھی خوف کرو۔ یعنی اگر زنا میں پڑنے کا خوف ہو تو چار تک عورتوں سے نکاح کرلو۔

مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ دو دو اور تین تین اور چار چار (603)

لیکن ان الفاظ کی ایک اور توجیہ بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہاں مراد ﴿مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ میں امہات الیتامیٰ ہیں یعنی یتیم بچوں کی مائیں۔ اور ﴿اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى﴾ میں مراد وہ یتیم بچے ہیں۔ تو گویا آیت کا مطلب یوں ہوا کہ اگر تم کو خوف ہو کہ یتیم بچوں کے بارہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایسی عورتوں سے جن کے وہ بچے ہیں نکاح کرلو۔ کیونکہ نکاح سے وہ بچے اولاد کی حیثیت حاصل کرلیں گے اور ان کی ذمہ داری ان کی والدہ کے شوہر پر ہوگی۔ اس معنی کی [آیت: 127] بھی مؤید ہے۔ اس لیے کہ اس آیت یعنی ﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ﴾ کے بارہ میں یہ مسلم ہے کہ یہ ام کحت رضی اللہ عنہا کے بارہ میں نازل ہوئی جو یتامیٰ کی والدہ تھی۔ پس معلوم ہوا کہ وہ آیت امہات الیتامیٰ کے بارہ میں ہے اور اس لیے اس آیت میں جو اس پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے واضح کرتا ہے کہ یہاں بھی ان عورتوں کے نکاح کا ذکر ہے جو امہات الیتامیٰ ہیں۔ اس توجیہ کے لیے آیت میں کچھ محذوف ماننے کی ضرورت نہیں اور سیاق مضمون بھی یہی چاہتا ہے کیونکہ اصل مضمون اس رکوع میں عورتوں سے نکاح کا نہیں بلکہ یتامیٰ کی خبر گیری ہے۔ پس یتامیٰ کی خبر گیری کی ایک دقت رفع کرنے کے لیے ایسے نکاح کو ایک علاج کے طور پر بتایا ہے۔

﴿مَا طَابَ لَكُمْ﴾ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ **نکاح کے لیے پسندیدگی شرط ہے** اور پسندیدگی کے لیے دیکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ ایک صحابی سے جو ایک انصاری بی بی سے نکاح کرنا چاہتے تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کیا تم نے اسے دیکھ لیا ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ اسے دیکھ لو کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ نقص ہوتا ہے۔ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے کہ نکاح کے لیے عورت کو دیکھنا جائز ہے۔ ہاں اس میں اختلاف ہے کہ عورت کی رضامندی سے دیکھے یا نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں دیکھنے کے لیے عورت کی رضامندی ہونی چاہیے۔ جمہور اس کے خلاف ہیں اور امام مالک کا قول قابل ترجیح ہے اور اس سے ایک اور استنباط بھی ہوسکتا ہے یعنی جب مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے تو عورت کے بھی ایسے مرد کو دیکھ لینے میں کوئی امر خلاف شریعت نہیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا عمل اس پر نہیں یعنی اکثر نکاح بن دیکھے ہوتے ہیں اسی کا نتیجہ بے اتفاقیوں کی کثرت اور طلاق کی زیادتی ہے۔

دوسری بات جو ﴿مَا طَابَ لَكُمْ﴾ سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ نکاح چھوٹی عمر میں نہیں ہونے چاہئیں۔ اس لیے کہ ایک چھوٹی عمر کا بچہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کس طرح کرسکتا ہے جب وہ اس کو سمجھنے کے ہی قابل نہیں۔

603- ﴿مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ﴾ یہ لفظ اِثْنَيْنِ اِثْنَيْنِ اور ثَلَاثَةٌ ثَلَاثَةٌ اور اَرْبَعَةٌ اَرْبَعَةٌ کے قائمقام ہیں یعنی دو دو، تین تین، چار چار۔ اور ان کے درمیان واؤ لانے سے مراد ان کا جمع کرنا نہیں یعنی یہ منشا نہیں کہ ایک ہی شخص دو دو بھی کرلے اور تین تین بھی کرلے اور چار چار بھی کرلے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر ایک کو اس کے حالات کے مطابق دو کی اجازت ہے تو دوسرے کو اس کے حالات کے مطابق تین کی اجازت ہے اور کسی کو چار کی۔ دو اور تین اور چار کو جمع کرکے اس سے نو کی اجازت نکالنا یا دو دو، تین

تین، چار چار کو جمع کر کے 18 کی اجازت نکالنا خلاف قواعد تاویل ہے اور اَوۡ کے ساتھ ان الفاظ کو اس لیے عطف نہیں کیا کہ پھر مراد یہ ہوتی ہے کہ یا دو دو کی اجازت ہے یا تین تین کی یا چار چار کی۔ حالانکہ مطلب یہ تھا کہ کسی کو دو کی اور کسی کو تین کی اور کسی کو چار کی اجازت ہے۔ اور اس ترکیب کے اختیار کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ **چار سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔** کیونکہ جب یوں کہا جائے کہ اس مال کو دو دو اور تین تین اور چار چار کر کے تقسیم کر دو تو اس سے مراد صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ کسی کو دو اور کسی کو تین کسی کو چار دے دو۔ اور چار سے زیادہ کی اجازت اس سے نہیں نکلتی اور نہ ہی یہ مراد ہوتی ہے کہ ایک ہی آدمی کو دو اور تین اور چار یا نو دے دو۔

یہ الفاظ اسلام میں مسئلہ **تعدد ازدواج** کی بنیاد ہیں۔ الفاظ صریحاً ایسے تھے کہ نہ مخالفین کو اعتراض کا موقعہ تھا نہ موافقین کو غلطی لگ سکتی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ جہاں ایک طرف مخالفین نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ گویا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نکاح میں کئی بیبیاں ہوں۔ بعض مسلمان کہلانے والوں نے بھی اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لیے اسے حکم قرار دیا ہے اور یوں اس کی تاویل کر لی ہے کہ سب سے افضل تو یہ ہے کہ چار بیبیاں ہوں ورنہ تین ورنہ دو۔ جس خیال کو قرآن شریف کے صاف الفاظ دھکے دے رہے ہیں۔ سوالات غور طلب اس مسئلہ میں یہ ہیں:

① کیا ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا حکم ہے یا اجازت؟

② کیا اجازت ضرورت کے لیے ہے یا بلا ضرورت بھی ایک سے زیادہ بیبیاں نکاح میں لائی جا سکتی ہیں؟

③ کیا اگر قرآن کریم نے یہی تعلیم دی ہے کہ بوقت ضرورت تعدد ازدواج کی اجازت ہے تو اس مسئلہ پر اعتراض ہو سکتا ہے؟

④ یہ کہ آیا ضرورت کے ہوتے ہوئے چار سے زیادہ بیبیاں نکاح میں لانا جائز ہے؟

یہ اجازت ہے نہ حکم:

سب سے پہلے دیکھنا ہے کہ یہ حکم ہے یا اجازت۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دو تین چار بیبیوں سے نکاح کرنا کسی شرط سے مشروط ہے اور وہ شرط یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہے۔

① پس اول تو یہ آیت صرف ان لوگوں کے لیے ہوئی جن کو یتامیٰ کی خبر گیری سے تعلق پڑتا ہے اور عام نہ ہوئی اور یہ خود اس کے حکم ہونے کے خلاف دلیل ہے۔

② دوسرے یہ بے معنی بات ہے کہ کہا جائے کہ اگر تم کو یتیموں کے بارہ میں انصاف نہ کر سکنے کا خوف ہو تو تمہارے لیے ضروری ہے کہ دو یا تین یا چار بیبیوں سے نکاح کر لو۔ پھر جس قدر توجیہات الفاظ ﴿اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی﴾ کی کی گئی ہیں یا کی جا سکتی ہیں ان سب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشروط اجازت ہے نہ حکم۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ تعدد ازدواج کی اجازت ہے حکم نہیں تو دوسرا امر یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ اجازت ضرورت وقت پر استعمال کرنے کے لیے ہے یا بلا ضرورت بھی۔

① سواول تو لفظ اجازت خود بتاتا ہے کہ یہ صرف ضرورت کے لیے ہے کیونکہ ہر ایک اجازت دنیا میں کسی ضرورت کے لیے ہی ہوا کرتی ہے۔

② دوسرے خود قرآن کریم کے الفاظ اس بات کے مؤید ہیں کیونکہ وہاں خود ایک شرط ساتھ لگادی گویا ایک ضرورت خود بتادی۔ اب ضرورت میں توسیع تو ہوسکتی ہے یعنی جو کام ایک ضرورت کے لیے جائز ہے اس کا جواز اجتہادی رنگ میں کسی دوسری ملتی جلتی ضرورت کے لیے ہوسکتا ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ اس ضرورت کو بالکل اڑا ہی دیا جائے۔

تعدداز دواج کی ضرورتوں کی تصریح کیوں نہیں کی:

ہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم نے ان ضروریات کی تصریح کیوں نہیں فرمادی اس کا جواب یہ ہے کہ جن امور کا تعلق انسانی ضروریات کے مختلف پہلوؤں سے ہے جو ملکوں اور قوموں اور زمانہ اور حالات کے تغیر سے بدلتے رہتے ہیں، وہاں قرآن حکیم ان ضروریات کو گننے کی لاحاصل کوشش سے احتراز فرماتا ہے۔ مثلاً طلاق کا مسئلہ ہے۔ قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ فلاں فلاں ضروریات کے وقت طلاق دینا جائز ہے۔ حالانکہ یہ نہایت ہی بین امر ہے کہ طلاق کی اجازت ضرورت کے لیے دی ہے نہ بلا ضرورت۔ لیکن چونکہ طلاق کے لیے جو ضروریات پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ نہ صرف انسانوں کی مزاجوں کے اختلاف کے ساتھ ہی بدلتی رہتی ہیں۔ بلکہ قومی اور ملکی اور زمانی حالات کے تغیر سے بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان کا بتانا ایک لاحاصل کام تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے ممالک میں جہاں سب قوموں کا ایک ہی مذہب ہے، ایک سی تعلیم ہے، ایک سے خیالات ہیں، ایک سے حالات ہیں، کوئی دو ملک ضروریات طلاق پر اتفاق نہیں کرتے۔ اسی طرح تعدداز دواج کی ضروریات کو خاص کرنا محال ہے۔

تعدداز دواج کی ضرورت:

اب تیسری بات جس پر ہم نے غور کرنا ہے یہ ہے کہ آیا جس صورت میں قرآن کریم نے تعدداز دواج کی اجازت ضرورت کے وقت دی ہے تو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اس بات سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ ہر ایک قوم نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اسلام نے ان ضروریات کا علاج تعدداز دواج کی صورت میں رکھ دیا۔ دوسری قوموں نے اس کے لیے طرح طرح کے اور طریق اختیار کیے حتی کہ بعض ملکوں میں قانوناً زنا کے پیشہ کو تسلیم کیا گیا ہے اور بعض نے اس کو اس حد تک رواج دیا ہے کہ قانونی جواز سے کچھ کم مرتبہ اس کا نہیں رہا۔ اسلام چونکہ عورت کی عزت اور عفت کا حامی ہے اور اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ عورتیں پیسوں کے عوض اپنی عفت کو فروخت کریں۔ اس لیے تعدداز دواج کی صورت میں ان تمام مشکلات کو حل کردیا ہے۔ پھر علاوہ دوسری ضروریات کے جنگ ایک ایسی ہی ضرورت ہے کہ وہ بعض حالات میں تعدداز دواج پر مجبور کردیتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ کا سلسلہ دنیا سے مٹ نہیں سکتا اور جنگوں میں مردوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی رہتی ہے۔ اب چونکہ قدرتی حالت جس کے اندر انسان کو پیدا کیا گیا ہے وہ مرد وعورت کے باہمی تعلق کی حالت ہے اور اسی پر نسل انسانی کی ترقی موقوف ہے۔ اس لیے نسل انسانی کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہر ایک مرد اور ہر ایک عورت اپنے اس فرض کو پورا کرے۔ اب اگر

مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے تو چونکہ بچہ کا پیٹ میں رکھنا' جننا' پرورش کرنا عورت کے فرائض میں داخل ہے۔اس لیے نسل انسانی کا ہر ایک فرد جسے ممکن طور پر یہ موقعہ ہے اپنے اس فرض کو ادا کر سکتا ہے اور جو مرد بلا بیویوں کے رہ جائیں گے وہ کسی صورت میں نسل انسانی کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔لیکن اگر عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اور یہی وہ صورت ہے جو جنگوں اور مردوں کی دوسری ضروریات کی وجہ سے اکثر حالات میں دنیا میں پیش آتی رہتی ہیں تو جو عورتیں بلا خاوندوں کے ہوں گی وہ نسل انسانی کی ترقی میں صرف تعدد ازدواج کے ذریعہ سے معاون ہو سکتی ہیں۔گویا اس صورت میں تعدد ازدواج ایک قومی فرض ہو جاتا ہے اور ایسے حالات میں جب پہلے ہی آبادی کم ہو جاتی ہے ان عورتوں کو خاوندوں کے بغیر چھوڑنا گویا عمداً نسل انسانی کی افزائش کی راہ کو روکنا ہے۔اس کے علاوہ عموماً عورتوں کے معاش کا انحصار مردوں پر ہوتا ہے۔پس جو عورتیں جنگوں میں بیوہ رہ جاتی ہیں یا یتیم رہ جاتی ہیں ان کے متعلق پیچھے رہے ہوئے مردوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی خبر گیری اور پرورش کریں اور اس کے لیے ایک ہی راہ ہے جو قدرت نے رکھی ہے یعنی ان کو نکاح میں لے آنا۔یورپ بے شک تعدد ازدواج کا منکر ہوا ہے لیکن خدا تعالیٰ نے یورپ پر اتمام حجت بھی نہایت بین طور پر کیا ہے۔کیونکہ وہاں باوجود امن کے عورتوں کی تعداد مردوں سے مدت سے بڑھی ہوئی چلی آتی تھی اور پچھلی باہمی جنگ نے اور بھی مردوں کی تعداد کو کم اور عورتوں کی تعداد کو زیادہ کر دیا ہے۔آخر عقلمند غور کریں گے کہ جس صورت میں نسل انسانی کی افزائش کو جنگ سے سخت نقصان پہنچا ہے اور پیچھے کثرت سے عورتیں موجود ہیں جو اگر خاوندوں کے گھروں میں ہوں خواہ ایک خاوند کے گھر میں دو دو' تین تین' چار چار عورتیں ہی کیوں نہ ہوں نسل انسانی کی افزائش کا موجب ہو سکتی ہیں۔تو یہ کس قدر دور اندیشی سے بعید ہے کہ ایک فرضی روک پیدا کر کے نسل انسانی کی افزائش کو اس طرح جنگ کے ساتھ یہ دوسرا صدمہ پہنچایا جائے یا دوسری صورت یہ ہوگی کہ ناجائز تعلقات سے بچے پیدا ہوں جو نہ صرف سوسائٹی اور قوم کے لیے ننگ اور عار کا موجب اور ماؤں کے لیے پرلے درجہ کی ذلت کا باعث ہوں۔بلکہ ان کی خبر گیری کا بھی کوئی اہتمام نہ ہونے کے باعث وہ حقیقی طور پر قوم کی ترقی کا موجب نہیں ہو سکتے۔اور چونکہ ان کا کوئی کفیل بھی نہ ہوگا۔عقلمند انسانوں کا یہی کام ہے کہ فرضی اور وہمی رکاوٹوں پر آخر وہ غالب آجاتے ہیں۔اسی طرح یورپ کے عقلمند مجبور ہو کر اس امر کو قبول کریں گے کہ واقعی بعض حالات میں تعدد ازدواج ایک فرض قومی بن جاتا ہے۔بلکہ اب بھی جبکہ ایک خطرناک عالمگیر جنگ نے یورپ کے بے شمار مردوں کو خاک کے نیچے سلا دیا ہے ایک قوم اس بات پر بحث کر رہی ہے کہ موجودہ حالات کے ماتحت سوائے تعدد ازدواج کے قوم کے تباہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔خود انگلستان میں ہر سو مرد کے لیے ایک سو دس عورتیں ہیں۔

سب الہامی کتابیں اور سب راستباز تعدد ازدواج کے مجوز ہیں:

اس ہدایت کا منجانب اللہ ہونا اس سے بھی ثابت ہے کہ دنیا کی الہامی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جس نے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا ہو۔اور ہر قوم کے بڑے بڑے مقدس اور برگزیدہ لوگوں میں تعدد ازدواج کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔حالانکہ اگر تعدد ازدواج جائز نہیں تو پھر یہ زنا ہے اور یہ کبھی وہم میں نہیں آسکتا کہ تمام قوموں کے مقدس بزرگ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ ذٰلِکَ ایک ایسے امر کا ارتکاب کرتے۔وہ جنہوں نے اللہ کی رضا کے لیے سب کچھ دے دیا وہ ایک امر فاحش کا ارتکاب کبھی نہ کر سکتے

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اور اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی (604)

تھے۔ پھر جب سب الہامی کتابوں نے ادنیٰ سے ادنیٰ گناہوں سے روکا تو کسی کتاب نے تعدد ازدواج سے کیوں نہ روکا؟ خود انجیل باوجود اس کے کہ اس وقت یہودیوں میں تعدد ازدواج پر عمل ہوتا تھا ایک حرف اس کے خلاف نہیں کہتی۔ ہاں پولوس کی تعلیم میں صرف پادریوں کو یہ ہدایت ہے کہ ایک بی بی پر قناعت کریں عوام کو پھر بھی اجازت رہی۔

چار کی حد بندی:

اس دوا کو تجویز کرتے ہوئے اسلام نے دو اور روکیں ایسی تجویز کر دیں ہیں کہ حد اعتدال سے اس کا استعمال نہ بڑھ جائے۔ وہ دو روکیں یہ ہیں کہ اول تو چار تک حد بندی کر دی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چار کی حد بندی کوئی نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک تو اجازت دیتے ہوئے ایک خاص عدد پر بس کر دینا خود اس اجازت کی آخری حد کو بتاتا ہے۔ دوسرے تعامل اس پر شاہد ہے۔ تیسرے بعض روایات سے یہی گواہی ملتی ہے۔ مثلاً نوفل بن معاویہ ایمان لائے تو ان کے ہاں پانچ بیبیاں تھیں۔ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ چار رکھ لو اور ایک کو طلاق دے دو۔ (ک) یا غیلان بن سلمہ ایمان لائے اور ان کی دس بیبیاں تھیں تو نبی کریم ﷺ نے چار رکھ کر باقی کو طلاق کا حکم دے دیا اور اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، دار قطنی اور امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی کہ غیرۃ الاسدی ایمان لائے تو آٹھ عورتوں کے خاوند تھے۔ نبی کریم ﷺ نے چار رکھ کر باقی کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ باقی رہا **نبی کریم ﷺ کی بیبیوں** کا معاملہ۔ سو چونکہ یہ مضمون بطور خود علیحدہ بحث چاہتا ہے اس لیے اس پر سورۃ احزاب میں مفصل بحث ہوگی جہاں یہ ذکر ہے۔ اس قدر یہاں بتا دینا کافی ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کو بھی یہ حکم ہوا تھا کہ وہ اور بیبیاں نکاح میں نہ لائیں بلکہ جو اس وقت آپ کے نکاح میں تھیں ان کو طلاق دے کر ان کی جگہ اور شادی کرنے سے بھی روکا گیا تھا۔ ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ﴾ [الأحزاب: 52:33] ''(اس کے) بعد تیرے لیے (اور) عورتیں (نکاح میں لانا) جائز نہیں۔ اور نہ یہ کہ تو ان کی جگہ دوسری بیویاں بدل لے۔'' اس لیے آپ کے عقد میں جو نو بیبیاں تھیں تو چونکہ یہ شادیاں اغراض دینی کے لیے ہوئی تھیں اس لیے آپ کو یہ حکم نہ ہوا تھا کہ چار رکھ کر باقی کو طلاق دے دیں۔ دوسری روک جو تعداد ازواج کے مسئلہ پر قرآن کریم نے روشنی ڈالی ہے وہ عدل کا قائم رکھنا ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

604- اس حصہ میں بتایا ہے کہ اگر ضرورت بھی پیدا ہو مگر ایک شخص دو بیبیوں میں عدل قائم نہیں رکھ سکتا تو پھر ایک شوہر اور ایک بی بی کے اصول پر ہی عمل کرے۔ اس سے دو کھلے نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک شوہر اور ایک بی بی کا اصول ہی نکاح میں اصل الاصول ہے اور یہ ایسا مستحکم اصول ہے کہ گویا ضروریات بھی دوسرے رنگ کی پیدا ہو جائیں جو تعداد ازواج کو ضروری ٹھہرا دیں۔ تاہم اگر ایک شخص صرف اس بات پر قادر نہیں کہ وہ دو بیبیوں میں عدل قائم رکھ سکے تو بھی وہ ایک بی بی سے زیادہ نکاح میں نہ لائے۔ پس قرآن کریم نے صاف طور پر سمجھا دیا کہ نکاح میں قاعدہ یہی ہے کہ ایک بی بی اور ایک شوہر ہو۔ ہاں جب ضروریات پیدا ہو جائیں تو پھر تعدد ازدواج کی طرف بطور ایک استثناء کے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى یا جس کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے(605)

عدل کی شرط:

دوسرا نتیجہ جو ان الفاظ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ تعدد ازدواج پر عدل کی روک ایک بڑی بھاری روک ہے اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ لَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَ لَوْ حَرَصْتُمْ﴾ [النسآء: 129:4] ''تم طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کرسکو خواہ تم کتنا ہی چاہو۔'' ان الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ غلطی بھی کھائی ہے کہ یہاں عدل کی شرط رکھ کر اور دوسری جگہ عدل کو انسانی استطاعت سے باہر قرار دے کر تعلیق بالمحال کردی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں ایک امر کی اجازت دینا اور پھر اس کو ایک محال امر کے ساتھ مشروط کرنا قرآن جیسی حکیم کتاب کی طرف منسوب نہیں ہوسکتا۔ اگر یہی منشا تھا تو صاف یوں ہی فرمادیا ہوتا کہ تعدد ازدواج کی تمہیں اجازت ہی نہیں۔ یہ محض یورپ کی تقلید نے باتیں کہلوائی ہیں۔ مگر مقلدین یورپ خوب یاد رکھیں کہ یورپ ایک سیہ کاری اور گند کے اندر مبتلا ہے جس سے اگر کبھی وہ باہر نکل سکتا ہے تو خدا کے بتائے ہوئے علاج تعدد ازدواج کے ذریعہ سے ہی نکل سکتا ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ جہاں عدل کے ساتھ تعدد ازدواج کو مشروط کیا ہے تو وہاں مراد ظاہری سلوک میں عدل ہے یعنی نان ونفقہ میں، باری میں اور ظاہری امور میں اور جہاں یہ فرمایا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکتے وہاں محبت میں مساوات مراد ہے یعنی دو بیبیوں سے یکساں محبت ہونا یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے اور اس پر خود قرینہ شاہد ہے کیونکہ وہاں آگے فرمایا ﴿فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ﴾ [129] یعنی محبت کے معاملہ میں بالکل ایک طرف نہ جھک جاؤ۔ یہاں تک کہ ایک غریب عورت بی بی کہلا کر پھر درمیان میں لٹکی ہوئی ہو۔ پس عدل کی اس تشریح کے سمجھانے کو ہی وہ لفظ اختیار فرمائے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اس میں پھر سمجھا دیا کہ تعدد ازدواج ایک بڑا مشکل مقام ہے جس کو بغیر سخت ضرورت کے اختیار نہ کیا جائے۔

605- ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ اَيْمَانٌ۔ يَمِيْنٌ کی جمع ہے جو یمن سے ہے۔ جس کے اصل معنی برکت ہیں۔ (ر) اور يَمِيْنٌ اصل میں دائیں ہاتھ یا دائیں طرف کو کہتے ہیں مگر کئی اور معنی میں بھی آ گیا ہے مثلاً حق کی جانب۔ جیسے ﴿تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ﴾ [الصّٰفّٰت: 28:37] ''بڑے زور سے ہمارے پاس آتے تھے۔'' یا سعادت و برکت کی جانب جیسے ﴿اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ﴾ [الواقعة: 27:56] ''برکت والوں کی (اچھی) حالت ہے۔'' اور قسم کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے گزر چکا اور معاہدہ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے مَوْلَى الْيَمِيْنِ سے مراد وہ شخص ہے جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو۔ (غ) اور ﴿لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ﴾ [الحاقة: 45:69] ''تو ہم ضرور اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے۔'' میں زجاج نے یمین کے معنی قدرت کیے ہیں۔ (ل) ایک حدیث میں آتا ہے [اَلْحَجَرُ الْأَسْوَدُ يَمِيْنُ اللّٰهِ] (کنز العمال: جلد12، صفحہ217، حدیث: 34744) جس کے معنی میں امام راغب لکھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے اس سعادت کی طرف پہنچا جاتا ہے جو اس کی طرف قریب کرنے والی ہے اور ابن اثیر میں ہے کہ یہ کلام مثال کے طور پر ہے کیونکہ جب بادشاہ کسی شخص سے مصافحہ کرتا ہے تو وہ اس کے ہاتھ کو چومتا ہے۔ پس اس لیے اس کو چوما جاتا ہے کہ اسے یمین اللہ کہا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ حجر اسود اس عہد کے لیے بطور ایک نشان

اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝ یہ زیادہ نزدیک ہے تا کہ تم ناانصافی نہ کرو۔ (606)

کے تھا جو بائبل میں کونہ کے پتھر کے متعلق پایا جاتا ہے۔ پس یمین اللہ میں اسی اللہ تعالیٰ کے عہد کی طرف اشارہ ہے۔

ملک یمین سے مراد امام راغب کے نزدیک صرف اسی قدر ہے جیسا فِیْ یَدِیْ سے یعنی میرے ہاتھ میں یا میرے قبضہ میں۔ مگر جو مختلف معنی اوپر دیئے گئے ہیں ان کے لحاظ سے ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ کے معنی ہوں گے وہ جن کے مالک تمہارے معاہدات ہوئے یا جن پر تم قدرت پا کر مالک ہوگئے۔ چنانچہ اس حدیث میں کہ نبی کریم ﷺ کے آخری الفاظ تھے [الصَّلَاةَ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ] (مسند أحمد: 12169؛ سنن ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ما جاء في ذكر مرض رسول الله ﷺ: 1625) مراد زکوٰۃ لی گئی ہے۔ (ن) اور ﴿اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ [24] میں ایک معنی منکوحہ عورتیں ہیں یعنی وہ جن کے تم بذریعہ معاہدات مالک ہوئے۔ اور قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں پر بھی یہی الفاظ بولے گئے ہیں۔ جن سے مراد یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر تم نے قدرت پالی۔ یعنی جنگ کر کے ان پر متسلط ہوگئے۔

یہاں ﴿اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ سے کیا مراد ہے؟ عموماً لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ طریق چار کی حد بندی کو توڑنے کے لیے ہے کہ لونڈیاں جتنی چاہے کوئی رکھے حالانکہ اس سے اصل غرض ہی باطل ہو جاتی ہے۔ اگر حد بندی ضروری تھی تو اس کا اس طرح توڑ دینا جائز نہیں کہ لونڈیوں کی شکل میں جس قدر کوئی چاہے زیادتی کر لے۔ اب ترکیب عبارت میں دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو یہ کہ اَوْ کے ذریعہ سے عطف النسا پر ہو یعنی ترکیب یوں ہو ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ... اَوْ ... مِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ یعنی نکاح کرو جو تم کو پسند ہوں عورتوں سے یا لونڈیوں سے الخ۔ اس صورت میں لونڈیاں خود عورتوں والی حد بندی کے اندر ہیں یا وَاحِدَةً کے بعد یہ کوئی الگ ہی صورت ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر ایک بھی میسر نہ آئے تو لونڈی سے نکاح کر لو اور اس کی مؤید وہ آیت ہے جس میں آگے چل کر لونڈی کے ساتھ نکاح اس شرط پر مشروط قرار دیا ہے جب زوجہ میسر نہ آئے۔ چنانچہ فرمایا ﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ [النساء 25:4] ''اور جو شخص تم میں سے یہ مقدور نہیں رکھتا کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو تمہاری ان مومن لونڈیوں سے (نکاح کر لے) جن کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہوئے۔'' اور زیادہ سے زیادہ اس کو وَاحِدَةً کے ساتھ جمع کیا جاسکتا ہے یعنی اگر عدل نہ کر سکو تو ایک بی بی کے ساتھ چار کی حد تک لونڈیوں کو جمع کر سکتے ہو۔ گو اس میں یہ لازم نہیں آئے گا کہ لونڈیوں کے معاملہ میں کسی عدل کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ ان کے حقوق نصف ہی سہی مگر پھر بھی عدل کی ضرورت تو ہے اس لیے پہلی یا دوسری توجیہ ہی درست ہے۔

606- تَعُوْلُوْا۔ اس کا مادہ عَوْلٌ ہے اور عَوْلٌ اور غَوْلٌ کا مفہوم ملتا جلتا ہے اس قدر فرق ہے کہ غَالَةٌ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ چیز ہلاک کر دے اور غَالَةٌ اس وقت جب وہ بوجھ کے نیچے دبا دے اور عَوْلٌ وہ مصیبت ہے جو بھاری ہو اور اسی سے تَعُوْلُوْا کے معنی لیے گئے ہیں۔ زیادہ لے کر انصاف کا ترک کر دینا۔ (غ) عَوْلٌ کے معنی ہیں فیصلہ میں ظلم کی طرف مائل ہونا۔ (ل)

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ۝۴

اور عورتوں کو ان کے مہر بلا بدل دو پھر اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہارے لیے خود دیں تو اسے مزے سے خوش گواری سے کھاؤ۔ (607)

اور اصل میں یہ معنی بھی ثقل سے لیے گئے ہیں اس لیے کہ [عَالَ الْمِیْزَانُ] اس وقت کہا جاتا ہے جب ترازو بوجہ ثقل کے ایک طرف مائل ہو جائے۔ اسی لیے دل کے میلان پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے ﴿اَلَّا تَعُوْلُوْا﴾ کے معنی لیے ہیں تا کہ تمہارا عیال زیادہ نہ ہو اور کسائی نے بھی عَالَ یَعُوْلُ کے معنی کثرت عیال فصحائے عرب سے نقل کیے ہیں۔ (ر)

ذٰلِكَ میں اشارہ فَوَاحِدَةً کی طرف ہے یعنی ایک بی بی سے ہی ایک شوہر کا نکاح ہونا زیادہ مناسب ہے تا کہ انسان ناانصافی سے بچا رہے گویا پھر دوسری بار فَوَاحِدَةً کے اصول پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ عام لوگوں کے لیے جو اعلیٰ درجہ کا ضبط اور انصاف نہیں رکھتے یہی مناسب ہے کہ وہ ایک ہی بی بی پر کفایت کریں۔ یا کثرت عیالداری کی مصیبت کے نیچے دب جانے سے بچنے کے لیے یہ زیادہ مناسب ہے کہ ایک ہی بی بی ہو۔ پس ان الفاظ سے بھی یہی شہادت ملتی ہے کہ گو اسلام نے بعض ضروریات کے لیے مشروط اجازت تعدد ازدواج کی دی ہے مگر آخر پر پھر سفارش یہی کی ہے کہ اصولاً ایک بی بی اور ایک شوہر کا ہونا ہی زیادہ مناسب طریق ہے اور دوسری بی بی کا عقد نکاح میں لینا اسی صورت میں ہے جب ضروریات انسانی مجبور کر دیں۔ ان روکوں کا رکھنا خود بتاتا ہے کہ سخت ضرورت کے سوا تعدد ازدواج جائز نہیں۔

607- صَدُقَاتٍ۔ صَدَقَةٌ کی جمع ہے جس کا اصل صدق ہے اور صَدَقَةٌ وہ مال ہے جو انسان قرب حاصل کرنے کے لیے دیتا ہے اور صَدُقَةٌ صُدَاقٌ اور صِدَاقٌ عورت کے مہر کو کہا جاتا ہے۔ (غ)

نِحْلَةٍ۔ وہ عطیہ جو برع کے طور پر ہو۔ (غ) یعنی اس کا معاوضہ کوئی نہ ہو۔ اور یہ بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں کہ بغیر مطالبہ کے طیب نفس سے دے۔ امام راغب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نِحْلَةٍ سے مراد ھِبَةٌ اس لیے ہے کہ نَحْل یعنی شہد کی مکھی جب کسی چیز پر بیٹھتی ہے تو اس کو نقصان نہیں پہنچاتی بلکہ موجب نفع ہوتی ہے۔ اس لفظ سے **مہر کی حقیقت** پر قرآن کریم نے بڑی روشنی ڈالی ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ وہ کسی چیز کا معاوضہ یا بدل نہیں بلکہ وہ محض عطیہ بلا بدل کے طور پر خاوند کی طرف سے ایک تحفہ ہے۔

هَنِیْٓـًٔا۔ هَنَاءٌ سے ہے وہ چیز ہے جس میں کسی قسم کی مشقت نہ ہو۔ اور اصل میں یہ لفظ کھانے پر بولا جاتا ہے۔

مَرِیْٓـًٔا۔ مَرْءٌ سے ہے اور مَرِیْءٌ اصل میں راس معدہ ہے اور کھانے کے متعلق مَرْءٌ یا اَمْرَأُ اس حالت میں کہا جاتا ہے جب وہ طبیعت سے موافقت کی وجہ سے معدہ سے مخصوص ہو یا هَنِیْءٌ وہ ہے جس سے کھانے والا مزہ حاصل کرے۔ اور مَرِیْءٌ وہ جو انجام کار اچھا ثابت ہو۔

مہر دینے کی تاکید:

چونکہ یتامیٰ کے ذکر میں عورتوں سے نکاح کا ذکر آ گیا اور عورتوں کا ایک خاص حق جو اسلام نے ہی دیا ہے مہر ہے۔ اور عورتوں

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵

اور کم عقل لوگوں کو تم اپنے مال نہ دے دو جن کو اللہ نے تمہارے لیے سہارا بنایا ہے اور تم انہیں ان کے ذریعہ سے کھانے کے لیے دو اور انہیں کپڑا پہناؤ اور انہیں بھلی بات کہتے رہو۔ (608)

کے حقوق پر بھی اس سورت میں بحث ہونی تھی اس لیے بہ تعلق مضمون نکاح مہر کا ذکر بھی کر دیا۔ اس آیت میں اول عورتوں کو مہر دینے کی تاکید فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان کو بغیر ان کے مطالبہ کے مہر دے دو۔ اسی لیے لفظ نِحْلَةٍ بڑھایا ہے جس میں ساتھ ہی یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ مہر کسی چیز کا معاوضہ قطعاً نہیں بلکہ محض ہبہ بلا بدل کے طور پر ہے۔ اور اس کو قرض کے طور پر تسلیم کر لینا جیسا کہ آج کل رواج ہے اصل غرض کو باطل کرتا اور عورت کو عملاً اس کے حق سے محروم کرتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ نکاح کرنے سے پیشتر انسان کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی قوت بازو سے کما کر عورت کو مہر دے سکے اور اس میں مال کمانے کی اہلیت پیدا ہو چکی ہو۔

مہر پر لڑکی کے والد کا کوئی حق نہیں:

دوسرا حکم اس لفظ میں اولیاء یعنی باپ وغیرہ کو ہے کہ مہر کوئی ایسی چیز نہیں کہ وہ لڑکی کی قیمت کے طور پر خاوند سے وصول کریں۔ بلکہ وہ عورت کا مال ہے جو اس کو ملنا چاہیے۔ عرب میں لوگ ایسا کر لیتے تھے جیسا کہ یہ رواج بعض اطراف ہند میں بھی پایا جاتا ہے کہ جب لڑکی کا نکاح کر دیتے تو اس کے مہر کو خود وصول کر لیتے۔ پس اس رسم بد سے روکا ہے۔

608- قِیَامٌ۔ قَامَ کا مصدر ہے [دیکھو نمبر: 501]۔ مگر قِیَامٌ اور قَوَامٌ کا استعمال اس شے پر بھی ہے جس کے ذریعہ سے کوئی چیز قائم ہو یا ثابت رہے۔ (غ) یہی معنی یہاں ہیں۔ یہاں مال کو قِیَامٌ کہا ہے یعنی وہ تمہاری زندگی کا موجب ہے اور دوسری جگہ انہی معنوں میں فرمایا ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ [المآئدۃ: 97:5] ''اللہ نے کعبہ عزت والے گھر کو لوگوں کے لیے قائم رکھنے والا بنایا ہے۔''

﴿ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا﴾ اگر [اُرْزُقُوْهُمْ مِنْها] ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ اس مال میں سے ان کو کھانے کے لیے دو اور یوں مال ضائع ہو جاتا۔ لیکن فِیْهَا کہہ کر یہ بتا دیا کہ ''ان اموال کے ذریعہ سے ان کو رزق دو۔'' یعنی ان اموال کو ایسے منافع اور آمدنی کا ذریعہ بناؤ کہ اس نفع یا آمدنی سے ان کا گزارہ ہوتا رہے۔

اس آیت میں یتامیٰ کے ذکر کی طرف رجوع کیا ہے مگر بجائے صرف یتامیٰ کا نام لینے کے اس قسم کے تمام لوگوں کو داخل کر لیا ہے۔ <u>سُفَهَآءٌ سے کیا مراد ہے؟</u> ﴿وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا﴾ فرما کر بتا دیا ہے کیونکہ جب ان کو مال نہ دیا تو اب یہ حکم دیا کہ راس المال کو ایسے کم عقلوں کے ولی تباہ نہ کریں بلکہ اس مال کو تجارت یا کسی اور کام پر لگا کر اس سے منافع یا آمدنی سے ان کا گزارہ

وَ ابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ ۚ وَ لَا تَاۡكُلُوۡهَاۤ اِسۡرَافًا وَّ بِدَارًا اَنۡ يَّكۡبَرُوۡا ؕ وَ مَنۡ كَانَ غَنِيًّا

اور یتیموں کا امتحان لیتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں تب اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو اور فضول خرچی سے اور جلدی کر کے ان کو کھا نہ جاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں

چلائیں۔ پس جو لوگ کسی قسم کی تجارت یا کوئی اور شغل معاش کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اپنے راس المال کو تباہ کرتے چلے جاتے ہیں وہ سب کم عقلوں میں داخل ہیں۔ ان کے سپرد مال کرنے کی بجائے یہ حکم دیا کہ ان اموال کو تم کسی تجارت وغیرہ میں لگاؤ اور منافع سے ان کو کھانے پینے کو دو۔ یہاں مخاطب حکام ہیں۔ اسی لیے اَمۡوَالَكُمۡ کہا کیونکہ فرداً فرداً جس قدر اموال ہیں وہ درحقیقت قوم کے اموال ہیں اور جس قدر مال ضائع ہوگا وہ قومی نقصان ہے۔ اسی لیے اموال کو قیام یعنی قوم کے بقاء کا موجب قرار دیا ہے۔ جس قوم کا مال تباہ ہو جاتا ہے وہ گر جاتی ہے۔

یتامیٰ وغیرہ کی تربیت:

علاوہ کھانے اور لباس کے ایک اور ضرورت بتائی ﴿وَ قُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا﴾ ان کو بھلی بات کہتے رہو۔ مفسرین نے عموماً نصیحت کے چند فقرے اس سے مراد لیے ہیں۔ مگر قفال کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ غلاموں کی سی معاشرت نہ کرو بلکہ ان کو نیکیوں کی طرف توجہ دلاتے رہو اور بتاتے رہو کہ اسراف مال کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک اس میں ان کی تربیت کے اہتمام کی ضرورت بتائی ہے اور اسی لیے کھانے اور پہننے کے ساتھ اس کو تیسری ضرورت بتایا ہے یعنی ان کی تربیت پر روپیہ خرچ کرتے رہو۔ چنانچہ اگلی آیت میں جو فرمایا ﴿وَ ابۡتَلُوا الۡيَتٰمٰى﴾ وہ اسی کی طرف اشارہ ہے کہ جب ان کی تربیت کا اہتمام کرو تو ساتھ ہی ان کا امتحان بھی لیتے رہو کہ آیا وہ جائداد کو سنبھالنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قول معروف صرف معمولی نصیحت کا نام نہیں بلکہ اچھے اصول پر تربیت کرنا بھی قول معروف میں داخل ہے۔

قرآن شریف میں بار بار **اموال کی حفاظت کا حکم** اور اس کے متعلق قوانین بتائے گئے ہیں جو شاید اور کسی مذہبی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ کہیں تجارتوں کا ذکر ہے، کہیں لین دین کا ذکر ہے، کہیں رہن کا ذکر ہے، کہیں وصایا کو ضروری ٹھہرایا ہے، کہیں مال متروکہ کے حصے بتائے ہیں، کہیں عورتوں کو مہر میں سونے کے ڈھیر دینے کا ذکر ہے، کہیں اموال کی حفاظت کے لیے تحریر اور گواہی کو ضروری بتایا جاتا ہے، کہیں اموال کا ٹھیک انتظام نہ کرنے والوں کے لیے ولی مقرر کرنے کی ہدایت ہے۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ مال دنیا کو اسلام نے حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ اس کی حفاظت کی سخت تاکید فرمائی ہے اور یوں اس کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیا ہے۔ اور مال دنیا کی جہاں تحقیر کی ہے تو وہ صرف اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ زندگی کا مقصد حصول اور فراہمی مال کو نہ سمجھ لیا جائے۔

فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا گے(609) اور جو آسودہ ہے چاہیے کہ وہ بچا رہے اور جو

609- ﴿بَلَغُوا النِّكَاحَ﴾ نکاح کے اصل معنی عقد یعنی شادی ہیں اور یہاں نکاح کو پہنچنے سے مراد حد بلوغ کو پہنچنا ہے یعنی اس عمر کو جس میں انسان اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی شادی کی جائے۔ بلوغ کی بجائے لفظ نکاح رکھنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نکاح یا عقد کا تعلق بلوغ سے ہے کیونکہ یہاں نکاح اور بلوغ کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ پس **صغرسنی میں شادی کرنا ٹھیک نہیں۔ بلوغ کا سن** امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اٹھارہ سال اور امام شافعیؒ کے نزدیک پندرہ سال ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی لڑکے کے بلوغ کو پہنچنے کی عمر اٹھارہ سال ہونے پر روایت ہے۔ (ر) صحیحین میں حدیث ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں احد کے دن چودہ سال کا تھا تو جب میں آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے جنگ میں نکلنے کی مجھے اجازت نہ دی اور خندق کے دن میں پندرہ سال کا تھا تو آپ نے اجازت دے دی۔ مگر جنگ میں نکلنے کا تعلق قوائے جسمانی پر ہے اور یہ بھی حدیث سے معلوم نہیں ہوتا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی عمر کا سوال نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش ہوا۔ اس لیے محض اس بنا پر سن بلوغ کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔

اٰنَسْتُمْ۔ اٰنَسَ الشَّیْءُ (مادہ انس) کے معنی ہیں۔ اَحَسَّهُ یعنی اس کو محسوس کیا یا عَلِمَهُ اس کو جانا۔ (ل)

رُشْدًا۔ رُشْدٌ کے اصل معنی کسی امر کی طرف ہدایت پانا ہیں اور وہ غَیٌّ کا نقیض ہے۔ حدیث میں ہے [تُؤْنَسُ مِنْهُ الرُّشْدُ] جس کے معنی ابن اثیر نے کیے ہیں کہ اس میں عقل کی پختگی اور فعل کی راستی اور اچھا تصرف جانا جائے۔ (ن) یہاں یہی مراد ہے اور ایک وہ رشد ہے جو امور اخروی میں ہدایت کی طرف لے جاتا ہے ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ﴾ [الأنبیآء: 51:21] ''اور ہم نے ہی ابراہیم کو پہلے سے اس کے (لائق حال) ہدایت دی۔''

بِدَارًا۔ بَدْرٌ کے معنی اَسْرَعُ یا جلدی کے ہیں اور بِدَارٌ مصدر ہے اور بدر پورے چاند کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ سورج کے غروب کے بعد فوراً نمودار ہوجاتا ہے گویا اس نے مبادرت سے غروب آفتاب کو پالیا۔

چونکہ پچھلی آیت میں یتامیٰ وغیرہ کی تربیت کا ذکر تھا۔ اس لیے اب فرمایا کہ اس تربیت کا نتیجہ بھی معلوم کرتے رہو کہ وہ کس قدر ترقی کررہے ہیں۔ اور کس قدر اہلیت اپنے اپنے کاروبار کی موزونیت کی ان میں پیدا ہورہی ہے۔ اور یہ انتظام اس وقت تک رہے کہ وہ حد بلوغ کو پہنچ جائیں۔ لیکن حد بلوغ کو پہنچنے پر بھی مال اس صورت میں ان کے حوالہ کیا جائے کہ ان میں عقل کی پختگی اور اموال میں حسن تصرف اور ضبط وغیرہ کی قوت ان میں دیکھو۔ گویا مال ان کے سپرد کرنے کی دو شرطیں ہیں ایک بلوغ اور دوم پختگی عقل۔ اور پھر چونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب مالک اموال بلوغ کو پہنچنے والا ہوتا ہے تو ولی اس خیال سے کہ اب تو وہ اپنے مال کو اپنے تصرف میں لے لے گا، اس میں اسراف وغیرہ کرتے ہیں۔ اس لیے اس سے بھی روکا۔

تربیت اولاد:

یہاں جو کچھ ہدایت یتامیٰ کے متعلق دی ہیں ان میں عام طور تربیت اطفال کی صورت بھی سمجھا دی ہے کیونکہ جو کچھ ایک ولی کا یتیم کے متعلق فرض ہے وہ باپ کا بیٹے کے متعلق بطریق اولیٰ ہے۔ پس ہر والد کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت قول معروف

فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ حاجتمند ہے وہ مناسب طور پر لے لے۔[610] پھر جب تم

کے ساتھ کرے یعنی اس کو نیکی کی راہ بھی بتائے اور اس کو معاش پیدا کرنے کے قابل بھی بنائے۔ پھر دیکھتا رہے کہ کس قدر ترقی وہ کر رہے ہیں یہاں تک کہ بلوغ کو پہنچنے تک ان میں عام طور پر رشد پیدا ہو جانا چاہیے۔ یعنی ان کو اموال میں ضبط و تصرف کے قابل ہو جانا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں نے اس فرض سے سخت غفلت اختیار کر رکھی ہے اور وہ اپنی اولاد کو اس قابل بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ امرا کے بچے تو عموماً ایسے فضول خرچ اور عیاش ہو جاتے ہیں کہ سوائے والدین کے مال کو تباہ کرنے کے اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ متوسط الحال لوگ بھی اپنی اولاد کو کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں، ان کی تعلیم و تربیت پر کچھ خرچ کرنا بوجھ سمجھتے ہیں۔ ہر والد کا پہلا فرض یہ نہیں کہ جیسا کہ آج کل مسلمانوں نے سمجھا ہوا ہے کہ اس کی شادی کر دی بلکہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کر کے اس کی حیثیت کے مطابق اسے معاش پیدا کرنے اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے۔ شادی کرنا اس کا اپنا کام ہے۔ جب کمانے کے قابل ہو جائے گا تو خود شادی کر لے گا۔

610- يَسْتَعْفِفْ۔ اس کا مادہ عَفَّ ہے اور عِفَّةٌ کے اصل معنی ہیں تھوڑی چیز کے پا لینے پر اپنے آپ کو روک لینا۔ کیونکہ عَفَافَةٌ یا عِفَّةٌ کسی چیز کے بقیہ کو کہتے ہیں۔ (غ) اور اسی سے عِفَّةٌ کے مشہور معنی پاکدامنی ہیں۔ یعنی انسان میں ایک ایسی حالت کا پیدا ہونا کہ غلبہ شہوت سے رکا رہے۔ اور اِسْتِعْفَافٌ میں بوجہ تکلف مبالغہ ہے۔ کیونکہ اس کے اصل معنی ہیں طلب عفت اور یہاں مراد صرف رکے رہنا ہے یعنی یتیم کا مال کھانے سے رکنا ہے۔

فَقِيْرٌ۔ فَقْرٌ سے ہے جس کا استعمال چار طرح پر ہے۔

1. اول ضروری حاجت کا پایا جانا جو سب انسانوں کے لیے عام ہے۔ بلکہ کل موجودات کے لیے جیسا کہ فرمایا ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ﴾ [فاطر: 15:35] یعنی تم سب کے سب اللہ کے محتاج ہو۔
2. دوسرا فقر مال کا نہ ہونا ہے جیسے ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ﴾ [التوبة: 60:9] ''زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے۔''
3. تیسرا نفس کا فقر ہے جو تمنائے نفس کے مقابل پر ہے اور یہ حرص اور لالچ ہے۔
4. اور چوتھا فقر وہ ہے جو اللہ کی جناب میں انسان کو ہونا چاہیے جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے: [اَللّٰهُمَّ أَغْنِنِيْ بِالْاِفْتِقَارِ إِلَيْكَ وَلَا تُفْقِرْنِيْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْكَ.] (روح المعانی: جلد30، صفحہ 163) ''اے اللہ! مجھے اپنا فقیر بنا کر غنی کر دے اور اپنی طرف سے لاپروا رکھ کر فقیر نہ بنائیو۔'' اس معنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ﴿رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ﴾ [القصص: 24:28] ''میرے رب! جو بھلائی تو میری طرف بھیجے میں اس کا محتاج ہوں۔'' اور یہاں لفظ فقیر اول الذکر معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی حاجتمند کے معنی میں اور اس کے مقابل پر غنی سے مراد یہ ہے کہ اس کے ذرائع آمد وغیرہ ایسے ہیں کہ اس کو مال یتیم سے لینے کی کچھ احتیاج نہیں۔

چونکہ یتامیٰ کے ولیوں کو ان کے مال میں ہر قسم کے تصرف سے روکا تھا اس لیے اب یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ بطور **حق الخدمت**

اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

ان کے مال ان کے حوالے کرو تو ان پر گواہ کرلو اور اللہ کافی حساب لینے والا ہے۔(611)

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷

مردوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے (جو ان کے) والدین اور قریبی چھوڑیں اور عورتوں کے لیے اس سے ایک حصہ ہے جو (ان کے) ماں باپ اور قریبی چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت' ایک مقرر حصہ۔(612)

بھی کچھ لینا جائز ہے یا نہیں۔ سو حق الخدمت کو بھی اس حد تک محدود کر دیا کہ جو شخص انتظام کرتا ہے وہ اپنا کوئی ذریعہ معاش نہیں رکھتا تو لے سکتا ہے ورنہ نہیں۔

611- حَسِيْبٌ۔ حَسْبٌ کے معنی کفایۃ ہیں جیسے ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ﴾ [التوبة: 59:9] ''اللہ ہمارے لیے بس ہے۔'' ﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ﴾ [المجادلة: 8:58] ''ان کے لیے دوزخ کافی ہے۔'' اور حساب کے معنی مشہور ہیں۔ پس حسیب کے معنی یا تو کافی ہیں اور یا محاسب یعنی حساب لینے والا اور گو حسیب اور محاسب کے معنی صرف حساب لینے والے کے ہیں لیکن مراد اس سے [مُكَافِئٌ بِالْحِسَابِ] ہیں یعنی حساب لے کر بدلہ دینے والا۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت حساب کی طرف توجہ دلا کر ہر قسم کی زیادتی سے روکا ہے۔ کیونکہ صرف ہدایات کا دینا بھی کافی نہیں جب تک کہ کوئی روکنے والی طاقت ساتھ نہ ہو۔ سو اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات ہی وہ چیز ہیں جو انسان کو مخفی سے مخفی گناہوں سے روک سکتی ہیں۔

612- **جاہلیت میں یتامیٰ کی ورثہ سے محرومیت:** یہاں سے وراثت کا مضمون شروع ہوتا ہے مگر اصل غرض اب بھی یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت ہی ہے۔ کیونکہ یتامیٰ کو خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں میراث سے حصہ نہ دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عرب کے لوگ کہتے تھے [لَا يَرِثُ إِلَّا مَنْ قَاتَلَ عَلٰى ظُهُوْرِ الْخَيْلِ] کوئی ورثہ نہیں لے سکتا مگر وہ جو گھوڑے کے پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کرتا ہے۔ چنانچہ جب ام کحت نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ اس کے خاوند اوس بن ثابت کے ترکہ میں سے اس کی بیٹیوں کو کوئی حصہ نہیں ملا اور کل پر اس کے بھائی قابض ہو گئے ہیں تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی عرض کیا تھا [يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَلَدُهَا لَا يَرْكَبُ فَرَسًا وَلَا يَحْمِلُ كَلًّا وَلَا يُنْكِيْ عُدُوًّا] (التحرير والتنوير: جلد4، صفحہ 249) یعنی اس کی اولاد نہ گھوڑے پر سوار ہوتی ہے نہ بوجھ اٹھاتی ہے نہ دشمن کو مارتی ہے۔ پس اس آیت نے ایک نہایت قدیم رسم کو موقوف کیا اور ترکہ میں مرد و عورت' بڑے اور چھوٹے' جنگ کرنے والے اور گھر بیٹھنے والے سب کو یکساں حصہ دار قرار دیا۔

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۸﴾

اور جب تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو ان کو اس میں سے کچھ دو اور ان کو اچھی بات کہو۔(613)

آنحضرت ﷺ کی قوت قدسی کا کمال:

کسی پیغمبر کی زندگی میں اس کمال قوت قدسی کا نظارہ نظر نہیں آتا کہ سینکڑوں یا ہزاروں سالوں کی دیرینہ رسموں کو ایک لفظ سے نابود کر دیا ہو۔ تقسیم مال کے معاملہ میں کسی انقلاب کے ایک لفظ سے پیدا ہو جانے پر تاریخ شہادت دینے سے عاجز ہے۔ بڑے بڑے اولوالعزم نبی دنیا میں ہوئے مگر یہ قوت کسی کو نہ ملی جس کا نظارہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ میں نظر آتا ہے۔ تمام رسوم و رواج کی خطرناک زنجیریں اور طوق ایک اشارہ سے کٹ جاتے ہیں۔ صدیوں کی عادات جو طبائع انسانی میں پہاڑوں کی طرح قائم ہو چکے تھے ایک پھونک سے اڑ جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس انسان کے سامنے کوئی چیز انہونی نہیں' کوئی کام ناممکن نہیں۔ ملک عرب میں خدا جانے کب سے یہ رواج جاری تھا کہ ورثہ صرف ان لوگوں کو پہنچ سکتا ہے جو ملک یا قوم کی حفاظت کر سکتے ہیں، جو کما کر کھلانے کی طاقت رکھتے ہیں اور کس قدر استحکام یہ حاصل کر چکا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی حمایت میں کب کسی نے آواز اٹھائی۔ اور جب تمام ملک کے اہل الرائے' تمام بہادر' تمام سپاہی' تمام شیخ اس بات پر متفق الرائے ہوں تو کون اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے۔

آپ ﷺ کی یتیموں اور بیواؤں کی بے نظیر حمایت:

بیکس، یتیم اور عاجز عورتیں کیا اپنے ہی حامیوں' اپنے ہی محافظوں کے خلاف آواز اٹھا سکتی تھیں؟ ہرگز نہیں۔ مگر آسمان سے ایک آواز آتی ہے اور اس کے سامنے تمام گردنیں جھک جاتی ہیں۔ ایک بادشاہ جس کی زندگی کا انحصار اس کے سپاہیوں کی بہادری پر اور ان کے تلوار چلانے پر ہو کیا وہ ان سپاہیوں کے حقوق چھین کر دوسروں کو دینے کا کبھی خیال بھی کر سکتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دشمن آئیں اور یہاں محمد رسول اللہ ﷺ کا دنیا کے کسی بادشاہ سے مقابلہ کر کے دکھائیں۔ آپ کو اپنے سپاہیوں کی اسی طرح رعایت اور دلداری منظور تھی جیسا جنگ کے وقت سب بادشاہوں کو ہوتی ہے۔ مگر بے کس بچوں اور ناتواں عورتوں کے حقوق کے سامنے اپنے سپاہیوں کی رعایت کرنا تو ایک طرف رہا ان سپاہیوں کے صدیوں کے قائم شدہ حقوق کو چھین کر یتیموں اور بیواؤں کو دلاتے ہیں اور آپ کے پیروؤں کی جان نثاری بھی دنیا میں ایسی عدیم المثال ہے کہ وہ بغیر چون و چرا کے اپنے حقوق کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی قوت قدسی تھی جس نے دنیا میں ایسے ایسے انقلاب پیدا کر کے دکھائے جن کی نظیر دنیا میں کوئی دوسرا انسان نہیں دکھا سکتا۔ اور یہ انقلاب قوت ملکی کے بھروسہ پر نہیں' قوت قومی کی حمایت سے نہیں بلکہ قوت ملکی اور قوت قومی کے مقابلہ میں کر کے دکھائے۔

613- **تقسیم ترکہ کے وقت غرباء کو کچھ دینا:** اَلْقِسْمَةَ سے مراد تقسیم مال وراثت ہے یا وصیت کی تقسیم۔ ﴿اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ﴾

وَ لۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوۡا عَلَيۡهِمۡ ۪ فَلۡيَتَّقُوا اللّٰهَ وَ لۡيَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا ۝۹

اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو اگر اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑیں تو ان کے لیے ڈرتے ہوں۔ پس چاہیے کہ اللہ کا تقویٰ کریں اور چاہیے کہ سیدھی بات کریں۔ (614)

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ وَ سَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا ۝۱۰ ع 1 10 12

جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ ہی کھاتے ہیں اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ (615)

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ ۗ لِلذَّكَرِ

اللہ تمہاری اولاد کے متعلق تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے مرد

سے یہ مراد نہیں کہ وہ اس وقت آ کر دست سوال دراز کریں تو ہی ان کو کچھ دینا چاہیے بلکہ ان کی محض موجودگی مراد ہے خواہ وہ کہیں ہوں۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ ایک تو وہ ہیں جن کے حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے ہیں لیکن ان کے علاوہ دوسرے قریبیوں کو (جن کو یہاں اولی القربیٰ کہا گیا ہے) اور مسکینوں اور یتیموں کو بھی فائدہ پہنچانا چاہیے۔ یہ وسعت تعلیم اسلام سے خاص ہے۔ چونکہ بعض مفسرین نے قِسۡمَةَ کے معنی وصیت کی تقسیم کو بھی لیا ہے۔ اس لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں دونوں قسمتیں مراد ہیں۔ اگر شخص متوفی خود اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے (جو معین حصہ نہیں لیتے) یا مسکینوں، یتیموں کے لیے اپنے مال کے کسی حصہ کی وصیت کر دے تو بہتر ورنہ تقسیم ترکہ کے وقت ان کو کچھ دے دیا جائے۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو بھی منسوخ کہہ دیا ہے جس کی تردید بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے موجود ہے۔ یعنی آپ نے فرمایا کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔

614- سَدِيۡدًا۔ سَدَّ سے ہے جس کے معنی کسی اختلال کا بند کر دینا یا روک دینا ہیں۔ اسی لیے قول سدید اس بات کو کہا جاتا ہے جو صواب یعنی صحیح موقعہ پر پہنچنے والی ہو۔ کیونکہ وہ اختلال کو روک دیتی ہے یا سَدَادٌ یعنی قصد کو حاصل کر لیتی ہے۔

یہ فطرت انسانی کو اپیل کی ہے کہ جس طرح اگر تم مر جاؤ اور تمہاری چھوٹی چھوٹی اولاد رہ جائے تو تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے اس پر رحم کریں اور اس کے متکفل بنیں اسی طرح تم مسکینوں اور یتیموں کی خبر گیری کرو۔

615- سَعِيۡرًا۔ سَعَرَ کے معنی التہاب النار یا آگ کا شعلے مارنا یا بھڑکنا ہیں۔ اور سَعِيۡرٌ بمعنی مَسۡعُوۡرَةٌ ہے یعنی بھڑکائی گئی آگ۔

اس آیت کے ساتھ چونکہ مضمون اور رکوع ختم ہوتا ہے اس لیے پھر یتامیٰ کے مال کھانے کے جرم سے ڈرایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ مال یتیم کا کھانا گویا آگ کا کھانا ہے۔ اور آگ کا کھانا بطور مجاز ہے اور ان اسباب کا مہیا کرنا مراد ہے جو انسان کو آگ میں

مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ ۚ فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً   کے لیے دوعورتوں کے حصہ کے برابر ہو۔(616) پھر اگر

لے جائیں گے۔

616- اَوۡلَادٌ۔ وَلَدٌ کی جمع ہے جس کے معنی مطلق مولود ہیں یعنی جنا گیا اور واحد اور جمع میں چھوٹے اور بڑے پر۔(غ) مذکر و مؤنث میں (غق) اور ولد الولد یعنی پوتے پر اس کا استعمال جائز ہے۔

اسلام کا قانون وراثت:

اس رکوع میں ورثاء کے مختلف حصص بتائے ہیں۔عرب میں جائداد متروکہ کا کوئی حصہ ضعفا یعنی عورتوں اور چھوٹے بچوں کو نہ ملتا تھا۔اسلام نے ہر ایک شخص کی متروکہ جائداد کے چند حصے کر دیئے ہیں۔کچھ خاوند یا بی بی کو مل جاتا ہے، کچھ ماں باپ کو، کچھ اولاد کو۔اور بعض حالات میں بھائیوں اور بہنوں کو یا قریبی رشتہ داروں کے نہ ہونے کی صورت میں دور کے رشتہ داروں کو۔ گویا ہر شخص کی جائداد میں سے ان لوگوں کو حصہ دیا ہے جن سے انسان کو کچھ نفع عام طور پر پہنچتا رہتا ہے۔اس لیے وراثت کو سب میں تقسیم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ تا سب وہ لوگ جن سے انسان کو منفعت پہنچتی ہے اس سے منفعت حاصل کریں۔

اسلام کا اصول تقسیم وراثت حقوق انسانی کی مساوات پر مبنی ہے:

اولاد میں ایک مساوات ہے وہ سب حصہ دار ہونے چاہئیں۔یہ نہیں کہ بیٹیوں کو محروم کر دیا جائے اور بیٹوں کو ساری جائداد دی جائے اور نہ ہی یہ قرین انصاف ہے کہ ساری اولاد کو محروم کر کے ایک کے سپرد کل جائداد کر دی جائے جیسا کہ بعض ممالک میں سب سے بڑا بیٹا ساری جائداد کا مالک ہو جاتا ہے اور باقی سب اولاد محروم رہ جاتی ہے۔اسی طرح پر اگر میاں، بی بی کی جائداد کا وارث ہو سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ بی بی میاں کی جائداد میں سے حصہ نہ لے۔اسی طرح ماں باپ کے حقوق ہیں۔گویا اس تقسیم وراثت میں بھی اسلام نے جمہوریت کا اصول قائم کیا ہے کہ جن کے یکساں حقوق ہیں وہ سب اپنے حقوق کو پائیں۔رہا جائدادوں کا بننا یا تقسیم ہونا، سو جس طرح ایک انسان اپنی سعی اور کوشش سے ایک جائداد بنا سکتا ہے اسی طرح دوسرا بھی بنا سکتا ہے۔جو قوتیں ایک انسان کو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں وہی دوسرے کو بھی دی ہیں، جو سامان ایک کے لیے مہیا کیے ہیں وہی دوسرے کے لیے بھی مہیا کیے ہیں۔پس جو مساوات قانون قدرت میں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے اسی کو تقسیم وراثت میں مدنظر رکھا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اسلام نے چار اصول قائم کر کے **تقسیم دولت کا صحیح اصول** قائم کیا ہے۔اور موجودہ زمانہ کی مشکلات تقسیم دولت کا علاج اگر یورپ کو کبھی ملے گا تو صرف تعلیم اسلام میں۔یورپ میں دو خیالات کی رو اس وقت چل رہی ہے۔ایک خیال تو یہ ہے کہ ہر ایک فرد اپنی کوشش اور محنت سے جس قدر مال حاصل کر لے وہ سب اس کا مال ہے۔اسی خیال کے ماتحت یورپ میں حد درجہ کی خود غرضی بڑھ گئی ہے اور ملک کی دولت عوام کے ہاتھ سے نکل کر چند افراد کے ہاتھ میں آ گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر حصہ نسل انسانی کا معمولی سامان معیشت سے بھی محروم ہے اور چند کس کروڑ پتی ہیں۔اس نقص کو دیکھ کر ایک دوسرا خیال پیدا ہوا ہے جو **بولشوزم** کے نام سے موسوم ہے۔جس کا اصول یہ ہے کہ سب انسان ملک کی دولت میں یکساں حصہ دار ہیں۔سب

کوشش کریں مگر ان کی کوششوں کا ثمرہ جو کچھ ہو وہ سب مشترک ہونا چاہیے اور سب کو دولت کا یکساں حصہ ملنا چاہیے۔ مگر اس تحریک میں یہ نقص ہے کہ جب ہر ایک شخص اپنی کوشش سے جو کچھ حاصل کرے اس کا مالک نہیں تو زیادہ محنت اور کوشش کے لیے کوئی تحریص باقی نہ رہے گی۔ اسلام نے اگر ایک طرف ﴿لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ [النجم: 53:53] کا اصول قائم کیا ہے یعنی جو انسان جس کے لیے کوشش کرے وہ اس کا مال ہے

تقسیم دولت میں مساوات قائم رکھنے کے لیے چار علاج:

تو دوسری طرف اس بات کو روکنے کے لیے کہ دولت چند مخصوص ہاتھوں میں جمع ہوتی چلی جائے کچھ علاج تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ انہی علاجوں میں سے:

1. ایک زکوٰۃ ہے جس کے ذریعہ سے جمع شدہ دولت کا جو دولتمندوں کے قبضہ میں ہو چالیسواں حصہ ہر سال کے آخر میں نکل کر غربا کو ملتا رہتا ہے۔
2. دوسرا سود کی ممانعت ہے یعنی ایسے لوگوں سے جو بوجہ تنگدستی قرضہ لینے کے محتاج ہوتے ہیں۔ سود نہ لیا جائے۔
3. تیسرا یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو جو اپنی موت کے وقت مال چھوڑتا ہے یہ حکم دیا ہے کہ اس کا کچھ حصہ خیراتی کاموں کے لیے وصیت کرے۔
4. اور چوتھا اصول خود تقسیم ترکہ کا اصول ہے جو ہر حال میں چند نہایت قریبی رشتہ داروں میں قریباً یکساں تقسیم ہو جاتا ہے۔

عرب کے ملک میں آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایک امی محض ان مشکلات کا حل بتا دیتا ہے جو آج بڑی بڑی مہذب قوموں کو پیش آ رہی ہیں۔ کیا یہ اسلام کے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے منجانب اللہ ہونے کا ایک کھلا کھلا نشان نہیں؟

وراثت کے لیے اسلام نے ذیل کے حقوق قرار دیئے ہیں:

1. اول قرابت۔ جیسے اولاد، ماں باپ، بہن بھائی۔
2. دوسرے نکاح یعنی خاوند بیوی۔ ان دونوں کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔
3. تیسرا حق ولاء قرار دیا ہے جو مخصوص حالات سے تعلق رکھتا ہے اور نبی کریم ﷺ کے عمل سے ثابت ہے یعنی جو شخص ایک غلام کو آزاد کرے تو وہ آزاد کرنے والا اس کا وارث ہو جاتا ہے۔
4. اور چوتھا حق اخوت اسلامی کا ہے جو اس صورت میں قائم ہوتا ہے جب وارث کوئی نہ ملے اس صورت میں ترکہ بیت المال میں مسلمانوں کی عامہ بھلائی میں صرف ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض ذمہ داریوں کی ادائیگی بھی خاص حالات میں بیت المال کے ذمہ ہوتی ہے اور اس کی بنا بھی حدیث پر ہی ہے کہ آپ نے فرمایا [أَنَا وَارِثُ مَنْ لَّا وَارِثَ لَهُ] (سنن أبي داؤد، كتاب الفرائض، باب فِي مِيرَاثِ ذَوِي الأَرْحَامِ: 2901) ''جس کا کوئی وارث نہیں میں اس کا وارث ہوں۔''

ظاہر ہے کہ اصل حق قرابت اور زوجیت کا ہی ہے اور اسی پر قرآن کریم نے چند ہدایات دی ہیں اور ترتیب جس سے وارثوں کا

فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَ لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ

(اولاد میں) دو (یا اس) سے اوپر عورتیں ہوں تو ان کے لیے اس کی دو تہائی ہے جو چھوڑا[616] اور اگر اکیلی ہو تو اس کے لیے نصف ہے۔[617] اور اس کے ماں باپ کے لیے دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے جو چھوڑا ہے اگر اس کی اولاد ہو۔ لیکن اگر اس کی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس

ذکر کیا ہے، اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اولاد کا ذکر کیا اور اس کے بعد ماں باپ کا۔ قرابت میں اول درجہ کا حق انہی دو کا ہے۔ اس کے بعد خاوند بیوی کے حصوں کا ذکر کیا اور بھائیوں کے حق کو پیچھے رکھا۔ اس لیے کہ گو بھائیوں کا حق قرابت کے لحاظ سے ہے۔ مگر حق زوجیت بھائیوں کے حق قرابت پر فائق ہے اور بہن بھائی عموماً صرف اس صورت میں لیتے ہیں جب اول درجہ کی قرابت والے نہ ہوں۔

616- ﴿فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ کے معنی دو سے اوپر ہیں۔ مگر چونکہ یہاں دو کا حکم علیحدہ نہیں اور وہ بھی جماعت میں داخل ہیں، اس لیے مراد ﴿فَوْقَ اثْنَتَيْنِ﴾ سے دو اور دو سے اوپر ہیں۔ اس کی مثال حدیث میں ہے [لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ سَفَرًا فَوْقَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ إِلَّا وَمَعَهَا زَوْجُهَا أَوْ ذُو مَحْرَمٍ لَهَا] (سنن ابن ماجه، كتاب المناسك، باب المرأة تحج بغير ولي: 2898) جس کے معنی ہیں کہ کوئی عورت تین یا تین دن سے زیادہ سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ اس کا خاوند یا ذو محرم ہو اور قرآن کریم میں ہے ﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ [الأنفال: 12:8] ''سو گردنوں کے اوپر مارو'' جہاں مراد گردن کا تنا ہے، نہ گردن کے اوپر۔ علاوہ ازیں اس سورت کے آخر پر بعض حالات میں دو بہنوں کا حصہ دو تہائی قرار دیا ہے ﴿فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ﴾ [176] ''اور اگر دو (بہنیں) ہوں تو ان دونوں کے لیے جو اس نے چھوڑا ہے اس کی دو تہائی ہے۔'' لیکن وہاں دو سے زیادہ بہنوں کے حصہ کا ذکر نہیں۔ تو چونکہ قرآن کریم کی بعض آیات بعض کی تفسیر کرتی ہیں اس لیے اگر ایک جگہ دو لڑکیوں سے زیادہ کے حصہ کا ذکر ہے اور دو کا نہیں اور دوسری جگہ دو بہنوں کے حصہ کا ذکر ہے اور دو سے زیادہ کے حصے کا ذکر نہیں اور باقی امور میں وہ یکساں ہیں۔ تو صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ دو لڑکیوں کا حصہ دو بہنوں سے کم نہیں ہو سکتا اور دو سے زیادہ بہنوں کا حصہ دو سے زیادہ لڑکیوں کے حصہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ پس قرآن کریم کا ایسے موقعوں پر اجمال کو اختیار کرنا اس طرف توجہ دلانے کے لیے ہے کہ اس کی وضاحت خود دوسری جگہ قرآن شریف میں موجود ہے۔

617- **اولاد کا حق وراثت:** سب سے پہلے جیسا کہ حق تھا اولاد کا ذکر کیا۔ کیونکہ ایک تو اولاد کی پرورش ماں باپ کے ذمہ ہوتی ہے۔ دوسرے عموماً ماں باپ کی وفات سے اولاد ترکہ کو لیتی ہے۔ اور اولاد کی وفات سے ماں باپ کا ترکہ کو لینا کم واقع ہوتا ہے۔ سب سے پہلی صورت یہ ہے کہ صرف اولاد ہی لینے والی ہو اور اس میں اول اس صورت کو لیا کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو

كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ

کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے اور اگر اس کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے۔[618] وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو اس نے کی ہو یا قرضہ کے۔

ان میں تقسیم وراثت کا یہ قاعدہ بتایا ہے کہ لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوچند ہو اور اس طرح ساری جائداد تقسیم ہو۔ اس صورت کا ذکر نہیں کیا جس میں صرف لڑکے ہوں۔ اس لیے کہ وہ خود اس سے ظاہر ہے اور جب صرف لڑکیاں ہی ہوں تو اس صورت میں فرمایا کہ ایک لڑکی ہو تو جائداد کی نصف کی وہ مالک ہوگی۔ باقی دور کے رشتہ داروں کو جائے گی اور اگر دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو وہ سب بحصہ مساوی دو تہائی جائداد لیں گی اور باقی ایک تہائی اور رشتہ داروں کو جائے گی۔ یہ تقسیم صرف اس صورت میں ہے جہاں اولاد کے ساتھ ماں باپ یا خاوند (بیوی) لینے والے نہیں۔

پوتے کا حق:

بظاہر یہاں صرف اولاد کا ذکر ہے یعنی بیٹوں اور بیٹیوں کا لیکن چونکہ لفظ ولد کا وسیع مفہوم ہے اس لیے اس میں اولاد کی اولاد بھی داخل ہے۔ مگر یہاں پر تعامل نے کچھ تفریق کر دی ہے۔ یعنی اول تو بیٹی کی اولاد کو ورثاء میں شامل نہیں کیا اور دوسرے بیٹوں کی اولاد کو اس صورت میں ورثا میں شامل کیا ہے جب کوئی زندہ بیٹا موجود نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص کے دو زندہ بیٹے ہیں اور ایک بیٹے کی جو مر چکا ہے اولاد موجود ہے تو اس بیٹے کی اولاد کو باقی بیٹوں کے ساتھ حصہ نہ دیا جائے گا۔ ہاں بروئے وصیت ان کو متوفی کچھ حصہ دے سکتا ہے۔ جس کے لیے پہلے حکم بھی آ چکا ہے اور اگر کوئی بیٹا زندہ نہ ہو تو پھر بیٹوں کی اولاد ان بیٹوں کے قائم مقام سمجھی جائے گی۔ مگر قرآن کریم کے کوئی لفظ یہ ہدایت نہیں کرتے نہ نبی کریم ﷺ نے کوئی ایسا فیصلہ کیا کہ ایک متوفی بیٹے کی اولاد کو زندہ بیٹوں کے ساتھ اپنے متوفی دادا کا حصہ لینے سے محروم کر دیا ہو۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ولد کے لفظ میں شامل ہونے کی وجہ سے ایک متوفی بیٹے کی اولاد زندہ بیٹوں بیٹیوں کے ساتھ اپنے دادا کا حصہ لینے کی حقدار ہے اور اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے جہاں پوتی کو بیٹی کے ساتھ شامل کر کے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے دو بیٹیاں قرار دے کر دو تہائی جائداد ان دونوں کو دے دی۔ (بخاری) گو اس میں ان کی آپس کی تقسیم میں پھر بیٹی کو ایک قرار دے کر اسے نصف دلایا اور بقیہ چھٹا حصہ پوتی کو دلایا۔ مگر بہرحال اس سے دلیل ملتی ہے کہ جب پوتی بیٹی کے قائم مقام ہو سکتی ہے تو پوتا بیٹے کے قائم مقام کیوں نہیں ہو سکتا؟ تعامل میں اصل تو نبی کریم ﷺ کا تعامل ہے جب وہ نہیں تو باقی تعامل کوئی دلیل نہیں۔ اور بہرحال ایسی صورت میں آیت اِذَا حَضَرَ کے ماتحت ایسے پوتوں کے لیے وصیت کرنا ضروری ہے اور اگر ایسی وصیت نہ کی گئی ہو تو تقسیم وراثت کے وقت بھی ان کو حصہ دیا جا سکتا ہے۔

618- اس حصہ میں ماں اور باپ کے حصہ وراثت کا ذکر کیا ہے اور اس کی تین صورتیں قائم کی ہیں۔

1. اول یہ کہ ماں باپ ہوں اور اولاد بھی ہو اس صورت میں ماں اور باپ ہر ایک چھٹا حصہ لیتا ہے اور باقی اولاد کو ملتا ہے۔ اگر

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ

تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہارے لیے فائدے کے لحاظ سے زیادہ نزدیک ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔

اولاد میں لڑکے ہوں یا لڑکے اور لڑکیاں ہوں یا دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں ہوں تو سب ان کو مل جائے گا۔ اگر صرف ایک لڑکی ہو تو نصف وہ لے گی اور باقی چھٹا حصہ پھر والد کو قریب ترین عصبہ ہونے کے لحاظ سے چلا جائے گا۔ کیونکہ اکیلی لڑکی کو بہر حال نصف سے زیادہ نہ ملے گا۔

❷ دوسری صورت یہ ہے کہ ماں باپ ہوں اور اولاد کوئی نہ ہو تو اس صورت میں ماں کو ایک تہائی اور باقی دو تہائی باپ کو چلا جائے گا۔

❸ تیسری صورت یہ بیان کی ہے کہ اولاد نہ ہو مگر بھائی ہوں۔ تو اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔ باپ کو کیا ملے گا؟

اس میں اختلاف ہے جمہور کے نزدیک بھائیوں کا ہونا صرف ماں کے تیسرا حصہ پانے کے لیے روک ہے اور بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ مگر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے کہ جو ماں کا حصہ کم ہوا ہے وہ بھائیوں کو ملے گا۔ بظاہر یہ کوئی وجہ نہیں کہ بھائی ہوں تو ماں کا حصہ کم ہو جائے۔ حالانکہ ورثہ پانے والا اور کوئی پیدا نہیں ہوا اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ بھائیوں کے ہونے سے باپ کا حصہ بڑھ کر $\frac{5}{6}$ ہو گیا اور ماں کے لیے صرف چھٹا حصہ رہ گیا۔ اس میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ کیونکہ عام اصول وراثت یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک کا حصہ کم ہونے کے لیے کوئی دوسرا اس کا پانے والا اور ہونا چاہیے۔ مگر اس پر اعتراض ہے کہ یہاں یہ ذکر نہیں کہ بھائیوں کو کیا ملے۔ میرے نزدیک اس کا ذکر چونکہ آگے آجاتا ہے اس لیے یہاں ذکر کی ضرورت نہ تھی اور ماں کا حصہ اس لیے کم کیا گیا ہے کہ بھائی حصہ پانے والے ہیں اور خود الفاظ قرآنی بھی اس پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ پہلے جہاں ماں باپ کے ساتھ اور کوئی ورثہ پانے والا نہیں وہاں صاف لفظ بڑھا دیئے ہیں ﴿وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ﴾ اس کے ماں باپ اس کے وارث ہوں۔ مگر جہاں بھائیوں کا ذکر کیا وہاں یہ لفظ نہیں بڑھائے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اب وہ بھائی بھی ساتھ وارث ہیں۔

دوسرا سوال اس صورت کے متعلق یہ ہے کہ اِخْوَةٌ سے کیا مراد ہے؟ اس پر تو اتفاق ہے کہ ایک بھائی ہو تو وہ ماں کا تیسرا حصہ پانے میں مانع نہیں ہوگا اور تین ہوں گے تو وہ ضرور مانع ہوں گے مگر دو کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ اِخْوَةٌ چونکہ جمع ہے اس لیے دو اس میں داخل نہیں بعض نے کہا کہ دو پر بھی جمع کا حکم ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے بھی مروی ہے [اَلْاِثْنَانِ فَمَا فَوْقَهُمَا جَمَاعَةٌ] (سنن الدارقطنی، کتاب الصلاۃ، باب ذِكْرِ الصَّلاَةِ فِي أَعْطَانِ الإِبِلِ وَمَرَاحِ الْغَنَمِ، حدیث: 1097) دو یا اس سے بڑھ کر جماعت ہے اور اکثر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مذہب یہی ہے کہ دو اِخْوَةٌ کے لفظ میں شامل ہیں۔

میرے نزدیک قرآن کریم نے وراثت کے معاملہ میں الفاظ کو وسیع معنی پر محمول کیا ہے ولد کو واحد جمع مذکر مؤنث میں یکساں استعمال کیا ہے۔ اَبٌ میں اگر باپ نہ ہو تو دادا مراد ہوگا۔ اُمٌ میں اگر ماں نہ ہو تو دادی مراد ہوگی۔ اسی طرح اِخْوَةٌ کا لفظ عام ہے

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۱﴾ اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (619)

اور اس میں بھائی اور بہنیں سب شامل ہیں خواہ ایک ہوں یا زیادہ۔ اور ان کے حصص کا ذکر آگے چل کر آتا ہے، جہاں کلالہ کی وراثت کا ذکر ہے۔ جہاں صاف یہ بیان فرمایا کہ اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اس کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں شریک ہوں گے۔ پس ماں باپ کے ہوتے ہوئے اگر بھائی بہنیں ہوں تو اس کی صورت یہ ہے کہ ماں کو چھٹا حصہ، ایک بھائی یا بہن ہو تو اس کو چھٹا حصہ اور باقی دو تہائی باپ کو۔ ایک سے زیادہ بھائی بہنیں ہوں تو ماں کو چھٹا حصہ، سب بھائی بہنوں کو تیسرا حصہ اور باقی نصف باپ کو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ صورت تعامل کے خلاف ہے۔ مگر مسئلہ وراثت میں تعامل میں اختلاف چلا آتا ہے۔ نہ صرف بہت سے مسائل میں شیعہ سنی کا اختلاف ہے بلکہ خود علمائے اہل سنت والجماعت میں بھی اختلاف ہے۔ اور صحابہ میں رضی اللہ عنہم اجمعین بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ کئی مسائل میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب دوسرے صحابہ کے خلاف ہے۔ اگر لفظ کلالہ کے یہ معنی صحیح ہیں کہ کلالۃ اس کو بھی کہتے ہیں جس کا ماں باپ اور اولاد دونوں نہ ہوں جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور اس کو بھی کہتے ہیں جس کے ماں باپ ہوں اور اولاد نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ تو دو جگہ مختلف کلالہ کے ذکر سے مراد یہ دونوں صورتیں ہوں گی اور چونکہ قرآن کریم نے اس آیت میں صاف ذکر کیا ہے کہ اولاد نہ ہو اور ماں باپ کے ساتھ بھائی ہوں۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اس صورت میں جو بھائیوں کو ملنا چاہیے اس کا ذکر بھی قرآن شریف میں ہے اور یہی وہ صورت ہے جس کا ذکر زوجین کے بعد آتا ہے۔

619- **وصیت اور قرضہ:** ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ یُّوۡصِیۡ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ﴾ یہ الفاظ ساری آیت پر حاوی ہیں۔ کیونکہ ان تمام کا ذکر کر کے آخر میں اس کا ذکر کیا ہے گویا خواہ صرف اولاد وارث ہو یا ماں باپ اولاد کے ساتھ یا اولاد کے بغیر یا بھائیوں کے ساتھ وارث ہوں۔ تمام صورتوں میں اگر کوئی وصیت ہو یا قرضہ ہو تو پہلے اس کی ادائیگی ضروری ہے اور جو باقی بچ رہے وہ بموجب حصص مذکورہ بالا تقسیم ہوگا۔ قرضہ اور وصیت میں سے قرآن کریم نے پہلے وصیت کا نام لیا ہے مگر اس سے یہ مراد نہیں کہ قرضہ سے پہلے وصیت کا مال ادا کیا جائے۔ اس لیے کہ مال متروکہ قرار وہی پائے گا جو بعد ادائیگی قرضہ ہو۔ اور اَوۡ ترتیب کے لیے نہیں آتا۔ وصیت کے ذکر کو مقدم اس لیے کیا کہ جب کوئی وصیت کرے گا تو اس وصیت میں قرضہ کا ذکر تو خود ہی کرے گا۔ اس لیے صرف وصیت کی تعمیل میں قرضہ کی ادائیگی آجاتی ہے۔ اور اس کے بعد اَوۡ دَیۡنٍ کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ اگر کسی نے وصیت نہیں کی مگر قرضہ اس کے ذمہ ثابت ہے تو قرضہ بہر حال ادا ہی کرنا ہوگا۔

﴿اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَیُّہُمۡ اَقۡرَبُ لَکُمۡ نَفۡعًا﴾ قرابت کے لحاظ سے اصل حق دار وراثت یا اولاد ہے یا ماں باپ۔ مگر اولاد کو پہنچنا تو قوانین دنیا نے تسلیم کیا ہے لیکن ماں باپ کو عموماً کچھ نہیں دیا جاتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے جب ماں باپ کے حصص کا ذکر فرمایا تو بتا دیا کہ ماں باپ کے حقوق کو کم مت سمجھو انسان کو نفع ماں باپ سے بھی پہنچتا ہے اور اولاد سے بھی۔ پس جن سے انسان نفع اٹھاتا ہے اس کے ترکہ سے ان کو نفع پہنچنا چاہیے اس لیے ماں باپ کے حقوق کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

وَ لَكُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَكَ اَزۡوَاجُكُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِيۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ وَ لَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّكُمۡ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَكُمۡ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا

اور تمہارے لیے اس کا نصف ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑیں اگر ان کی اولاد نہ ہو۔ اگر ان کی اولاد ہو تو تمہارے لیے اس کا چوتھا حصہ ہے جو انہوں نے چھوڑا ہے وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو انہوں نے کی ہو یا قرضہ (کے) اور ان کے لیے اس کا چوتھا حصہ ہے جو تم نے چھوڑا ہے۔ اگر تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو ان کے لیے اس کا آٹھواں حصہ

وصیت کا حق کہاں تک ہے:

ہر دفعہ جہاں حصص کا ذکر ہے ساتھ یہ لفظ بھی بڑھا دیئے ہیں کہ یہ تقسیم وصیت کی تعمیل کے بعد ہوگی۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وصیت کی رو سے ایک شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے مال کو اپنے ورثا میں تقسیم کر دے یا ان کو محروم کر دے۔ یہ ایک ظاہر امر ہے کہ ایسی وصیت خود احکام آیت کو باطل کرتی ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ خود ہی ایک تقسیم قائم کر کے پھر خود ہی ایسی بھی اجازت دے کہ وہ تقسیم باطل ہو جائے۔ اگر منشاء الٰہی یوں ہوتا کہ مال کی تقسیم تو وصیت کے مطابق ہونی چاہیے لیکن جس صورت میں وصیت نہ ہو تو پھر یوں تقسیم ہو تو حصص کے مقرر کرنے سے پہلے یہ ہدایت صاف طور پر دے دی جاتی کہ مال کی تقسیم تمہاری وصیتوں کے مطابق ہوگی۔ لیکن جہاں وصیت نہ ہو وہاں ذیل کی تقسیم ہو۔ برخلاف اس کے قرآن کریم نے پہلے حصص مقرر کر کے پھر وصیت کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وصیت مال کے کسی خاص حصہ کے متعلق ہونی چاہیے اور چونکہ حدیث صحیح سے ثابت ہے جس کا ذکر مفصل [نوٹ نمبر: 220] میں ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت کی اجازت نہیں دی۔ اس لیے پہلی شرط اس وصیت کے لیے جس کا ذکر اس آیت میں ہے یہ ہے کہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ کے لیے نہ ہو، دوسری شرط کا ذکر بھی ایک حدیث میں ہے کہ [لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ] (سنن أبي داؤد، كتاب الإجارة، باب فِي تَضْمِينِ الْعَارِيَةِ: 3567) یعنی جو شخص حصص مقررکردہ کے مطابق وراثت پاتا ہے اس کے لیے وصیت کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ حدیث نہ بھی ہوتی تب بھی یہ بات ظاہر تھی کہ جب ورثاء کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے حصص مقرر کر دیئے ہیں تو اب ایک شخص کو یہ اختیار ہونا کہ وہ ورثاء میں سے کسی کے لیے کچھ وصیت بھی کر دے، پھر ایک ناانصافی ہو جاتی ہے کہ ایک وارث کو دوسرے سے بڑھ کر حقدار بنا دیا گیا۔ اس لیے حق یہی ہے کہ وارث کے لیے وصیت نہیں ہو سکتی۔ پس یہ دو شرائط وصیت کے لیے ضروری ہیں۔ اول ایک تہائی سے زیادہ مال کی وصیت نہ ہو دوسرے وارث کے لیے وصیت نہ ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ وصیت کس قسم کی ہو؟ [نوٹ نمبر: 220] سے معلوم ہوگا کہ اس **وصیت کی غرض** خدا کے لیے کچھ مال کا

تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ

ہے جو تم نے چھوڑا ہے وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو تم نے کی ہو یا قرضہ کے۔ (620) اور اگر کوئی مرد یا عورت

چھوڑنا ہے۔ خواہ وہ اشاعت دین کے لیے ہو یا کسی غریب یا مفلس رشتہ دار کے لیے یا کسی یتیم کے لیے ہو۔ بعض غریب اور یتیم رشتہ داروں میں بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو متوفی کے مال کا کچھ حصہ بطور ورثہ نہیں پہنچتا۔ مثلاً موجودہ تعامل کے مطابق بیٹیوں کی موجودگی میں کسی متوفی بیٹے کے بیٹے یعنی یتیم پوتے۔ لیکن زیادہ تر اس کی غرض محض فی سبیل اللہ یا اشاعت دین کے لیے کچھ چھوڑنا ہے جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے۔ جس طرح قرآن کریم کے بہت سے اصول مسلمانوں نے ترک کر دیئے اور غیر مسلموں نے لے لیے ہیں۔ اسی طرح فی سبیل اللہ وصیت کا معاملہ بھی ہے۔ مسلمانوں میں بہت کم ہیں جو اپنے مال کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں وصیت کر جائیں۔ لیکن عیسائیوں میں جا کر دیکھو تو جہاں بڑی بڑی جائدادیں ہیں کچھ نہ کچھ حصہ مال قوم کی بہتری یا اور کسی نیک غرض کے لیے وصیت کر دیا جاتا ہے۔ پھر قرآن کے حکموں کی تعمیل اگر دوسرے کریں تو کیوں ان سے نفع نہ اٹھائیں اور مسلمان اگر قرآن کو اپنا رہنما نہ بنائیں تو کس طرح پر وہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

620- **خاوند اور بیوی کے حصے:** یہ تیسری صورت ہے۔ اس میں متوفی کی بیوی یا خاوند زندہ ہے۔ اگر بیوی مر گئی ہے اور اولاد ہے تو خاوند کو چوتھا حصہ اور نہیں ہے تو نصف اور اگر خاوند مر گیا ہے اور بیوی زندہ ہے اور اولاد ہے تو بیوی کو ''آٹھواں'' حصہ اور نہیں ہے تو بیوی کو ''چوتھا'' حصہ۔ ایک سے زیادہ بیبیاں ہوں تو اسی حصہ میں شریک ہوں گی اور باقی اولاد لے گی۔ لیکن اس صورت میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ خاوند یا بیوی بھی ہو اور ماں باپ بھی ہوں تو حصص کس طرح تقسیم ہوں گے۔ اس صورت میں خواہ اولاد ہو یا نہ ہو بعض مشکلات پیش آتی ہیں۔ اگر اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند ہو تو نصف خاوند کو چاہیے۔ ایک تہائی ماں کو اور اس طرح پر باپ کا حصہ صرف چھٹا رہ جاتا ہے جو ماں سے نصف ہے۔ اور اگر اولاد میں مثلاً لڑکیاں ہوں اور خاوند ہو اور ماں باپ ہوں تو لڑکیوں کو دو تہائی چاہیے، ماں باپ کو ایک تہائی۔ تو خاوند کے لیے کچھ نہیں بچتا۔ صورت اول میں یعنی جب اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند یا بیوی ہو تو اکثر اس طرف گئے ہیں کہ خاوند یا بیوی پہلے اپنا حصہ لیں گے اور باقی ایک تہائی ماں کو اور دو تہائی باپ کو جائے گا اور اس طرح پر حصص ٹھیک ہوں گے۔ یہی درست ہے اور یہ مذہب حضرت عمر و عثمان و علی و زید بن ثابت اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین اور ساتوں فقہاء اور چار ائمہ اور جمہور علماء کا ہے۔ (ث) کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خاوند یا بیوی کو دے کر باقی مال ماں باپ کے حصص کے لیے کل مال قرار پائے گا اور ان کے حق میں ترکہ وہی ہے جو خاوند یا بیوی کو دینے کے بعد رہے اور اس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ مَا تَرَكَ نہیں کیونکہ مَا تَرَكَ ہر ایک کے لیے الگ الگ ہے۔ اگر قرضہ ہو تو پہلے ترکہ میں سے قرضہ جانا چاہیے۔ اگر وصیت بھی ہے تو قرضہ کے بعد وصیت والوں کو ملنا چاہیے۔ اگر خاوند یا بیوی ہے تو وصیت کے بعد اسے ملنا چاہیے۔ پھر اس میں سے جو رہ جائے اس میں سے ماں باپ کا حصہ اور بقیہ اولاد کا حصہ ہوگا۔ اور جس طرح پر قرآن کریم نے حصص قائم کیے ہیں وہ خود اس اصول کی صداقت پر شاہد ہے۔ کیونکہ اول یہ ذکر کیا کہ صرف اولاد ہو ماں باپ نہ ہوں۔ پھر یہ ذکر کیا کہ ماں باپ ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو۔ تو اگر پہلی صورت میں اولاد فوراً لیتی ہے تو اس صورت میں پہلے ماں باپ لیتے ہیں

امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ جس کی میراث لی جاتی ہے کلالہ ہو[621] اور اس کا بھائی یا

باقی اولاد لیتی ہے۔ تیسری صورت اب یہ ہے کہ خاوند یا بیوی ہو تو ظاہر ہے کہ جس طرح ماں باپ کو دے کر بقیہ اولاد کے لیے جاتا ہے۔ اسی طرح اگر خاوند یا بیوی کے ساتھ ماں باپ بھی ہیں تو خاوند یا بیوی کو دے کر ماں باپ کو دیا جائے گا۔ اس صورت میں جس کو خود علمائے امت نے ایک مشکل کو حل کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ عول وغیرہ کی تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں اور مسئلہ وراثت بالکل صاف ہو جاتا ہے اور اس میں سے بہت سی پیچیدگیاں دور ہو جاتی ہیں۔ **مسئلہ عول** جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے وہ بھی اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے کہ خاوند یا بیوی کے حق کو فائق نہ کیا جائے۔ کیونکہ عول کی صورت ایسی ہے کہ مثلاً بیوی زندہ ہے دو یا زیادہ لڑکیاں ہیں' ماں باپ ہیں۔ اب بیوی کو آٹھواں چاہیے' لڑکیوں کو دو تہائی' ماں باپ کو ایک تہائی۔ اور یہ حصے پورے نہیں ہوتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بذریعہ عول اس کا حل یوں کیا تھا کہ کل ستائیس حصے کیے جائیں۔ جن میں سے سولہ لڑکیوں کو دیئے جائیں۔ آٹھ ماں باپ کو' تین بیوی کو اس طرح مال تو پورا ہو گیا مگر دو تہائی ایک تہائی آٹھواں حصہ کچھ بھی درست نہ رہا۔ اگر اس کی بجائے یوں کیا جاتا کہ بیوی کا حق نکال کر باقی میں سے ماں باپ کا تیسرا دیا جاتا اور پھر بقیہ لڑکیوں کو تو یہ مشکل ہی پیش نہ آتی۔ یا اگر بیوی کا حق پہلے نہ بھی نکالا جائے تو بھی لڑکیوں کو دو تہائی اس لیے نہیں دینا چاہیے کہ ان کے ساتھ ماں باپ موجود ہیں اور لڑکیاں دو تہائی اس وقت لیتی ہیں جب دوسرا ساتھ لینے والا کوئی نہ ہو۔ پس آٹھواں حصہ بیوی کا اور ایک تہائی ماں باپ کا نکال کر بقیہ لڑکیوں کو دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر لڑکیوں کی بجائے لڑکے ہوتے یا لڑکے اور لڑکیاں ہوتیں تو ان کو بھی بقیہ ہی دیا جاتا اور لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ پانے کی بہرحال حقدار نہیں۔

اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ یہ ناانصافی ہے کہ پہلے خاوند یا بیوی کو اپنا حصہ مل جائے تو باقی میں سے والدین کا چھٹا چھٹا حصہ نکلے اور پھر اس کا بھی بقیہ اولاد کو ملے تو یہ فی الحقیقت کوئی ناانصافی نہیں کیونکہ خاوند یا بیوی جو کچھ لیں گے وہ بھی اولاد کی بہتری پر ہی صرف ہوگا اور حق یہی ہے کہ خاوند یا بیوی کا ایک گونہ اشتراک جائداد میں ہوتا ہے کیونکہ وہ دونوں اس کے بنانے والے ہیں۔ خاوند کی جائداد کے بننے میں بیوی مددگار ہوتی ہے اور بیوی کی جائداد بننے میں خاوند مددگار رہتا ہے اور اس طرح مسئلہ وراثت کی تمام دقتیں صاف ہو جاتی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی فیصلہ اس کے خلاف مروی نہیں۔ صرف ایک فیصلہ سعد بن الربیع کی بیٹیوں اور بیوی کا مذکور ہے جس میں بیوی کو آٹھواں حصہ' بیٹیوں کو دو تہائی اور بقیہ چچا کو دیا گیا۔ یہ روایت اول تو بہت اعلیٰ پایہ کی نہیں اور دوسرے اس میں کوئی تفصیلات نہیں جن سے ہمارے اس مفہوم کے خلاف کوئی نتیجہ نکل سکتا ہو۔

621- كَلٰلَةٌ۔ اس کا مادہ كَلَّ ہے جس کے معنی تھک جانا ہیں۔ راغب رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ ان وارثوں کا نام ہے جو والد اور ولد کے سوا ہوں اور ساتھ ہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کرتے ہیں کہ اولاد کے سوا جو وارث ہوں ان کا نام ہے اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ كَلٰلَةٌ وہ ہے جو مر جائے اور اس کی اولاد یا اس کا والد کوئی نہ ہو۔ تو یہاں گویا میت کو کلالہ قرار دیا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ دونوں قول صحیح ہیں اور اس کی تطبیق یہ ہے کہ کلالہ مصدر ہے جو وارث اور موروث دونوں کو جمع کرتا ہے۔

مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ

بہن ہوتو ان دونوں میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو تہائی میں شریک ہیں وصیت (کی ادائیگی) کے بعد جو کی گئی ہو یا قرضہ (کے) جو

کلالہ کی وراثت:

مفسرین میں دو گروہ ہیں۔ بڑا گروہ تو اس طرف گیا ہے کہ كَلَالَةٌ وہ ہے جس کا نہ والد ہو نہ ولد۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ کلالہ وہ ہے جس کا ولد نہ ہو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا خیال بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے گو ایک روایت میں آتا ہے کہ چونکہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کے معنی یہ کیے ہیں کہ اس کا والد و ولد نہ ہو اس لیے میں خاموشی اختیار کرتا ہوں۔ مگر ایک روایت میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے وہی معنی کیے ہیں جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کیے ہیں یعنی جس کا ولد نہ ہو۔ دیکھو غرائب القرآن [وَعَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، قَالَ: الْكَلَالَةُ: مَنْ لَّا وَلَدَ لَهُ. فَقَطْ] (السنن الكبرى للبيهقي: جلد6، صفحہ225، حدیث: 12644) اور ایک روایت سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ آپ کہا کرتے تھے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کو وضاحت سے بیان کر دیا ہوتا تو میرے نزدیک ساری دنیا سے زیادہ محبوب تھا۔ کلالہ، خلافت، ربا۔ (غق)

قرآن کریم میں دو جگہ کلالہ کا ذکر آیا ہے۔ ایک یہاں اور ایک اسی سورت کے آخر میں۔ یہاں بھائی یا بہن کا حصہ چھٹا اور زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک اور وہاں بہن کا نصف۔ دو یا زیادہ بہنیں ہوں تو دو تہائی۔ صرف بھائی ہوں ایک یا زیادہ تو کل لیں۔ بھائی اور بہنیں ملے جلے ہوں تو سارا ورثہ مرد کو عورت سے دو چند حصہ دے کر تقسیم ہو۔ مفسرین نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ یہاں بھائی بہن سے مراد اخیافی بھائی بہن ہیں یعنی ماں کی طرف سے اور دوسرے موقعہ پر یعنی آخر سورت میں بھائی بہن سے مراد اعیانی یا علاتی بہن بھائی ہیں۔ یعنی ماں باپ دونوں کی طرف سے یا صرف باپ کی طرف سے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث اس کے متعلق نہیں۔ اس لیے دوسری توجیہ اس کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دونوں جگہ کلالہ سے الگ الگ مراد ہے۔

دو قسم کے کلالہ:

یہاں كَلَالَةٌ سے مراد وہی صورت ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی اولاد نہ ہو۔ مگر ماں باپ ہوں اور بہن بھائی ہوں اور سورت کے آخر میں كَلَالَةٌ سے مراد وہ کلالہ ہے جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد اور یہی وجہ ہے کہ وہاں ساری جائداد بہن بھائیوں کو دلاتا ہے اور یہاں نہیں دلاتا۔ کیونکہ وہاں اور کوئی وارث نہیں ہے اور یہاں ہی اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اوپر ایک صورت کا ذکر کیا تھا کہ بھائی ہوں اور اولاد نہ ہو تو ماں کو چھٹا حصہ ملے گا مگر بھائیوں کا حصہ بیان نہ کیا تھا۔ اس کا ذکر اب یہاں کر دیا ہے ورنہ یہ اعتراض باقی رہتا کہ ایک صورت کو قائم کر کے حصص کا ذکر نہیں کیا۔

اس طرح پر ان چار احکام میں ذیل کی چار صورتیں بیان کر دی ہیں۔ اول صرف اولاد ہو۔ دوم ماں باپ ہوں اور اولاد ہو یا نہ

غَيۡرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۲﴾

ضرر پہنچانے کے لیے نہ ہو۔[622] یہ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے اور اللہ جاننے والا بردبار ہے۔

تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۳﴾

یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

وَ مَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيۡهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۱۴﴾ ع 2 4 13

اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی حد بندیوں سے آگے نکلتا ہے اسے آگ میں داخل کرے گا وہ اس میں رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔[623]

ہو۔ سوم خاوند بیوی ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو۔ چہارم ماں باپ ہوں اور اولاد نہ ہو اور بھائی ہوں۔ اور پانچویں صورت سورت کے آخر پر یہ بیان کی ہے کہ نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں، صرف بھائی بہن ہوں۔ ان پانچوں صورتوں میں اگر خاوند یا بیوی ہو تو اس کا حق پہلے نکالو۔ پھر ماں باپ ہوں تو ان کا حق دو پھر اولاد کو۔ اور اولاد نہ ہو یا ماں باپ اور اولاد دونوں نہ ہوں تو بھائی بہنوں کو۔

622- **ضرر والا قرضہ:** ﴿غَيۡرَ مُضَآرٍّ﴾ وصیت اور قرضہ کے پہلے ادائیگی کا حکم تو ہر جگہ دیا ہے مگر یہاں ﴿غَيۡرَ مُضَآرٍّ﴾ ساتھ بڑھا دیا ہے یعنی وصیت یا قرضہ ایسے ہوں جو ضرر پہنچانے والے نہ ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اولاد کوئی نہیں۔ اور جب اولاد موجود نہ ہو تو ممکن ہے کہ محض دور کے ورثا کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی قرضہ کا اقرار کر لیا جائے یا بلا ضرورت کوئی قرضہ لے لیا جائے اور اسی طرح محض نقصان پہنچانے کو کوئی وصیت کر دی جائے۔ اس لیے اس قید کی ضرورت یہاں پیش آئی ہے اور ﴿غَيۡرَ مُضَآرٍّ﴾ کا لفظ وصیت اور دین دونوں پر حاوی ہے۔

623- **رواج اور قرآن:** ان دونوں آیات میں بتایا ہے کہ یہ احکام گو دنیوی امور کے متعلق ہیں مگر ان کو استخفاف کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ اسلام کے احکام دینی اور دنیوی بہبودی سے یکساں تعلق رکھتے ہیں اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان احکام کی مخالفت کرنے والے جہنم میں جائیں گے اور ساتھ ﴿خَالِدًا فِيۡهَا﴾ کے الفاظ بھی بڑھا دیئے ہیں۔ باوجود اس تاکید شدید کے

وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰى یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝۱۵

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا ارتکاب کریں تو اپنے میں سے چار گواہ ان پر بلاؤ۔ سو اگر وہ گواہی دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ ان کو موت لے جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے۔ (624)

مسلمانوں نے اس زمانہ میں بالخصوص پنجاب و ہندوستان کے دیہات میں صریحاً ان احکام کو پس پشت ڈالا ہے یہاں تک کہ واجب العرض میں صاف یہ لفظ لکھوا دیتے ہیں کہ ہم قرآن کی پیروی نہیں کریں گے رواج کی پیروی کریں گے۔ کیا اسی مخالفت کا نتیجہ ہی وہ نہیں جو خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے ﴿وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾ یعنی ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے؟ واقعی مسلمان احکام قرآنی کی خلاف ورزی کی وجہ سے ہی ذلیل ہو رہے ہیں۔

624- یَاْتِیْنَ۔ اِتْیَانٌ (اَتٰی) کے اصل معنی آنا ہیں۔ مگر خود کسی انسان کے آنے پر یا کسی امر کے کرنے پر یا کسی تدبیر کے کرنے پر بولا جاتا ہے کیونکہ آنا بالذات یا بِالْاَمْرِ یا بِالتَّدْبِیْرِ ہو سکتا ہے۔ (غ) پس یہاں مراد ارتکاب فاحشہ ہے۔

الْفَاحِشَةَ۔ ہر قول یا فعل جو بڑا قبیح ہو [دیکھو نمبر: 206]۔ گو اس میں شک نہیں کہ فَاحِشَةٌ کا لفظ قرآن شریف اور زبان عربی میں زنا پر بھی بولا گیا ہے مگر اصل استعمال اس کا ہر قبیح کام پر ہے اور اسی معنی میں زیادہ تر قرآن شریف میں بھی آیا ہے۔ جیسے ﴿وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً﴾ [الأعراف: 28:7] ''اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں۔'' ﴿فَاِنَّهٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ [النور: 21:24] ''تو (شیطان) بے حیائی اور برائی کے لیے ہی کہتا ہے۔'' اور ابن اثیر کہتے ہیں کہ حدیث میں فحش اور فاحشہ اور فواحش کا ذکر بار بار آیا ہے اور وہ ہر قسم کے ذنوب اور معاصی پر مشتمل ہے جن کی قباحت سخت ہو اور کثرت سے فَاحِشَةٌ بمعنی زنا بھی آیا ہے اور اصل میں ہر ایک قبیح خصلت قول ہو یا فعل فاحشہ کہلاتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان یہودیوں کو جنہوں نے آنحضرت ﷺ سے گستاخی کی تھی کچھ سخت لفظ کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسا مت کہو [لِاَنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفُحْشَ] اللہ تعالیٰ فحش کو پسند نہیں کرتا اور یہاں فحش سے مراد صرف سخت گوئی ہے۔

عورت کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب:

پہلے دو رکوعوں میں عورتوں کے حقوق کو بیان کیا ہے اس رکوع میں کچھ ان کی ذمہ داری کا ذکر ہے۔ جس طرح اسلام نے سارے مذاہب سے امتیاز کے طور پر عورتوں کو بہت سے حقوق دیئے ہیں اور ان کے ساتھ حسن معاشرت کو تعلیم الٰہی کا حصہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی رکھی ہیں۔ اور یہ چاہا ہے کہ جس طرح سے وہ حقوق کو حاصل کرنے میں تمام دنیا کی عورتوں پر فائق ہیں اسی طرح اپنے چال چلن میں اعلیٰ درجہ کی پاکبازی اور راستبازی اختیار کرنے میں بھی فوقیت لے جائیں۔ چونکہ

وَ الَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ اور جو دو تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو

اسلام کا اصل منشا یہی تھا کہ عورت کی ذلت کے جس قدر اسباب ہیں ان سب کو دور کیا جائے اس لیے اگر ایک طرف اس کے حقوق کو محفوظ کیا ہے جس سے اس کی عزت اور مرتبہ بڑھتا ہے تو دوسری طرف اس کی عصمت کو محفوظ کرنے کے اسباب کا بھی ساتھ ہی ذکر کر دیا تا عورت پر سے ہر قسم کی ذلت دور ہو۔ چنانچہ اس آیت کا مقصود بھی یہی ہے۔

مبادیٔ زنا کا علاج:

اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں الْفَاحِشَةَ سے مراد زنا ہے اور یہاں زنا کی سزا بتائی ہے اور پھر اس کو سورۃ نور کی آیت جَلْدَ سے اور عملی حکم رَجم سے منسوخ قرار دیا ہے بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ حدیث سے (یعنی مسلم کی حدیث جس میں ہے:[الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ] (صحيح مسلم، كتاب الحدود، باب حَدِّ الزِّنَا: 4509) اور حدیث منسوخ ہے آیت جَلْدَ سے اور آیت جلد منسوخ ہے دلائل رَجم سے۔ (غق) لیکن جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے قرآن شریف میں کوئی حکم منسوخ نہیں نہ نبی کریم ﷺ نے کسی حکم کو منسوخ قرار دیا اور نہ کسی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں الْفَاحِشَةَ کے معنی زنا بتائے ہیں۔ اس لیے ہم فاحشہ سے مراد یہاں عام معنی ہی لیں گے۔ کیونکہ الفاظ کے معانی میں ہمیں وہ راہ اختیار کرنی چاہیے جس سے ایک آیت دوسری کے خلاف نہ ہو۔ پس الْفَاحِشَةَ سے یہاں مراد بے حیائی کا ارتکاب ہے جسے مبادیٔ زنا کہنا چاہیے اور یہاں قرآن کریم نے ایک راہ بتائی ہے کہ کس طرح عورتوں کو زنا سے بچانے کے لیے وقت پر اس کا انسداد کرنا چاہیے اور وہ یہ علاج ہے کہ جب کسی عورت سے مبادیٔ زنا کا ارتکاب ثابت ہو تو اس کا فوری علاج یہ ہے کہ انہیں گھروں میں بند کر دیا جائے یعنی ان کی آزادی سلب کر دی جائے اور ان کو باہر نکلنے سے قطعاً محروم کر دیا جائے یہاں تک کہ اسی حالت میں ان پر موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے اور وہ راہ توبہ ہے۔ یا اگر ایسی عورتیں ہیں جن کا ابھی نکاح نہیں ہوا تو نکاح سے ان کی حالت سدھر سکتی ہے (مفسرین نے بھی ﴿يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا﴾ میں نکاح مراد لیا ہے۔) اس طرح آزادی کے روک دینے سے دو غرضیں حاصل ہوتی ہیں ایک یہ کہ ان کو خود بدی میں مبتلا ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دوسروں کے لیے بدنمونہ نہیں بنتیں۔ ابو مسلم نے یہاں الْفَاحِشَةَ سے مراد سحاقت کو لیا ہے یعنی عورت کا عورت سے ارتکاب فاحشہ۔

تعلیم اسلام میں زنا سے بچانے کے سامان:

اگر غور کیا جائے تو اسلام کی تعلیم نہایت تدریجی اور خوبصورت ہے۔ زنا جیسی بلا سے بچانے کے لے کس قدر رکاوٹیں تجویز کی ہیں۔ اول تو مردوں اور عورتوں کے کھلے میل جول اور عورتوں کے غیر محرم مردوں سے خلوت اختیار کرنے کو روکا ہے۔ پھر عورتوں کو اس بات سے روکا ہے کہ وہ بن سنور کر اور سنگار کر کے باہر نکلیں۔ بلکہ حکم دیا ہے کہ جب باہر نکلیں تو ایک سادہ کپڑا اوپر اوڑھ لیں۔ جس سے ان کے لباس وغیرہ کی زینت ڈھک جائے۔ پھر یہ حکم دیا کہ باہر نکلیں تو مرد و عورت دونوں نگاہیں نیچی رکھیں۔

تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کریں تو ان کو جانے دو اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔(625)

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

اللہ کے نزدیک توبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے بدی کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ پس انہی پر اللہ (رحمت سے) متوجہ ہوتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔(626)

پھر فرمایا کہ اگر عورت سے مبادی زنا کا ارتکاب ہوتا دیکھو تو اس کے باہر نکلنے کو قطعاً روک دو یہاں تک کہ وہ توبہ کرے یا جائز طور پر نکاح ہو کر خیالات شہوانی ویسے رک جائیں۔ اور سب سے آخر جب کسی طرح کوئی نہ رکے تو پھر زنا کے لیے خطرناک سزا کوڑوں کی تجویز کی ہے۔ عصمت کو قائم کرنے لیے اس سے بڑھ کر اصلاح کی صورت ناممکن ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم کی تعلیم اخلاقی و روحانی کو کمال تک پہنچانے پر شاہد ہیں۔

625- الَّذٰنِ۔ گو اصل میں دو مردوں کے لیے ہے مگر بلحاظ تغلیب مذکر ایک مرد اور ایک عورت پر بھی بولا جا سکتا ہے۔

مبادیٔ زنا میں مرد کے لیے سزا:

چونکہ پچھلی آیت میں عورتوں کی بے حیائی کے ارتکاب کا ذکر کیا تھا تو یہ بتانے کے لیے کہ یہ امر صرف عورتوں میں ہی معیوب نہیں اور انہی کے لیے سزا نہیں بلکہ اگر مرد اور عورت دو کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں اور دونوں سے مبادیٔ زنا کا ظہور ہو تو دونوں کو سزا دی جائے۔ عورت کی سزا کا ذکر تو اوپر آ چکا کہ اس کو باہر نکلنے سے روک دیا جائے۔ مرد کی سزا کو خاص الفاظ میں بیان نہیں کیا اس لیے کہ عورت تو گھر کے اندر رہ کر گھر کے کاروبار میں مدد دے سکتی ہے کیونکہ اس کے کام کا دائرہ زیادہ تر گھر کے اندر محدود ہے۔ لیکن مرد کو ایسی سزا دینا گویا اسے کاروبار سے روکنا تھا۔ اس لیے عام الفاظ میں کہہ دیا کہ سزا تو دونوں کو دی جائے گی مگر اپنے اپنے حالات کے مطابق۔ الَّذٰنِ سے مراد مفسرین نے بھی یہاں مرد و عورت ہی لیا ہے۔ گو اٰذُوْهُمَا کی سزا کو فہمائش یا تنبیہ و زجر یا ہلکی سزا تک محدود رکھا ہے۔ ابو مسلم نے الَّذٰنِ سے مراد دونوں مرد لے کر یہاں لواطت کا ارتکاب مراد لیا ہے۔ جیسے پہلی آیت میں سحاقت۔ اور یہی قول مجاہد کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کے توبہ کرنے پر ان سے اعراض کرنا صاف بتاتا ہے کہ یہاں کس قسم کے مبادی مراد ہیں۔ اور یہاں توبہ کا لفظ پہلی آیت کے ﴿يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا﴾ کی بھی تشریح کرتا ہے کہ وہاں بھی مراد اصل میں توبہ ہی ہے۔

626- ﴿التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ﴾ عام طور پر یہی معنی کیے گئے ہیں کہ توبہ کا قبول کرنا اللہ پر ایسے لوگوں کے حق میں ہے۔ مگر چونکہ قبولیت توبہ کا

وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيْنَ

اور توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بدیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آموجود ہوتی ہے کہتا ہے اب میں نے توبہ کی اور نہ ان لوگوں کے

ذکر صریح الفاظ میں آگے آتا ہے اس لیے یہاں عَلٰی کو اگر بمعنی عِنْدَ لیا جائے جیسا کہ طبری نے لیا ہے۔ (ر) تو وہ معنی ہوں گے جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں کہ توبہ اللہ کے نزدیک صرف ان لوگوں کی ہے جو ایسا کرتے ہیں اور یہ تو توبہ کرنے والوں کا ذکر ہوا۔ اس لیے آگے فرمایا کہ ایسوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے اور اگلی آیت کی ترکیب ﴿لَيْسَتِ التَّوْبَةُ﴾ کے ساتھ بھی یہی معنی موزوں ہیں۔ یا تَوْبَةُ سے مراد توفیق توبہ بھی ہوسکتی ہے۔

جَهَالَةٍ۔ جَهْلٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 96]۔ مجاہد کا قول ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے خطا سے ہو یا عمداً وہ جاہل ہے یہاں تک کہ گناہ سے باہر نکلے۔ (ث) اور قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ سب کا اس پر اتفاق تھا کہ ہر ایک چیز جس کے ساتھ ایک شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ جہالت ہے خواہ عمداً ہو یا سہواً۔ (ث) اور خود قرآن کریم میں بھی جَهَالَةٍ کا لفظ صرف معصیت کے لیے استعمال ہوا ہے ﴿هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ﴾ [یوسف: 89:12] ''کیا تم جانتے ہو تم نے یوسف اور اس کے بھائی سے کیا کیا، جب تم جاہل تھے۔'' حالانکہ وہ جرم ان کا عمداً تھا۔

﴿مِنْ قَرِيْبٍ﴾۔ اس کے لفظی معنی تو جلدی کے ہی ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی موت سے پہلے کسی وقت بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا، بشرطیکہ صدق دل سے ہو اور نہ کبھی کرے گا۔ اس لیے اس لفظ میں وسعت ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مِنْ قَرِيْبٍ سے مراد ہے کہ اس وقت کے اندر جو اس کے اور اس کے ملک الموت کی طرف دیکھنے کے درمیان ہے۔ گویا ملک الموت کے آنے یا حالت نزع سے پہلے پہلے کبھی ہو۔ اور امام احمد اور ترمذی اور ابن ماجہ نے ایک حدیث نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے جس کے راوی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں [قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ] (جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب في فضل التوبة والاستغفار وما ذكر من رحمة الله لعباده: 3537) یعنی آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک کہ اس پر موت کا غرغرہ نہیں آتا۔''

توبہ اور اس کی قبولیت:

چونکہ پچھلی دونوں آیتوں کے مضمون کا تعلق توبہ سے بھی تھا۔ یعنی حکم تھا کہ جن لوگوں سے زنا کے مبادی کا اظہار ہوا گر وہ توبہ کریں تو پھر ان کو کچھ مت کہو۔ اس لیے اب دو آیات میں توبہ کے مضمون کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔ توبہ کے اصل معنی جیسا کہ دوسری جگہ بیان ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہیں خواہ ایسا رجوع کسی بدی کے ارتکاب کے بعد ہو یا ایک غفلت کی حالت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو۔ یہاں جیسا کہ سیاق چاہتا تھا اس توبہ کا ذکر ہے جو بدی کے ارتکاب کے بعد ہو۔ سو اول تو یہاں یہ فرمایا کہ توبہ یا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جو جہالت سے بدی کرتے ہیں اور پھر فرمایا

يَمُوْتُوْنَ وَ هُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

(لیے) جو کافر ہونے کی حالت میں ہی مرجاتے ہیں یہی ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک دکھ تیار کر رکھا ہے۔ (627)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے لیے جائز نہیں کہ عورتوں

کہ قریب ہی توبہ یا رجوع بھی کر لیتے ہیں۔ جہالت کا لفظ اس لیے اختیار فرمایا کہ انسان جو بدی کرتا ہے وہ جہالت سے کرتا ہے۔ اور توبہ کے یہ معنی ہیں کہ اس جہالت سے نکل جائے اور اس کو سمجھ آجائے کہ یہ اچھا کام نہ تھا جو اس نے کیا۔ جب تک انسان کے قلب پر یہ کیفیت وارد نہ ہو کہ وہ بدی کو بدی سمجھے اور اس سے متنفر ہو، اس وقت تک رجوع بھی نہیں ہوسکتا۔ اور مِنْ قَرِيْبٍ کا لفظ گو موت سے پہلے ہر وقت پر حاوی ہے۔ مگر اس کو اختیار فرما کر توجہ دلائی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اگر اس سے بدی ہو بھی جائے تو فوراً رجوع کرے۔ کیونکہ ایسی حالت میں رجوع کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور بدی کا بیج جو انسان کے دل میں بویا گیا ہے ابھی اس نے جڑ نہیں پکڑی ہوتی۔ لیکن اگر جلدی رجوع نہ کرے اور بدی پر اصرار کرے یعنی بار بار اس کا ارتکاب کرے تو وہی بیج جڑ پکڑ کر مستحکم ہوجاتا ہے اور وہ بدی ایک بدعادت کے طور پر طبیعت میں ایسی جاگزین ہوجاتی ہے کہ پھر انسان کا اس سے رہائی پانا بہت ہی مشکل ہوجاتا ہے۔ گویا جتنی جلدی توبہ کرنے میں کرے گا اتنی ہی جلد توبہ قبول ہوگی۔ اور جتنی دیر ایک بدی سے رجوع کرنے میں لگائے گا اسی قدر دیر توبہ کی قبولیت میں لگے گی۔

627- **عدم قبولیت توبہ:** جس طرح پہلی آیت میں توبہ کی سہل ترین حالت یعنی قبولیت سے قریب ترین حالت کا ذکر کیا ہے اس آیت میں توبہ کے نہ قبول ہونے کی حالت یعنی قبولیت سے بعید ترین حالت کا ذکر کیا ہے اور وہ حالت یہ ہے کہ انسان بدیاں کرتا جائے اور کبھی انجام کو نہ سوچے۔ پھر جب موت کا غرغرہ آلگے اور دیکھ لے کہ اب جواب دہی سامنے ہے تو پھر توبہ کرے، ایسے شخصوں کو مطلقاً توبہ فائدہ نہیں دیتی۔ اس سے بھی سخت تر حالت ان لوگوں کی ہے [يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ] (سنن سعید بن منصور: جلد3، صفحہ 1198) موت بھی ان پر کافر ہونے کی حالت میں آتی ہے۔ یعنی وہ موت کے وقت بھی یا حالت نزع میں بھی نہیں سمجھتے کہ توبہ کرنی چاہیے۔ ان کا کفر سخت ترین ہے۔ حالت نزع کی توبہ کیوں قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ نزع کے وقت بھی انسان ایک گونہ دوسرے عالم میں داخل ہو چکا ہوتا ہے اور وہاں اللہ تعالیٰ نے اصلاح کے لیے اور سامان رکھے ہیں۔ توبہ یا رجوع کا موقعہ اس زندگی کے اندر اندر ہے۔ کیونکہ یہ زندگی ایک خاص رنگ میں اصلاح کے لیے دی گئی ہے اور ان دونوں انتہائی حالتوں کے درمیان یعنی ایک وہ حالت جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا کہ نادانی سے کوئی بدی کی پھر فوراً اس سے رجوع کیا اور ایک یہ حالت جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ نزع کے وقت یا موت کے بعد رجوع چاہیے۔ مختلف حالات کے انسان ہیں جن کی توبہ کی قبولیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس قدر جرأت ارتکاب معاصی پر کرتے ہیں اور کس قدر دیر رجوع میں لگاتے ہیں۔ جتنی جرأت کم اور توبہ جلدی ہے اس کی قبولیت آسان، جتنی جرأت زیادہ اور توبہ دیر سے ہے اسی قدر اس کی قبولیت مشکل ہے۔

تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ

کو زبردستی ورثہ میں لو[628] اور نہ ان کو روک رکھو اس لیے کہ اس کا کچھ حصہ لے لو جو تم نے انہیں دیا ہے سوائے اس کے کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں۔[629] اور ان کے ساتھ پسندیدہ طور سے میل جول رکھو پھر

628- یہاں سے عورتوں کی ان تکالیف کا ذکر شروع ہوتا ہے جو اسلام سے پہلے ان کے لاحق حال تھیں اور سب سے پہلے اس بدرسم کا ذکر کیا ہے جس کی رو سے **عورتیں مال متروکہ کی طرح وراثت کا حصہ قرار پاتی تھیں** گویا اوپر جب اسلام میں عورتوں کے حقوق وراثت کا ذکر کیا اور ان کو مال متروکہ کا حصہ دلایا تو اب جاہلیت کی رسوم کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ عورتوں کا مال متروکہ سے ورثہ پانا تو ایک طرف رہا وہ خود مال متروکہ کا حصہ قرار دی جا کر ورثہ میں لی جاتی تھیں۔ چنانچہ بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:[قَالَ كَانُوا إِذَا مَاتَ الرَّجُلُ كَانَ أَوْلِيَاؤُهُ أَحَقَّ بِامْرَأَتِهِ، إِنْ شَاءَ بَعْضُهُمْ تَزَوَّجَهَا، وَإِنْ شَاءُوا زَوَّجُوهَا، وَإِنْ شَاءُوا لَمْ يُزَوِّجُوهَا، فَهُمْ أَحَقُّ بِهَا مِنْ أَهْلِهَا، فَنَزَلَتْ هَذِهِ الآيَةُ.] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب (لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا): 4579) یعنی اہل جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ جب ایک شخص وفات پا جاتا تو اس کے وارث اس عورت کے بھی حق دار ہوتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا۔ اور اگر وہ چاہتے تو اس کا نکاح کسی سے نہ کرتے۔ پس اس کے اہل کی نسبت وہ اس کے (مال کے) زیادہ حقدار ہوتے۔ یعنی جب وہ مرتی تو اس کے وارث وہ خود ہوتے اور بعض روایتوں میں ہے کہ بجائے خود نکاح کرنے کے جس سے چاہتے اس کا نکاح کر دیتے اور مہر خود لے لیتے۔ اس مضمون کی بہت سی روایات ہیں کسی میں اہل یثرب کا یہ طریق بیان کیا گیا ہے، کسی سے پایا جاتا ہے کہ اہل تہامہ اپنی عورتوں سے بہت بدسلوکی کرتے تھے اور تمام روایات کا اس پر اتفاق ہے کہ میت کے مال کے وارث اس کی بیوی کے بھی وارث ہوتے تھے۔ پس اس رسم بد کی یہاں اصلاح کی ہے۔ زہری سے مروی ہے کہ وہ لوگ عورت کو بلا ضرورت روک رکھتے تھے یعنی حالانکہ اس سے بی بی کا تعلق نہ ہوتا تھا مگر اس غرض سے اسے طلاق نہیں دیتے تھے کہ جب وہ مرے تو اس کے مال کے وارث ہوں۔

629- ﴿بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ فَاحِشَةٍ کے معنی [نمبر: 624] میں بیان ہو چکے ہیں۔ باوجود مُبَيِّنَةٍ کا لفظ ساتھ ہونے کے قتادہ، ضحاک، ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہم سے یہاں معنی نُشُوْزٌ اور سُوْءُ الْخُلُقِ مروی ہیں۔ یعنی خاوند کی نافرمانی یا اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونا اور بدخلقی۔ اور بعض نے زنا بھی معنی کیے ہیں مگر حق یہ ہے کہ لفظ عام ہے اس لیے معنی اس کے وسیع ہیں اور زنا بھی یہاں مفہوم میں شامل ہو سکتا ہے اس کے لیے کوئی مانع نہیں۔

كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔ (630)

طلاق کے وقت عورت سے مال لینا:

یہ دوسری تکلیف ہے جو عورتوں کو پہنچائی جاتی تھی۔ یعنی جب ایک شخص ایک بی بی کو ناپسند کرتا تو بجائے اس کے کہ اسے طلاق دے اسے روک رکھتا اور اس کو تنگی اور تکلیف کی حالت میں رکھتا یہاں تک کہ وہ تنگ ہو کر اس بات کو منظور کرتی کہ اپنے مال میں سے کچھ اسے دے یا جیسا کہ اہل تہامہ کے ذکر میں لکھا ہے طلاق دیتے وقت یہ شرط کر لیتا کہ وہ اسی پہلے خاوند کے منشا کے خلاف شادی نہ کرے گی اور غرض اس کی یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ مال اس پر پہلے خرچ کیا تھا اس کا کچھ حصہ اسے دوسرے خاوند کے نکاح میں دے کر خود وصول کرے۔ (ث) اسلام نے مہر لینے سے روکا ہے سوائے ایک صورت کے ﴿اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ ان سے زنا یا مبادی زنا یا نشوز کا ارتکاب ہو تو ایسی صورت میں چونکہ خلع ہوگا اس لیے یہ اختیار ہوگا کہ کچھ حصہ مہر کا جو دیا گیا تھا واپس لیا جائے۔

630- عَاشِرُوْا۔ اس کا مادہ عَشْرٌ ہے جس کے معنی دس ہیں اور چونکہ دس کو عدد کامل سمجھا گیا ہے اس لیے عَشِيْرَةٌ ایک شخص کے اہل کو کہتے ہیں جن سے وہ کثرت حاصل کرتا ہے۔ گویا وہ اس کے لیے عدد کامل کے طور پر ہوتے ہیں۔ (غ) پھر ایک شخص کے سارے اقارب پر یہ لفظ بولا گیا ہے اور عَاشَرْتُهُ کے معنی ہیں مصاہرت میں مَیں اس کے لیے دس کی مانند ہو گیا۔ (غ) یا عَشَرَةٌ کے معنی چونکہ مخالطت ہیں یعنی میل جول رکھنا۔ اسی سے معاشرہ کے معنی بھی مخالطت ہیں اور عَشِيْرٌ کے معنی قریبی اور صدیق یعنی دوست ہیں اور عورت کا عَشِيْرٌ اس کا خاوند ہے اس لیے کہ وہ مرد اس عورت سے اور عورت اس مرد سے دوست کی طرح میل جول رکھتے ہیں۔

عورتوں سے سلوک:

یہ تیسرا امر ہے جس کی طرف اسلام نے توجہ دلائی ہے۔ پہلے دو احکام میں صرف ایک بدرسم کو دور کیا ہے۔ مگر یہاں اس بدرسم کو کہ عورت کے ساتھ عام طور پر خانہ داری کی زندگی میں انصاف کا برتاؤ نہ ہوتا تھا، اس کی کوئی خاص عزت و منزلت نہ تھی بلکہ صرف خواہشات کو پورا کرنے کا اسے ذریعہ سمجھا گیا تھا دور کرنے کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ عورت و مرد کا کیا تعلق ہے۔ اور ایک ہی لفظ عَاشِرُوْهُنَّ میں مرد و عورت کے سارے تعلقات کو روشن کر دیا ہے۔ میاں بی بی کا تعلق ایک دوسرے سے صدیق یا سچے دوست کا تعلق ہے جو ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اور صرف لفظ معاشرت پر ہی انحصار نہیں رکھا جو بجائے خود صادقانہ تعلقات کا مقتضی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ تاکید کے طور پر لفظ بِالْمَعْرُوْفِ بھی بڑھا دیا ہے یعنی ایسی معاشرت جو پہچانی گئی یا پسند کی گئی ہے اور ساتھ یہ بھی بڑھا دیا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ وہ تمہیں ناپسند ہوں مگر ناپسندیدگی کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہیے کہ ان سے اچھا میل جول نہ رکھا جائے بلکہ ایسی صورت میں اپنی طبیعت پر جبر کر کے بھی ان سے حسن اخلاق سے پیش آنا

وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۲۰

اور اگر تم ایک بی بی کی جگہ دوسری بی بی (سے نکاح) کرنا چاہو اور تم اسے سونے کا ڈھیر دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔ کیا تم اسے بہتان سے اور کھلے گناہ کے ساتھ لو گے؟(631)

چاہیے۔ کیونکہ جس طرح انسان کا یہ دن رات کا تجربہ ہے کہ ایک چیز کو وہ پہلے پسند نہیں کرتا مگر آخر کار اس سے بہت سے فوائد حاصل کرتا ہے۔ ایسا ہی عورتوں کے معاملہ میں بھی سمجھایا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ تم بی بی کو ناپسند کرو لیکن اگر طبیعت پر جبر کر کے اس سے حسن سلوک کرو گے تو اللہ تعالیٰ ناپسندیدگی کو بھی دور کر دے گا اور اس تعلق کو بہت سی بھلائی کا موجب کر دے گا۔

عورتوں سے **حسن معاشرت کا حکم** اسلام کی خصوصیات میں سے ہے اور اس کی نہایت عمدہ تفسیر حدیث و تعامل نبی کریم ﷺ میں ملتی ہے۔ آپ نے فرمایا [خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ] (جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب فضل أزواج النبي ﷺ: 4269) ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل سے سب سے اچھا سلوک کرتا ہے۔'' اور حجۃ الوداع میں آپ کی آخری نصیحت تھی [وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا] (صحيح البخاری، کتاب النکاح، باب الْوَصَاةِ بِالنِّسَاءِ: 5186) ''عورتوں سے اچھا سلوک کرنا۔'' اور یہ بھی فرمایا کہ یہ نری میری تعلیم ہی نہیں بلکہ میرا عمل بھی ہے [وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيْ] (جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب فضل أزواج النبي ﷺ: 4269) اور تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے اخلاق اپنے اہل سے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے۔ آپ ان سے ہنستے کھیلتے بھی تھے اور ہمیشہ کشادہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ ان کو ہنساتے بھی تھے ان کے کاموں میں ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ بعض دفعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ دوڑے بھی ہیں۔

631- **طلاق کب دینی جائز ہے:** پچھلی آیت کے آخر پر فرمایا تھا کہ بی بی سے اچھا میل جول رکھو یہاں تک کہ ناپسند بھی ہو تو طبیعت پر جبر کر کے اس سے حسن سلوک کرو۔ لیکن بعض وقت ناپسندیدگی ناقابل علاج ہوتی ہے اور طبائع میں قطعاً میل جول نہیں ہو سکتا تو ایسی صورت میں ایک کو دوسرے کے ساتھ بندھے رکھنا ان کے اخلاق کو بھی تباہ کرنا ہے اور ان کی اولاد کو بھی۔ اس لیے اس آیت میں اس صورت کا ذکر کیا ہے۔ جب ناپسندیدگی قابل علاج نہ ہو۔ یوں یہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ طلاق اسی صورت میں دینی جائز ہے جب ناپسندیدگی یا ناموافقت طبع اس حد کو پہنچ جائے۔ یہاں یہ کیوں نہ کہا کہ تم اسے طلاق دینا چاہو اور یہ کہا کہ اس کی بجائے دوسری بی بی کرنا چاہو؟ اس لیے کہ اسلام انسان کی معمولی حالت اسی کو قرار دیتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہو۔ پس جب ایک بی بی کو طلاق دے گا تو لازماً دوسری سے نکاح کرے گا۔ اس آیت سے جو ایک نہایت ضروری حکم پر مشتمل ہے یعنی جب مرد کو عورت ناپسند ہو اور وہ اس سے حسن معاشرت نہ رکھ سکتا ہو تو اس بی بی کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کر لے۔ عورتوں کے ادل بدل کرتے رہنے کا نتیجہ نکالنا بگڑے ہوئے دماغ کا کام ہو سکتا ہے۔ یہاں تو صرف یہ حکم ہے کہ ایسی صورت میں بے شک ایک بی بی کو طلاق دینا جائز ہے اور اس طلاق شدہ کی جگہ دوسری بی بی سے نکاح کرنا بھی جائز ہے۔ عیسائیت کے قانون کی طرح

وَ كَيۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَ قَدۡ اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اور تم اسے کس طرح لے سکتے ہو حالانکہ تم میں سے ایک

نہیں کہ اگر ایک سے ان بن ہوئی یہاں تک کہ میاں بی بی قانوناً الگ الگ بھی کیے جائیں۔ کیونکہ اکٹھے وہ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ تو اب نہ بی بی کو اجازت ہے کہ دوسرا نکاح کرے نہ خاوند کو اختیار ہے کہ دوسری بی بی سے نکاح کرے۔ بلکہ اس لفظ اسۡتِبۡدَالَ میں عیسائیت کے اس بیہودہ قانون کی طرف ہی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ایک نکاح ناکامیاب ثابت ہوا ہے اور کسی طرح پر وہ مودت والفت پیدا نہیں ہوسکتی جو نکاح کا اصل منشا ہے تو پھر ایسا تعلق قطع ہو کر دوسرا تعلق کیوں قائم نہ ہو۔ طلاق دی ہوئی عورت کو بھی دوسرا خاوند کرنے کا اختیار ہے جیسا دوسری جگہ بالصراحت آچکا ہے اور طلاق دینے والے خاوند کو دوسری بی بی سے نکاح کرنے کا اختیار اس لفظ اسۡتِبۡدَالَ میں دیا ہے اور ایسی صورت میں جب نشوز یا فساد باہمی میں خاوند پر الزام ہو وہ عورت سے ایک حبّہ اس مال کا واپس نہیں لے سکتا جو بطور تحفہ یا مہر اس نے دیا یا دینا کیا ہو۔ گو وہ مال ایک قنطار یعنی سونے کے ڈھیر کے برابر بھی ہو۔ آیت کے آخری الفاظ میں فرمایا کہ کیا تم مال لینے کی خاطر عورت پر کوئی بہتان لگاؤ گے یعنی ﴿ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ کا الزام۔ یا کسی گناہ کا ارتکاب کرو گے یعنی جاہلیت کی طرح عورت کو دکھ دینا شروع کرو گے تاکہ وہ مال کا کچھ حصہ واپس کر کے خلع کرالے۔ پس اسلام دیئے ہوئے مال کے (یا جو معاہدہ کے نیچے دینا ہو اس کے) واپس لینے کی اس صورت میں اجازت نہیں دیتا۔

مہر کی مقدار:

یہ آیت اس پر بھی صریح دلیل ہے کہ عورتوں کے مہر پر کوئی حد بندی نہیں یعنی جتنا مہر کوئی شخص چاہے دے سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بڑے بڑے فرضی مہر باندھے جائیں۔ بلکہ مہر وہی ہے جو ادا کر دیا جائے۔ ایسے مہر باندھنا جو ایک انسان ادا ہی نہیں کر سکتا' صریحاً خلاف قرآن کریم ہے۔ یہاں بے شک قنطار کا دینا بھی جائز رکھا ہے جو ایک غیر محدود مقدار ہے مگر اٰتَيۡتُمۡ کا لفظ بڑھا کر اور دوسری جگہ ﴿ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ﴾ کا حکم دے کر یہ صاف بتا دیا کہ مہر دینے کی چیز ہے ایسا مہر باندھنا جو دے نہیں سکتا یا جو دینے کا ارادہ نہیں، خلاف قرآن شریف ہے اور احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا [مِنْ خَيْرِ النِّسَآءِ أَيْسَرُهُنَّ صِدَاقًا] (روح المعانی: جلد4، صفحہ 245) بہترین عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو اور ایک حدیث میں ہے [أَعْظَمَ النِّسَاءِ بَرَكَةً أَيْسَرَهُنَّ صَدَاقًا] (السنن الکبری للبیهقي: جلد7، صفحہ 235، 14745) سب سے بڑھ کر برکت والی عورت وہ ہے جس کے مہر میں سہولت ہو۔ ہاں اگر ایک امیر آدمی اپنی عورت کا مہر لاکھوں روپے بھی باندھتا ہے تو اسے روکنا بھی درست نہیں۔

حضرت عمرؓ کا خطبہ تعیین مہر پر:

روایت ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب رسول اللہ ﷺ کے منبر پر چڑھے اور فرمایا: اے لوگو! تم کتنا اپنی عورتوں کے مہر کو بڑھاتے ہو اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے درمیان مہر چار سو درہم یا اس سے کم ہی ہوتے تھے اور اگر مہر میں زیادتی اللہ کے نزدیک تقویٰ اور عزت کا موجب ہوتی تو تم ان سے اس بارہ میں سبقت نہ لے جاتے۔ اس لیے میں چار سو

اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

دوسرے تک پہنچ چکا ہے اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکی ہیں۔ (632)

درہم سے زیادہ مہر کو تسلیم نہیں کروں گا۔ (اور ایک روایت میں ہے جس قدر چار سو درہم سے زیادہ ہوگا اسے بیت المال میں داخل کروں گا۔) پھر آپ منبر سے اترے تو ایک عورت قریش میں سے سامنے آئی اور کہا: اے امیر المومنین! آپ نے لوگوں کو چار سو درہم سے زیادہ مہر دینے سے روکا ہے۔ آپ نے کہا ہاں۔ اس نے کہا کیا آپ نے نہیں سنا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے ﴿وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا [اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ، كُلُّ النَّاسِ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ] (کنز العمال: جلد16، صفحہ538، حدیث:45798) ''اے اللہ! معاف فرمائیو سب لوگ عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں۔'' (اور ایک روایت میں ہے کہ اس عورت نے کہا: اے خطاب کے بیٹے! تو ہم کو روکتا ہے اور اللہ ہم کو دیتا ہے اور یہ آیت پڑھی تو آپ نے فرمایا: [نِسَآءُ الْمَدِيْنَةِ أَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ] مدینہ کی عورتیں عمر سے زیادہ سمجھدار ہیں۔) تب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پھر منبر پر چڑھے اور فرمایا اے لوگو! میں تم کو اس بات سے روکتا تھا کہ چار سو درھم سے زیادہ مہر دو۔ لیکن جو کوئی تم میں سے اپنے مال سے جس قدر چاہے دے سکتا ہے۔ (ث)

یہ روایت بتاتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کس طرح قرآن کریم کے سامنے گردنیں جھکاتے تھے۔ الفاظ کی صراحت کے بالمقابل آپ نے تاویل سے کام نہیں لیا۔ یہ نہیں کہا کہ یہ بطور فرض ہے جس طرح بعض مفسرین نے یہ تاویل کر لی ہے۔ بلکہ بھرے مجمع میں اپنی بات سے رجوع کیا۔ یہی سب سے بڑی ضرورت اسلام کو آج ہے کہ اس کے پیرو اور اس کے علماء اور اس کے مشائخ احکام قرآنی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ عام لوگوں کے اندر یہ جرأت پیدا ہو کہ وہ اپنے پیروں اور علماء کو جب وہ خلاف قرآن و حدیث کہیں، روک سکیں۔ اور ان پیروں اور علماء میں یہ تقویٰ ہو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم سن کر اپنی بات سے رجوع کریں۔

632- اَفْضٰى۔ فَضَا فراخ مکان کو کہتے ہیں اور اسی سے [أَفْضٰى فُلَانٌ اِلٰى فُلَانٍ] کے معنی ہیں اس کی طرف پہنچ گیا۔ گویا اس دوسرے شخص کو فضا یا مکان قرار دیا گیا اور مفردات میں ہے کہ عورت کی طرف اِفْضَاءٌ کنایہ میں زیادہ بلیغ اور تصریح میں زیادہ قریب ہے خَلَا بِهَا سے یعنی اس سے خلوت کی۔ گویا مراد اس سے عورت سے خلوت کرنا ہے یہی معنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے لیے ہیں۔

﴿مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾ غِلْظَةٌ۔ رِقَّةٌ کی ضد ہے۔ گویا غلیظ کے معنی موٹا ہیں اور اس کا اصل استعمال اجسام میں ہے لیکن بطور استعارہ۔۔۔۔ معانی میں مثل کبیر اور کثیر کے استعمال ہوتا ہے اور میثاق کے ساتھ لانے سے اس کے معنی عہد مؤکد یا مضبوط عہد کے ہوں گے۔ قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میثاق غلیظ سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے بارہ میں مردوں سے لیا ہے۔ جیسے ﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ [البقرة: 229:2] ''پھر پسندیدہ طور سے رکھنا یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کرنا ہے۔'' میں مگر صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ مروی ہیں: [وَاسْتَوْصُوا

وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ ع 3 8 14

اوران عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہیں مگر جو گزر چکا۔ یہ بے حیائی اور سخت بیزاری (کی بات) ہے اور بری راہ ہے۔ (633)

بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانَةِ اللهِ] (صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب الْوَصَاةِ بِالنِّسَاءِ: 5186) یعنی ''عورتوں کے ساتھ نیک معاملہ کرو۔ کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت سے لیا ہے۔'' گویا نکاح کو ہی امانت یا عہد قرار دیا ہے۔ پس میثاق غلیظ سے مراد نکاح ہی ہے۔

عورت سے مہر کس صورت میں لیا جا سکتا ہے؟

اس آیت میں وجہ دی ہے کہ کیوں عورتوں سے مہر کا واپس لینا درست نہیں۔ اس لیے کہ تم ان سے خلوت کر چکے ہو اور معاہدہ کر چکے ہو۔ اب جب تک ان سے کوئی امر خلاف معاہدہ سرزد نہ ہو۔ ان کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ بعض لوگوں نے اس آیت کو سورۃ البقرہ کی اس آیت کا جس میں بروئے خلع عورت سے مہر کا کچھ حصہ لے لینا جائز ہے ناسخ قرار دیا ہے اور بعض نے اس آیت سے اسے منسوخ قرار دیا ہے۔ حالانکہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ سورۃ بقرہ کی آیت خلع کا تو یہ منشا ہے کہ اگر عورت بوجہ ناموافقت طبیعت یا کسی اور وجہ سے طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے اور خاوند کا کوئی قصور نہیں تو اس صورت میں مہر کا کچھ حصہ لے لینا جائز ہے۔ اور یہاں یہ فرمایا کہ اس صورت میں کچھ لے لینا جائز ہے جب مرد عورت کو بوجہ فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ طلاق دیتا ہے۔ لیکن اَور کسی وجہ پر طلاق دینا چاہے تو مہر کا لینا جائز نہیں۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تناقص نہیں۔ عورت طلاق لینا چاہتی ہے تو مہر کا حصہ دے، مرد طلاق دینا چاہتا ہے تو کچھ مہر سے نہیں لے سکتا۔ سوائے اس صورت کے کہ عورت سے ﴿بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ کا ارتکاب ہو۔ پہلی حالت کا بیان سورۃ بقرہ میں ہے۔ اس دوسری حالت کا یہاں ذکر کیا ہے۔ کس قدر تعجب ہے کہ غور و خوض سے کام نہ لینے سے جھٹ ایک آیت کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے حالانکہ دونوں حکم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں بلکہ اس سے نظم قرآنی کا کمال معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح حصے حصے کر کے مضامین کو مکمل کر دیا ہے۔

633- مَقْتًا۔ مَقْتٌ۔ سخت بغض ہے اس شخص کے لیے جس کو تم فعل قبیح کرتا دیکھو۔ (غ)

یہ پانچویں اصلاح ہے جو مرد و عورت کے تعلقات میں اسلام نے کی۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اپنے باپوں کی بیبیوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ گو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم اچھی نہ سمجھی جاتی تھی اور اسی لیے وہ لوگ اسے نکاح مقت کہتے تھے تاہم اس رسم پر عمل ہوتا تھا۔ اسلام نے اس کو جڑ سے کاٹ دیا۔

﴿اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ کے لفظی معنی تو صرف اسی قدر ہیں کہ جو پہلے گزر چکا۔ حرمت سود کے معاملہ میں بھی یہی لفظ آتے ہیں۔ ﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ [البقرة: 275:2] ''سو جس کے پاس اپنے رب سے نصیحت آ گئی پھر

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَ بَنٰتُكُمۡ وَ اَخَوٰتُكُمۡ وَ عَمّٰتُكُمۡ وَ خٰلٰتُكُمۡ وَ بَنٰتُ الۡاَخِ وَ بَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَ اَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمۡ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىۡ فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ ۫ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ ۫ وَ حَلَآئِلُ اَبۡنَآئِكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ ۙ وَ اَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ

تم پر (یہ عورتیں) حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمہاری حفاظت میں ہوں ان عورتوں (کے بطن) سے جن پر تم داخل ہو چکے ہو اور اگر تم ان پر داخل نہ ہوئے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری پیٹھوں سے ہوں[634] اور یہ کہ تم دو بہنوں کو اکٹھا کرو مگر جو گزر چکا۔

وہ رک گیا تو اس کے لیے ہے جو گزر چکا۔'' جہاں ﴿فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ کے معنی بتائے گئے ہیں کہ جو گناہ اس سے ہو چکا اس سے درگزر کی جائے گی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نے سودی معاملہ کیا ہوا ہے وہ سود لیتا رہے۔ بلکہ صاف الفاظ میں وہاں یہ ہدایت موجود ہے ﴿وَ ذَرُوۡا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰۤوا﴾ [البقرة: 278:2] جو سود اس وقت لینا باقی ہے وہ بھی ترک کرنا پڑے گا۔ اسی طرح یہاں بھی ﴿اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ﴾ کے معنی ہیں جو تمہارا فعل ہو چکا اس کی وجہ سے تم پر کوئی گرفت نہیں۔ (غ) یہ مطلب نہیں کہ جو نکاح پہلے ہو چکا وہ اب باقی رہ سکتا ہے۔ چونکہ اس آیت کے نزول کے بعد ایسا نکاح ناجائز ہو گیا اس لیے وہ تو فوراً منسوخ ہو جائے گا۔ البتہ اس کے کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں۔ پس ﴿اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ﴾ میں استثنا گناہ سے ہے جواز فعل سے نہیں۔

634- اُمَّهٰتُ۔ اُمٌّ کی جمع ہے اور اس میں قریب کی والدہ جس نے اسے جنا ہے اور بعید کی والدہ جس نے اس کے جننے والوں کو جنا ہے جیسے دادی، نانی شامل ہیں۔ (غ)

بَنٰتُ۔ بِنۡتٌ کی جمع ہے اور اس میں اولاد کی بیٹی یا اولاد کی اولاد کی بیٹی بھی شامل ہے۔

اَخَوٰتُ۔ اُخۡتٌ کی جمع ہے یعنی بہن خواہ حقیقی بہن ہو یا صرف باپ کی طرف سے یا صرف ماں کی طرف سے۔

عَمّٰتُ۔ عَمَّةٌ کی جمع ہے اور عَمٌّ باپ کا بھائی ہے اور عَمَّةٌ اصل میں باپ کی بہن یا پھوپھی ہے ایسا ہی دادا کی بہن اور ماں کے

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۲۳﴾ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

باپ کی یا نانا کی بہن بھی عَمَّةٌ کہلائے گی۔

خٰلٰتُ۔ خَالَةٌ کی جمع ہے اور وہ ماں کی بہن یا ماسی ہے ایسا ہی نانی کی بہن اور باپ کی طرف سے بھی خالہ ہوسکتی ہے۔یعنی باپ کی ماں یا دادی کی بہن۔

رَبَآئِبُكُمُ۔ رَبَائِبُ۔ رَبِيۡبَةٌ کی جمع ہے جو فعیل بمعنی مفعول ہے یعنی مَرْبُوْبَةٌ یا وہ لڑکی جس کو تم نے پالا ہے اور لفظ رَبِيۡبٌ یا رَبِيۡبَةٌ اس اولاد سے مخصوص ہے جو پہلے خاوند سے ہو اور دوسرا خاوند اس کی پرورش کرنے والا ہو۔ یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی اس کی پرورش کرنے والی ہو۔(غ)

حُجُوۡرٌ حَجْرٌ کی جمع ہے اور مراد اس سے حفاظت میں آنا ہے کیونکہ حجر کے اصل معنی منع ہیں یعنی روکنا۔ جو پتھر کی سختی سے لیے گئے ہیں اور حجر حفاظت یا تربیت کو اس لیے کہتے ہیں کہ جو شخص بچے کو اپنی حفاظت میں لیتا ہے وہ اس کے اموال اور دیگر حالات میں تصرف سے اوروں کو روکتا ہے۔

حَلَآئِلُ۔ حَلِيۡلَةٌ کی جمع ہے (جو حل سے ہے جس کے معنی کھولنا ہیں) اور حَلِيۡلٌ خاوند کو اور حَلِيۡلَةٌ بی بی کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں۔

چودہ وجوہ حرمت نکاح:

اس آیت میں تیرہ قسم کی حرمت نکاح میں بیان کی ہے اور اس سے پہلی آیت کو ساتھ شامل کر کے کل چودہ وجہ سے حرمت ہے اور اس سے بعد کی آیت میں ایک عام حکم حرمت کا اور ہے۔مگر اصل وجوہ حرمت نکاح چودہ ہی ہیں۔ان میں سے سات بلحاظ نسب ہیں اور سات دیگر وجوہ سے۔ جو سات وجوہ حرمت بلحاظ نسب ہیں وہ بھی دو قسم ہیں یعنی اول بلحاظ ولادت ہے اور اس میں دو ہی قسم آتی ہیں یعنی مائیں اور فرع یعنی بیٹیاں اور قسم دوم بلحاظ اخوت سے جو پانچ ہیں۔اپنی بہن' باپ کی بہن' ماں کی بہن' بھائی کی بیٹی' بہن کی بیٹی اور دیگر وجوہ میں سات وجہ حرمت ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

دودھ مائیں' دودھ بہنیں' بیبیوں کی مائیں' بیبیوں کی پہلی بیٹیاں بشرطیکہ ان بیبیوں سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو اور بشرطیکہ وہ بیٹیاں بطور ربیبہ ہوں (بعض کے نزدیک یہ دوسری شرط نہیں بلکہ محض عام صورت حال کا بیان ہے) بیٹوں کی بیبیاں' باپوں کی بیبیاں (جس کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے) اور دو بہنوں کا ایک وقت نکاح میں رکھنا۔قرآن کا دعویٰ کامل شریعت ہونے کا کیسا صحیح ہے کہ ہر مسئلہ میں اصول خود قائم کر دیئے ہیں۔دوسری قومیں بھی کچھ نہ کچھ محرمات ضروری قرار دیتی ہیں۔مثلاً ماں یا بیٹی یا بہن سے نکاح کرنے کا رواج کسی قوم میں نہیں۔مگر ان کی کتب مقدسہ اس بارہ میں خاموش ہیں۔صرف توریت میں کچھ ذکر ہے۔ جس کے لیے دیکھو[احبار، باب: 18:6-18]

رضاعت کے رشتے:

جو وجوہات حرمت اوپر بیان ہوئی ہیں ان میں صرف دودھ ماؤں اور دودھ بہنوں کا ذکر بالتصریح آیا ہے اور رضاعت کے باقی رشتوں کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن متفق علیہ حدیث میں [يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ] (صحيح البخاری، كتاب النكاح، باب مَا يَحِلُّ مِنَ الدُّخُولِ وَالنَّظَرِ إِلَى النِّسَاءِ فِي الرَّضَاعِ: 5239) یعنی ''جن جن رشتوں کی بوجہ نسب ممانعت ہے انہی رشتوں کی بوجہ دودھ پلانے کے حرمت ہے۔'' قرآن کریم ایک جامع کلام ہے۔ اس لیے حرمت بوجہ نسب کو دو اقسام پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حرمت بوجہ ولادت اور ایک حرمت بوجہ اخوت۔ اس لیے جب دودھ کے رشتوں کی حرمت کا ذکر آیا تو کمال بلاغت سے حرمت بوجہ ولادت کا اصل موجب یعنی ماں ہونا (جس میں بیٹی ہونا بھی شامل ہے) بیان کر دیا ہے اور حرمت بوجہ اخوت کا اصل موجب یعنی بہن ہونا (جس میں باپ کی بہن، ماں کی بہن، بھائی کی بیٹی، بہن کی بیٹی شامل ہیں) ذکر کر دیا اور تفصیل کو چھوڑ دیا۔ کیسا پر حکمت کلام ہے کہ ضرورت سے زائد ایک لفظ بیان نہیں کیا۔ ہاں اسی سے یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا فہم بھی کیسا الٰہی روشنی سے منور ہے کہ اصل حقیقت تک فوراً پہنچ کر [يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ] کا حکم دے دیا اسی طرح دو بہنوں کو ایک وقت میں نکاح میں رکھنے کی جو حرمت ہے، حدیث نے اسی حکم میں پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو اور خالہ اور بھانجی کے جمع کرنے کو بھی شامل کیا ہے اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ اصل تعلق وہاں بھی اخوت کا ہے۔ گویا ایک عورت کے ساتھ اس کی بہن اس کے باپ کی بہن، اس کی ماں کی بہن کو جمع کرنے کا حکم یکساں ہے۔ رضاعت کے متعلق یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس میں دو سال کی عمر کے اندر اندر کے بچہ کو دودھ پلانا شرط ہے جیسا کہ ﴿يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ [البقرة: 233:2] ''اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔'' سے ظاہر ہے اور دوسری حدیث میں ہے [الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ] (صحيح البخاری، كتاب الشهاده، باب 7: 2647) یعنی وہ دودھ پلانا حرمت کے حکم میں لاتا ہے جو بھوک کے وقت بچہ کو دودھ پلایا ہو۔ یوں ہی بچہ کا ایک دو دفعہ منہ مار لینا کافی نہیں۔